جنوری ۱۹۹۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

ضیاء الدین اصلاحی

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۴۹ ماہ رجب المرجب ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۲ء عدد ۱

مضامین

مقالات

وفیات

ضروری اعلان

ہر قسم کا چیک اور ڈرافٹ صرف دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کے نام سے آنا چاہیے۔ ایڈیٹر یا اور کسی کے نام سے ہرگز نہ بھیجا جائے۔

— منیجر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ہندوستان میں اسلام کو زندہ اور سربلند رکھنے اور مسلمانوں کی شناخت اور تشخص کو باقی اور قائم رکھنے میں دینی درسگاہوں کا خاص حصہ رہا ہے۔ اس لحاظ سے وہ اسلام کے مضبوط و مستحکم قلعے تھیں جن سے حق بین و حق آگاہ افراد پیدا ہوئے اور ان کی آغوشِ تربیت میں ان مردانِ کار کی نشو و نما ہوئی جنھوں نے وقت کے رخ کو موڑ کر اس ملک کی تاریخ و تقدیر بدل دی۔ آزمائشوں میں گھر کر بھی وہ کسی لالچ اور دباؤ میں نہ آئے۔ فقر و احتیاج کے باوجود نہ ان سے صبر و قناعت اور استغنا و بے نیازی کی خو چھوٹی اور نہ ان کے ایمان اور ضمیر پر کوئی آنچ آئی۔ آندھیوں اور طوفانوں کی زد میں بھی ان اصحابِ تسلیم و رضا کے قدموں میں تزلزل نہ آیا۔ اور وہ تختۂ دار پر چڑھ کر بھی صدائے حق بلند کرتے اور اس طرح مرجانے کو حیاتِ جاوداں سمجھتے رہے۔

آج اس ملک میں دین غریب الغربا رہے۔ اور امت پر عجیب وقت پڑا ہے۔ اس نازک صورتِ حال میں بھی انھی دینی درسگاہوں کے خاکستر میں حق و صداقت کی چنگاریاں باقی رہ گئی ہیں۔ ان میں آئے دن بات بات پر وہ ہنگامہ اور طوفان بدتمیزی نہیں برپا ہوتا جو ہماری درسگاہوں کا وتیرہ ہو گیا ہے۔ جن کے طلبہ نے شرافت، اخلاق اور تہذیب و شائستگی سے ہاتھ دھو کر اپنے اساتذہ اور ملک کے عام شہریوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور سرکاری املاک اور ملک کے قیمتی اثاثوں کو برباد کرنا ان کا معمول ہو گیا ہے۔ اردو اس ملک کی بیش قیمت متاع اور اس کے فخر و عظمت کی شاندار نشانی ہے جس کو مدت سے دورِ زماں میٹ رہا ہے اور ۱۹۴۷ء کے بعد ہی سے اربابِ سیاست کی نظریں اس کی طرف سے پھر گئی ہیں۔ اگر تلخ نوائی کو معاف کیا جائے کہ اردو کے خونِ ناحق کی چھینٹوں سے اس کی روٹی کھانے والوں

دامن بھی رنگین ہیں. اس کی بقاء و تحفظ کا سہرا اسلامی مکاتب و مدارس کے زندانِ قدح خوار ہی کے سر ہے۔

لیکن خداوندانِ کتب سے بھی شکایت ہے کہ اب وہ شاہین بچوں کو خاک بازی کا سبق دے رہے ہیں. علم و فن کی وسعت اور مسلمانوں کی ذہنی و دماغی ترقی کے لیے نظر و اجتہاد بنیادی اور اہم چیز ہے جو مفقود ہے. اس لیے علم و فن کے سرسبز و شاداب درخت میں پت جھڑ شروع ہوگئی ہے۔ اور اس نے پھولنا پھلنا چھوڑ دیا ہے. مسلمانوں کے دل و دماغ پر جمود و تقلید اس طرح مستولی ہوگئی ہے کہ ان سے کسی ایجاد و اختراع کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ پہلے نہ مدارس کی کثرت تھی، نہ ان کی پر شکوہ اور عالی شان عمارتیں تھیں اور نہ ہی آج کل کی طرح مدارس کے پاس بکثرت وسائل و ذرائع تھے، درختوں کے سائے اور چھپروں کے نیچے تعلیم ہوتی تھی. لیکن ان ہی بوریا نشینوں نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن سے آج بھی مسلمانوں کا سر فخر سے اونچا ہے۔

گجرات اور جنوب مغرب کے ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر بد قسمتی سے ہندوستان میں اسلام اہل عجم کے ذریعہ آیا. یہاں ترکوں اور افغانوں کی حکمرانی رہی۔ دینی مدارس اور ان کے نصاب تعلیم پر فضلائے عجم اور دانشمندانِ ایران کی گہری چھاپ پڑ گئی. انھوں نے فقہ حنفی کے علاوہ کسی اور مذہب فقہ کا چراغ جلنے نہیں دیا. لوگ منطق و فلسفہ یونان کی بھول بھلیوں میں پڑ کر قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے دور ہوتے گئے۔ تاہم مولانا شبلیؒ کے بقول " قدرت کو اپنی نیرنگیوں کا تماشا دکھلانا تھا کہ اخیر زمانہ میں جبکہ اسلام کا نفسِ واپسیں تھا، شاہ ولی اللہؒ جیسا شخص پیدا ہوا جس کی نکتہ سنجیوں کے آگے غزالی، رازی، ابن رشد کے کارنامے ماند پڑ گئے " شاہ صاحب نے قرآن

حدیث کی عام اشاعت کرنی اور تفقہ و اجتہاد کی روح پھونکنی چاہی. وہ اب بھی مسلمانوں کے مختلف الخیال طبقوں میں مقبول ضرور ہیں لیکن کوئی ان کی اصلاحِ تعلیم و اجتہاد کی دعوت پر لبیک کہنے کو تیار نہیں ہے.

ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اب مدارس سے بلند پایہ اور کامل الفن اصحاب نہیں پیدا ہوتے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ مدارس جن عناصر کا مجموعہ ہیں، اِلّا ماشاء اللہ سب کا مطمحِ نظر تبدیل ہو گیا ہے اور ان کے مقاصد بھی کم و بیش وہی ہو گئے ہیں جو جدید تعلیم گاہوں کے ہیں۔ اسکی وجہ سے بتدریج دونوں کا ماحول اور مزاج بھی تقریباً یکساں ہوتا جا رہا ہے۔ بعض جماعتیں طلبہ کے خام اور ناپختہ ذہنوں کو اپنے مخصوص رنگ میں رنگنا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے دینی مدارس کے اندر اور باہر بھی ان کے متعدد پروگرام ہوتے ہیں جن کو فروغ دینے کے لیے خالص سیاسی جماعتوں کی طرح ان کے زیر اثر مدارس میں بھی طلبہ کی یونین اور مختلف تنظیمیں قائم ہو گئی ہیں۔ اس رجحان نے طلبہ کی نگاہ میں مجامع کے مقابلہ میں مدارس کی اہمیت کم کر دی ہے اور مطالعہ و کتب بینی کے بجائے ان کی دلچسپیاں ان مشاغل سے بڑھ گئی ہیں جن میں تعلیمی مراحل ختم کرنے کے بعد ہی ان کو مشغول ہونا چاہیے۔ پڑھنے لکھنے کے علاوہ طالب علموں کی دوسری سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی سے ممکن ہے ان میں کچھ بولنے اور اچھل کود کی عادت پیدا ہو جائے مگر اس سے ان کی استعداد اور تعلیم میں جو کمی اور عدمِ پختگی پیدا ہوگی اس کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔

مقالات

رمز الریاحین

از ڈاکٹر نور السعید اختر

سنہ ۱۰۵۲ھ مطابق سنہ ۱۶۴۲ء میں خاندان صفویہ کے شقی القلب بادشاہ، شاہ صفی نے انتقال کیا۔ اس بادشاہ کے جور و ستم سے ایرانی رعایا جان بلب تھی۔ شاہ صفی کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا اور شاہ عباس کبیر کا پوتا، شاہ عباس ثانی کے لقب سے ایران کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ تخت نشینی[1] کے وقت اس کی عمر دس سال تھی۔ اپنی عمر کے سولھویں سال میں شاہ عباس ثانی نے شجاعت اور جوانمردی کے جوہر دکھانے شروع کر دیے۔ مغلوں سے قندھار کا قلعہ سنہ ۱۰۵۹ھ/۱۶۴۹ء میں دوبارہ چھین لیا۔ شاہ جہاں اپنی پے در پے کوششوں کے باوجود قندھار کو دوبارہ حاصل کرنے میں ناکامیاب رہا۔ شاہ[2] عباس ثانی نے کل ۲۴، چوبیس سال یعنی سنہ ۱۰۵۲ھ سنہ ۱۶۴۲ء

---

[1] جد و پدر تیرا است سال تاریخ ظل اللہ و ظل حق و ظل معبود (۹۹۴ھ/۱۰۳۸ھ) (۱۰۵۲ھ)

[2] از آثار عالیشان عمارات و باغات بہشت آیات بسیار است، خصوصاً سعادت آباد کہ دار السلطنۃ اصفہان بنا فرمودہ و سدی و پلی بر رودخانہ بستہ کہ از سد سکندری کمی ندارد و در صفت عمارات و باغ و دریاچہ کہ در برابر عمارات باغ سعادت آباد تصرف فرمودہ اند..... این بیت تاریخ است۔ دارای جہان پناہ عباس ز دریا چہ و سد و پل بنا کرد

تذکرۂ طاہر نصرآبادی، ص۱۔

تا ۵ ربیع الاول ۱۱۶۰ھ / ۲۰ اگست ۱۷۴۶ء تک ایرانی حکومت کی عنان سنبھالی۔
اس زمانے میں آسودگی، فارغ البالی اور بے فکری کا دور دورہ رہا اور بقول ای۔جی۔براؤن:

"The more he was beloved by his subjects
and the more feared by his neighbours."[1]

لہذا ادیبوں اور شاعروں نے شعر و ادب کی طرف توجہ مبذول کی۔ جس کے نتیجہ
میں صفوی عہد کی کتابیں زندہ جاوید بن گئیں جن میں ،

(۱) تذکرہ تحفۂ سامی ، (۲) تذکرۂ ہفت اقلیم از رازی ، (۳) تذکرۂ خلاصۃ الاشعار
از تقی الدین کاشانی ، (۴) فرہنگ رشیدی از عبدالرشید حسینی ، (۵) برہان قاطع از محمد
حسین برہان ، بہار عجم ، چراغ ہدایت ، تذکرۂ طاہر نصر آبادی ، مویدالفضلا ، زنوازی
کی تفسیر ، فقہی کتابوں میں جامع عباسی ، محمد باقر مجلسی کی دینی و مذہبی کتابوں کے علاوہ
ملا محسن فیض کاشانی کی شعری کاوش بھی قابل قدر ہے۔

البتہ سیاسی و معاشی اعتبار سے ایران پر بد نظمی اور بحران کے بادل چھانے لگے تھے
اسی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر نادر شاہ افشار نے صفوی خاندان کی آخری شمع کو ایک ہی
یلغار میں بجھا دیا۔

اس سے قطع نظر صفوی عہد کے پچھتر سالہ دور میں فارسی شعر و ادب کی ترویج و تشویق
ہوئی اور بیش بہا ادبی کارناموں کا اضافہ ہوا۔ شاعری کے میدان میں صائب تبریزی ملک الشعراء
شاہ عباس ثانی کے مقابل کسی اور کا چراغ جلنا محال تھا۔ تاہم دیگر شعراء نے بھی اپنی اپنی
بساط اور لیاقت کے پیش نظر طبع آزمائی کی اور خاطر خواہ اپنی جگہ بنائی۔ شعراء کے اسی زمرے

---

[1] اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا، از ای۔جی۔براؤن۔ جلد چہارم ص۱۱۲۔

میں شیخ محمد میرزا بادی رمزی کا بھی شمار ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے ادبی کارناموں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ راقم کو پاکستان کے سفر میں رمزی کے دیوان "رمز الریاحین" کو دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کی درخواست پر ڈائرکٹر نیشنل میوزیم کراچی (پاکستان) نے اس نایاب مخطوطے کی زیراکس عنایت کی۔ جس کے لیے راقم صمیم قلب سے ان کا شکر گزار ہے۔

"رمز الریاحین" کے مخطوطات[۱]

(۱) رمز الریاحین مخزونہ نیشنل میوزیم کراچی۔ (پاکستان)

فہرست انجمن ترقی اردو کراچی مرتبہ سید سرفراز علی رضوی، سلسلہ نمبر ۱۱۶۲۰، ص ۲۱۴، کل صفحات ۱۲۸۔ خط نستعلیق، مطلا و مذہب، پھولوں کی ۲۰ دیدہ زیب تصاویر۔

[مخطوطاتِ انجمن ترقی اردو کراچی (فارسی و عربی) از سرفراز علی رضوی۔ سنہ تصنیف سنہ ۱۰۷۶ھ درج کیا گیا ہے۔]

احمد منزوی کی مرتب کردہ فہرست نسخہ ہای خطی (نشریہ شمارہ ۳۸) ص ۲۸۳۴ (نمبر ۲۲۳، ۳۰) میں تعداد اشعار نہیں دی گئی ہے۔ کراچی کے مخطوطہ میں کل ۱۹۷۹ اشعار ہیں۔

(۲) فہرست نسخہ ہای خطی فارسی از احمد منزوی (نشریہ شمارہ ۳۸) ص ۲۸۳۵ سلسلہ نمبر ۲۰۱۲۳، کتب خانہ ملک ایران نمبر ۳/۴۰۹۰۔ خط شکستہ نستعلیق، گیارہویں یا بارہویں

---

[۱] ن۔ک فرہنگ سخنوران از خیامپور ص ۲۳۵ The secret Language of sweet scented flowers, a description in masnavi Rhyme of the Royal garden of Shadatabad at Isfahan (Iran) by Rieu catalogue of Persian MSS. British Museam Library London Page No 850 (Add-22-789)

صدی کا نوشتہ تعداد اشعار ۲۱۰ (نامکمل)

(۳) بحوالہ فہرست بالا مرتبہ احمد منزوی، نمبر ۱۲۱۰۳ ص ۲۸۲۴ کتب خانہ مجلس ایران۔
نمبر ۱۰۱۱، ۱۲۴۳ ہجری کا نوشتہ، دیوان صالح تبریزی سے منسلک ہے تعداد اشعار ۷۵۰۔
(اسکی مائکروفلم دانشگاہ تہران میں موجود ہے۔ نمبر ۲۸۲۳ (فیلمہا ۱۰۰)

(۴) بحوالہ فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، احمد منزوی (نشریہ شمارہ ۳۸) ص ۲۸۲۴
سلسلہ نمبر ۳۰۱۲۳ کتب خانہ برٹش میوزیم ۲/ ۲۲۷۸۹ . Add.
تاریخ کتابت شعبان ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء (در دفتر گ ۲۹۳-۲۳۸) ریو ۸۵۰

حالات | رمزی کا پورا نام شیخ محمد میرزا ہادی رمزی تھا۔ ان کے والد ماجد حاجی میرزا حبیب اللہ (عرف عبداللہ) کدخدائی کا پیشہ کرتے تھے۔ رمزی کاشانی الاصل تھے جیسا کہ تذکرۂ منتخب اللطائف کے مولف رحم علی خان ایمان نے تصدیق کی ہے "محمد ہادی رمزی تخلص در اصفہان بود"[1]

ذیل میں رمزی سے متعلق ایک طویل اقتباس درج کیا جاتا ہے جس کی نقل راقم نے اپنے ایران کے سفر کے دوران حاصل کی تھی یہ قصص الخاقانی[2] از ولی قلی خان ابن داؤد قلی خان ۱۰۷۳ھ سے لیا ہے۔

---

[1] تذکرہ منتخب اللطائف از رحم علی خان ایمان، مرتبہ امیر حسن عابدی ص ۱۹۳ [2] اقتباس منقول از امیر حسن ذاکر زادہ، تہران ایران ۲۸ جون ۱۹۹۰ء رمزی خلف حاجی عبداللہ کاشانی است ص ۲۲۷ نوٹ

[قصص الخاقانی مولفہ ولی قلی خان شاملو، یہ کتاب شاہ عباس ثانی کے نام سے منسوب ہے۔ قصص الخاقانی اس کا تاریخی نام ہے۔ اس سے ۱۰۷۳ھ تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس کا ایک حصہ مکتبہ مجلس اور دوسرا صدر ہاشمی کی ملکیت ہے۔ بحوالہ نسخہ ہای خطی فارسی از عارف نوشاہی ۲ : ۱۵۲-]

"از جملہ نقشبندان بہارستان لفظ و نقاشان بدایع نگار عالم معنی کہ رموز دانان
عالم اسرار غوامض خیالند و نورس نہال بوستان دار الشعرا دی خدام میرزا بادی
رمزی تخلص است کہ از اهتزاز نسیم نطق بهجت شمیمش ریاحین همیشہ بہار
گلستان مخزن ریاض فیاض چار چمن گلشن نثر همیشہ منغزاست، مرحبا
تازہ خیالی کہ بعنایت میرآب سحاب اندیشہ در فضای دل لطافت پیشہ اش
ریاحین حقائق معانی چمن چمن شگفتہ و حبذا صاحب کمالی کہ بقوت همت بیان
در گلشن زبان حق ترجمانش غنچہ های شقایق لفظ گل گل شگفتہ از مشاہدہ کمال گلزار
بی خس و خارش نسخہ موسوم بہ رموز الریاحینش کہ گونہ گونہ خال و خط مضمون بہ
روی هم چیدہ عندلیب حیرت شکیب نطق سخنوران جهان را خون امتحان تا سیست
از گل منقار چکیدہ از خجلت سنبل زلف جبین نثر او لیلای خطای قلمش کہ هرگز
آفت پریشان رقمی ندیدہ گل نسرین نسترن قرین بناگوش لالہ عذاری چادر
شرم بر سر کشیدہ مشارالیہ خلف میرزا حبیب و نسب آنحضرت بہ اعلم العلماء
افضل الفضلا نور چشم جهان مردمی ابن بابویہ قمی منتهی میشود [مولی الیہ] خطہ
پاک کاشان دو مثنوی کہ هر یک ثانی ندارد موسوم بہ رموز الحقائق و رموز الریاحین
قریب چہار هزار بیت از او بہ نظر این ذرہ احقر رسیدہ، ابیات مدون او کہ سن
شریفش از سی متجاوز از دوازدہ هزار متجاوز است و در فن نقاشی دست تمام
دارد. قدرتش در چوب تراشی بحدیست کہ از فیض طراوت آب دم سوہان
الماس عمل چوب خشک را رتبہ منصب سر سبزی بخشیدہ نمودی از گلستان
طبعش این چند بیت است.

غزل

بیا کہ بی تو بدل ہر دم از جہاں سنگ است

شیشۂ نازک مزاجِ ما سنگ است

نیافتم کہ پایان درد ما ز کجا ست

نبای کوہ کہ دانستہ تا کجا سنگ است

شکستہ تر شودم دل چو صاف تر گردد

بیا کہ بی تو در آئینہ ام صفا سنگ است

ملایمت کن و در چشم مردمان بنشین

کہ جا بدیدہ کند گرچہ تو تیا سنگ است

سوار باش بجادۂ جنونِ رمزی

کہ زیر پا ہمہ جا خار پیش پا سنگ است

این ابیات از جملہ اشعار مصنوعِ مشارالیہ است کہ در دو بحر خواندہ می شود

دو بحرین:۔

ای بدل از داغ تو گلزارہا

در جگر از دوری تو خارہا

حسن تو در پردہ و کشتہ بیان

جلوہ گر از عکس تو دیدارہا

مطلعِ مثنویِ موسوم بہ رمز الریاحین اینست

بشہد شکر شکر خداوند

زبان چون مغز بادامست در قند

رباعی :-

عاشق وصلش طلب کند از دل ریش　　　میل معشوق باشد از عاشق بیش
ہر چند کہ قطرہ را وجود از دریاست　　　دریا بوجود قطرہ بالد بر خویش

سفینۂ خوشگو کا مولف رمزی کی رسا طبیعت کی بابت رقمطراز ہے کہ "طبعش قدرت بکمال داشتہ۔ در ہر شعری بمجلس ما۔ از شعر خود دلیل میخواند"[1]

عارف نوشاہی[2] (حالیہ ایران) نے رمزی کاشانی کا سنہ پیدائش ۱۰۳۳ھ/ ۱۶۲۳ء کے لگ بھگ قرار دیا ہے۔ راقم کے نزدیک عارف نوشاہی کا قیاس جس کی بنیاد مندرجۂ بالا اقتباس پر ہے، بالکل صحیح ہے۔ [فہرست نسخہ ہای خطی فارسی، انجمن، کراچی پاکستان، ص ۱۵]

طاہر نصرآبادی نے اپنے تذکرے[3] میں اتنی نشاندہی کی ہے کہ رمزی ۱۰۸۳ھ تک اصفہان میں مقیم تھے۔ طاہر نصرآبادی کے اس بیان سے تصدیق ہوتی ہے کہ رمزی نے ۷۰ برس سے زیادہ عمر پائی اور وہ شاہ عباس ثانی کے انتقال کے بعد کم و بیش دس برس زندہ رہے۔

عارف نوشاہی نے تذکرۂ نصرآبادی کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ رمزی شاہی سرپرستی سے قبل اردبیل کے حاکم مرتضیٰ قلی خاں[4] سے وابستہ تھے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ

---

[1] سفینۂ خوشگو: ص ۲۲۲ [2] تذکرۂ منتخب اللطائف از رحم علی خاں ایمان ۱۲۲۶ھ، سلسلہ نمبر ۲۳ ص ۱۹۷

[3] تذکرۂ طاہر نصرآبادی، چاپ تہران ص ۲۷۳ (۱۳۱۷ش) [4] از اعاظم این شاملو است۔ در ایام نواب صاحبقرانی شاہ عباس ثانی قورچی باشی گری سرفراز شدہ بعد از ان معزول شدہ بعد تا پادشاہ برسر شفقت آمدہ متولی و وزیر اردبیل شدہ ہمراہ با موزونان صحبت شعر میدارد و خود متوجہ نظم میشود چنانچہ دیوان فصاحت بنیان ایشان قریب بچہار ہزار بیت است۔ ص ۲۷ تذکرۂ نصرآبادی۔

اصفہان کی خوبصورتی میں اضافہ کرنے میں رمزیؔ جیسے ماہر چوب تراش اور نقاش کا حصہ رہا ہو۔ مال کی حیثیت سے انھوں نے بے لوث خدمت انجام دی ہو، بہر کیف ایک سلجھے ہوئے شاعر کی حیثیت سے رمزیؔ نے فارسی ادب میں بیش بہا اور شہ یادگار چھوڑا۔ انہیں علم نباتات، طب و حکمت سے بھی اچھا خاصہ لگاؤ رہا ہوگا۔ پھول اور پتیوں کی نباتاتی خصوصیات کو انھوں نے "رمز الریاحین" میں بخوبی آشکار کیا ہے۔ رمزیؔ کی جمالیاتی حس نے پھولوں کے مناظرے کو لطیف سے لطیف تر بنا دیا ہے۔ لہٰذا ایرانی پھولوں کا یہ تمثیلی مناظرہ فارسی ادب کا شاہکار بن گیا ہے۔

تصانیف | "رمز الریاحین" کے علاوہ رمزی کی ایک اور مثنوی کا سراغ ملتا ہے۔ اس مثنوی کا نام "رمز الحقائق" ہے[1]۔ اس میں دو ہزار[2] سے زائد اشعار ہیں۔ اس کا ایک حصہ مکتبہ مجلس (ایران) اور دوسرا ابن یوسف (ایران) کی ملکیت ہے۔ تذکرۂ نصرآبادی میں رمزیؔ کی غزلیات کے منتخبہ اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمزیؔ کی غزلیات اور دیگر اصناف سخن پر بھی علٰحدہ دیوان یقینی ہے۔

اصفہان نصف جہان | "رمز الریاحین" میں رمزیؔ نے اصفہان کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی وجہ سے مورخین ادب کو ان کے اصفہانی ہونے کا شبہ ہوا۔ حالانکہ وہ کاشان کے باشندے تھے اصفہان دراصل رمزیؔ کے فنون لطیفہ کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

---

[1] الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ : رمز الحقائق و مثنوی رمزی الکاشی المذکور فی (۹: ۳۷۴) و ہو منتخب "رمز الریاحین" الآتی موجود فی مکتبۃ (المجلس) کما فصلہ ابن یوسف فی فہرسہا (۳ - ۲۰۷)۔ نمبر ۵۲۲ [2] "رمز الریاحین" نمبر ۱۵۷۴ ص ۱۴۹ [3] فہرست نسخہ ہای خطی از احمد منزوی جلد چہارم ص ۲۸۴۳۔

یہاں فن کی قدردانی و پذیرائی ہو رہی تھی اور قدرتی خوبصورتی نے اصفہان کو جنت نشان بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دمزتی کشاں کشاں اصفہان چلے آئے اور اپنے حاصل کردہ فنون کو مزید جلا بخشی۔

فارسی ادب میں گوناگوں خصوصیات کے باعث اصفہان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ قم کو روحانیت، شیراز کو سعدی و حافظ کی بدولت فوقیت حاصل ہے۔ چنانچہ حافظ نے شیراز کی تعریف میں کہا ہے۔

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت ۔۔۔ کنارِ آبِ رکنا باد و گلگشتِ مصلیٰ را

اسی طرح شعرائے کرام نے اصفہان کی تعریف و توصیف میں مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ ایک ہندوستانی عالم و شاعر ملا فیروز بن کاؤس جلال (۱۷۵۸ء/۱۸۳۰ء) نے اپنے "سفر نامہ ایران" میں اصفہان کو ان الفاظ میں سراہا ہے۔

بفضل حق باصفہان رسیدیم ۔۔۔ تو گفتی بر زمین جنت بدیدیم
بہر جا باغ و آب جوی جاری ۔۔۔ گل و سنبل بہر گوشہ کناری
پر از غلغل ز بلبل باغ و بستان ۔۔۔ ہوا خوش ہمچو طبع مے پرستان
خداوند جہان گر اصفہانش ۔۔۔ نمیبودی، نمیبودی جہانش
چو آنجا نیست جای علم امکان ۔۔۔ تو پنداری مگر خود ہست یونان[1]

مولوی محمد حسین آزاد نے سن ۱۸۸۵ء/۱۸۸۶ء میں ایران کا سفر کیا۔ آزاد نے اصفہان کی ان الفاظ میں مدح سرائی کی ہے

"شہر اصفہان کی وسعت فی الحقیقت بہت فراخ ہے۔ اس نے فارسی مبالغہ کو درست

---

[1] سفر نامہ ایران: از ملا فیروز مملوکہ مہرجی رانا لائبریری، نوساری، ص ۳۹۔

موقع دیا کہ شعرا نے کہا ؎

جہان را اگر اصفہانے نبود جہان آفرین را جہانے نبود

دوسرے نے کہا ؎

اصفہان نیمہ جہان گفتند نیمہ وصف اصفہان گفتند

اصفہان کی زندہ رود کے سلسلے میں مبالغہ آرائی ملاحظہ کیجئے۔

اگرچہ زندہ رود آب حیات است ولے شیراز ما از اصفہان بہ[1]

مولوی محمد حسین آزاد نے اصفہان کے تخت فولاد، مینار جنبان[2]، تالار بزرگ و اس کے دو گوشہ میناروں کو دیکھا اور بے ساختہ کہہ اٹھے "یہ شہر سلاطین صفویہ کی ہمتوں کا عجائب خانہ ہے، عمارات عالیشان کا حال کیا کہوں"۔ "در اصفہان عجائب روزگار است"۔ اصفہان سے آزاد کاشان بھی گئے۔ آزاد کے مطابق اصفہان سے کاشان تک کا فاصلہ صرف آٹھ منزلیں ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصفہان سے کاشان زیادہ دور نہیں ہے۔ البتہ شاہان صفویہ نے اصفہان کو مرکزیت بخش دی تھی لہذا اس کی ترقی میں چار چاند لگ گئے تھے۔ فنون لطیفہ کے ہر شعبہ میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی۔ فریڈرک تالبرگ نے شاہان صفوی کی فنون لطیفہ کی سرپرستی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"سلاطین صفوی معماری و ہنرہای زیبا و کارہای دستی را تشویق میکردند۔ بناہای

---

[1] سفرنامہ ایران از مولوی محمد حسین آزاد ص۲۲ و ص۱۰۳ (زندہ رود دریائے اصفہان است، سہ جائل طولانی از عہد شاہ عباس تعمیر است۔ آزاد) [2] ہلنے والے مینار، احمد آباد میں اس کی نقل ہے۔

باشکوہ و عالی و محصولات ہنری بسیار مانند قالی، زری، پیراق، نقاشیہای کتاب و دیوار، کاشیہای معرق، ظروف برنجی، سفال و کوزہ، کاشیہای رنگین، خطوط زیبا توسط خطاطان مشہور، زینت آلات طلا و نقرہ، بشقاب ہا و ظروف مینا کاری و سائر قطعات ہنری کہ از این دوران باقی ماندہ از لحاظ زیبائی و ظرافت و ذوق و سلیقہ بہ درجہ است کہ در ہنوز نظیر آنہا پیدا نشدہ است۔"[1]

مندرجہ بالا فنون کی روز افزوں ترقی کے باعث اصفہان دیکھتے ہی دیکھتے عجائب روزگار بن گیا۔ لہذا رمزی نے اصفہان کو اپنا مسکن بنا لیا اور اس کی دل کھول کر تعریف کی۔ رمزی نے اصفہان کے بہشت[2] نما باغ کی تعریف سن رکھی تھی۔ ایک مرتبہ شاہ عباس ثانی نے رمزی کو اصفہان کے باغات کی سیر کو مدعو کیا۔ بادشاہ نے اپنے مخصوص باغ کی توصیف و ستایش کی درخواست کی۔ تاکہ رمزی کا مشاہدہ اور دعوت نظارہ ادبی شہ پارہ اور ادبی تاریخ کا جز بن جائے۔ رمزی نے "باغ ہزار جریب" کی انوکھے پیرایہ میں تعریف کی اور اس شاہی دعوت کو زندہ جاوید بنا دیا۔ انھوں نے پھولوں کے مناظرے کو تمثیلی شکل دے کر مثنوی کے قالب میں ڈھال دیا۔ رمزی کا یہ کارنامہ فارسی شاعری میں اختراع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہ عباس ثانی نے جس وقت باغ سعادت آباد کی بنا ڈالی تو رمزی نے صمیم قلب سے دعائیں دیں۔ وہاں کی ہر شے کو سراپا اصفہان کی صبح و شام، نہر و حوض، مچلتے ہوئے فوارے، بلند و بالا عمارتیں، روشنیں اور ہر قسم کے درختوں اور پھولوں کا رمزی نے نہایت چابکدستی

---

[1] از کورش تا پہلوی، از فردریک تالبرگ، چاپ تہران ص۸۰ [2] ایرانی تاریخ میں یہ باغ "باغ ہزار جریب" کہلاتا ہے۔

سے محاکمہ کیا۔ حتیٰ کہ خود بادشاہ نے اسے "باغ بہشت نما" قرار دیا۔ رمزی نے اپنے دیوان کا آغاز حمد، نعت، منقبت اور معراج نامہ سے کیا۔ اس کے بعد رمزی نے بادشاہ کی بہشت آئین مجلس کی مدح میں ایک خوبصورت قصیدہ ترتیب دیا اور اس کے عوض میں معقول صلہ حاصل کیا۔ مجلس نشاط و سرور میں کیف و سرمستی لازمی چیز ہے۔ لہٰذا رمزی نے بلبل خوش الحان کی زبانی "عشق و عاشقی کے رموز کی عقدہ کشائی کی" گل و بلبل کے تذکرے کے ساتھ بادہ و ساغر، کیف و انبساط، رنگ اور ترنگ بہار و گلفام کے ذکر سے مثنوی کو قوس قزح بنایا۔ گل و لالہ کی مہک ساغر و مینا کی کھنک اور ساقی گلفام کی مدح سرائی کے بعد دیوان رمزی کے اس حصہ کا آغاز ہوتا ہے جو ادبی نقطۂ نظر سے اور نباتات شناسی کے لحاظ سے نہایت اہم ہے۔

رمزی نے ساقی ہوش ربا اور بلبل خوش نوا کے ہمراہ اصفہان کے بہشت نما باغ میں گلہائے رنگ و بو کی ایک مجلس آراستہ کی۔ ان کی آتشیں زبانوں کو انداز تکلم سے نوازا۔ انہیں نطق و گویائی کے آداب سکھائے۔ جب آتشیں اور بوقلمون زبانیں گویا ہوئیں تو باغ میں ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔ پھر ایک پھول نے اپنی مدح اور مد مقابل کی قدح کے پہلو نکالنے شروع کیے اور مناظرۂ گل با گل دیگر طول کھینچتا چلا گیا۔ مئے ارغوانی کے خم کے خم چھلکے تو ساقی نامہ مرتب ہوا۔ الغرض رمزی کا یہ تمثیلی مناظرہ باغ جنان کا منظوم محاسبہ فارسی شعر و ادب کا ایک شاہکار بن گیا۔ تمثیل نگاری فارسی ادب کی قدیم روایت رہی ہے۔ فتاحی نیشاپوری نے "قصہ حسن و دل"[1] کے ساتھ اس کا آغاز کیا تھا۔ لہٰذا یہ سلسلہ جاری رہا اور رمزی نے بھی اسی تمثیلی انداز کو اپنایا اور ایک اچھوتے

---

[1] قصہ حسن و دل، مضمون از راقم، شیرازہ کشمیر ۱۹۶۹ء جلد ہشتم۔

ڈھنگ سے بے زبان پھولوں سے ہر وہ بات کہلوائی جو اس کے رنگ اور روپ میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ آج تک ہر شخص نے پھولوں کی خصوصیات و رمز کو محسوس ضرور کیا لیکن ان کی خوبی و زشت کو رمزی نے شعری جامہ پہنا کر پیش کیا۔ رمزی کی یہ تحقیق و تجسس ایک کارنامے سے کم نہیں ہے۔ لہذا رمزی ہماری داد و ستد کے صدر درجہ مستحق قرار دیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ طاہر نصرآبادی بیشتر رمزی کی شخصیت و شاعری پہ اظہار خیال کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:۔

"طبعش نہایت قدرت دارد، چنانچہ ہیچ لطیفہ و مثل در عالم نیست کہ او موزون نکردہ باشد، چرا کہ ہیچ مثلی مذکور نمی شود کہ از شعر خود دلیلی نمیخواند۔ در فن نقاشی و چوب تراشی ہم مانند ندارد"[1]

مخطوطے کا اجمالی تعارف | رمز الریاحین۔ مملوکہ نیشنل میوزیم، کراچی۔ فہرست مخطوطات فارسی، از رضوی۔ صفحات، ۱۳۸، سائز" 6 ×½ خوبصورت اور نفیس شیرازہ بندی ۲۸ ایرانی پھولوں اور دو پرندوں کی نہایت دیدہ زیب تصویریں۔ سطر فی صفحہ ۱۸ کاغذ زر پاشں، مطلا مذہب۔ ترقیمہ، ندارد اس کے موضوعات حسب ذیل ہیں۔

دیوان رمزی کی ابتدا حمد و مناجات سے ہوتی ہے۔

الف ۱۔ لیشہد شکر خدا وند　　　زبان چون مغز با دامست در قند

الٰہی خاطر اندوہ گین دہ　　　رخ زرد و سر شک آتشین دہ

الف ۲ (کل چار مناجات)

۲۔ اس کے بعد معراج نامہ ہے جس میں ساتوں آسمانوں کی سیر پیش کی گئی ہے۔

---

[1] تذکرہ نصرآبادی: طاہر نصرآبادی ص ۳۰، ۳۱

نعت رسولؐ:۔

محمدؐ آبروی آفرینش چراغ افروز در چشم اہل بینش

معراج نامہ:۔

شبی مجموعۂ فیض الٰہی منور گشتہ از مہ تا بماہی

۳۔ اس کے بعد نعتیہ غزل ہے۔

ازین خوشتر بگو رمزی دمادم کزو یابی مراد ہر دو عالم

۴۔ مختصر نعت کے بعد منقبت ہے جس میں حضرت علیؓ کی مدح ہے۔

در نعت رسولؐ:۔

کرا در خور بود زینگونہ پیوند کہ داماد ش بود شیر خداوند

۵۔ شاہ عباس ثانی (۱۰۵۲ھ تا ۱۰۷۷ھ) کے عدل و احسان سے متعلق قصیدہ۔

بدوران چنیں شاہ جوان بخت کہ برخوردار باد از تاج و از تخت

۶۔ اصفہان کی شان و شوکت پر ایک نظم۔

کہ باغی در کنار اصفہان است کہ عیش افزا تر از باغ جنان است

۷۔ سبب نظم کتاب۔

بیا با صدق دل تا حضرت شاہ کہ بینی مدعای خویش دلخواہ

بخوان در مدح شہ نظمی کہ داری کہ دامن پر گل مقصد بیاری

اس کے ساتھ ساتھ ..

۸۔ صبح اصفہان کی تعریف و سبب نظم کتاب:۔

یکی روشن صباحی بود خرم از و بیدار چشم عیش عالم

خجستہ پیکی از مہدیؔ[1] قلی خاں رسیدہ این مژدہ ها واز لطف واحساں[2]

۹۔ زایندہ رود اصفہان کی تعریف :۔

نہادہ زندہ رودش جبہہ بردر زخاکش آب رو بگرفتہ گوہر

۱۰۔ در تعریف سعدی :۔

---

[1] شاہ عباس ثانی کے وزیر کل کا اسم گرامی۔ نواب مہدی قلی خان نے رمزیؔ کو مدحیہ نظم پڑھنے کی دعوت دی تھی۔ رمزیؔ نے اس دعوت کی طرف مندرجہ ذیل اشعار میں واضح اشارہ کیا ہے۔

کہ شاہ امروز در باغست چون گل رسد بر گوشۂ چرخ افغان بلبل

بیا با صدق دل تا حضرت شاہ کہ بینی مدعائے خویش دلخواہ

مشرف شو بپا بوس شہ امروز کہ ہست این عید قربان تو نوروز

بخوان در مدح شہ نظمی کہ داری کہ دامن پر گل مقصد بیاری

برنگ غنچہ من زین مژدہ خندید چو گل از خرمی بر خویش بالید

بخود گفتا کہ ای بیداد برخیز گل مطلب بجیب مدعا ریز

مخطوطہ رمزالریاحین ص۲۳، تذکرۂ نصرآبادی تالیف میرزا محمد طاہر نصرآبادی میں مولانا محمد امین الوقاری الیزدی کی تحریر کردہ تاریخ ملتی ہے جو انھوں نے نواب میرزا مہدی (قلی خاں) صدر کی وزارت کے موقع پر منظوم کی تھی۔

چو آنگہ دیدم در فیض ازل را حلقہ کوبیدم

دو تاریخ از دو مصراعم کشود آرم بنظم اینک

وزیر کل ایران زیب ملکی صدر دین مہدی

زہی کامل زہی دستور دام اللہ اقبالک

تذکرۂ نصرآبادی ص۴۸

بہ پیشش سدی از خار اکشیدہ   چنان سدی کہ اسکندر ندیدہ

۱۱۔ در تعریف باغ سعادت آباد (اصفہان)

درین روی عیان از چوب شمشاد   چو حرف مرد دانشمند آزاد

۱۲۔ در تعریف اشجار و ریاحین و چنار۔

۱۳۔ اس کے بعد مختصر سی دعا ہے اور ساتھ ہی اصفہان کی پرشکوہ عمارات کا ذکر ہے

۱۴۔ در دعائے دولت شاہ عالم پناہ۔

الہی تا بود گلزار عالم   بود گلزار طبع شاہ خرم

۱۵۔ در تعریف میمنت اساس سوادت آباد۔

چو بکنذی تماشا سادہ بہبود   بناگہ مصر این گلزار بہبود

۱۶۔ در تعریف حوض و فوارہ و نہر۔

بہر سو پیش نمایان حوض آبی   گل آن باغ و بستان را گلابی

اس کے بعد رمزی کی شاہی مجلس میں شرکت کا بیان ہے۔

۱۷۔ رفتن بمجلس "بہشت آئین" و مدح خواندن و صلہ گرفتن۔

چو خواندم مدح شہ را تا پایان   شہ عالی کرم از لطف و احسان

بہر یک بیت یک تومان عطا کرد   ہمہ کارم بعین مدعا کرد

بعد ازاں عشق و عاشقی کا بیان ہے اور بلبل کی زبانی رموز عشق کی پردہ کشائی کی گئی ہے۔

۱۸۔ غزل در تعریف عشق از زبان بلبل۔

بیا ای شیخ در کاشانہ عشق   بہ بین روح القدس پروانۂ عشق

چون از بلبل مراین ابیات رمزی شنیدم جملہ از افسانۂ عشق

۱۹۔ در صفت و شور و سودای عشق :۔

خرد را محرم اسرار کردم زبان را طوطی گفتار کردم
در گنج سخن را باز کردم زہجران این غزل آغاز کردم

۲۰۔ غزل از رمزی۔

مطلع ۔ بیا ای شاہباز کبک رفتار گذاری کن بسوی این گرفتار
مقطع بیا جانا کہ رمزی را شگفتہ گل آشفتگی بر طرف دستار

۲۱۔ قطعۂ نصیحت آمیز از زبان بلبل :۔

نظر از غیر جانان باید ت دوخت نظر بازی ز نرگس باید آموخت
کہ ہرگز غیر یارش در نظر نیست ز گلزار ز گچینش خبر نیست

۲۲۔ مثل :۔

بچشم دل توان آن یار دیدن فروغ شعلۂ دیدار دیدن

۲۳۔ قطعۂ از زبان بلبل در تعریف بہار وصبے :۔

بافغان بلبلان در باغ و بستان چرا خاموش بنشیند سخندان

اس کے بعد رمزی نے "ساقی نامہ" منظوم کیا ہے۔ جس کے مندرجہ ذیل عنوانات ہیں۔

۲۴۔ (۱) در تعریف ساقی۔

دمی کردن بیار زندگانی بود خوشتر ز عمر جاودانی

(۲) خطاب بساقی قم :۔

بدہ ہر قطرۂ زان مے بحر نوری رسد بر دل از ان ہر دم شعوری

(۳) خطاب بخویش :۔

بیا ای دل رہِ افتادگی گیر گلابی از گل آزادگی گیر

(۴) خطاب بساقی و قسم نامہ :۔

بفریادرو فغان دادخواہان بعدل بادشاہ بادشاہان

(۵) در تعریف مے :۔

شرابی دہ کہ چون رخ برفروزد تجلی وادیِ ایمن بسوزد

ساقی نامہ کے اختتام پر رمزیؔ نے نہایت دلکش موضوع پر قلم اٹھایا ہے انھوں نے ساقی سے مخاطب ہوکر نوبہار کی جلوہ طرازیوں اور ریاحین خوشرنگ کا مناظرہ پیش کیا ہے۔ اس نظم میں کل اٹھائیس[۲۸] مہکتے اور لہلہاتے ہوئے پھولوں کا ذکر ہے۔ جو مجلس عیش وطرب میں اپنی اپنی خوبیوں کو پیش کرتے ہیں اور مد مقابل پھول اس کی مذمت کرتے ہوئے اپنی خصوصیات عیاں کرتا ہے۔ رمزیؔ نے اسی مناسبت سے اپنے دیوان کا نام "رمز الریاحین" منتخب کیا ہے۔ مذکورہ اٹھائیس[۲۸] پھولوں کا سلسلہ ذکر مندرجہ ذیل ترتیب کے مطابق ہے۔

انگریزی مترادفات	نمبر	فارسی			اردو مترادف
Narcissus.Franchdaffodil	۱	گفتگوی نرگس در	تعریف	حسن وجمال خویش	
violet/Pansy.vioacene	۲	" بنفشہ "	مذمت	نرگس	
		" " "	تعریف	رنگ و بوی خویش	
	۳	" بیدمشک "	مذمت	بنفشہ	مشک بید
Hyacinth, nard.	۴	" سنبل "	مذمت	بیدمشک	سنا۲

انگریزی مترادفات	نمبر	فارسی			اردو مترادفات
		گفتگوی سنبل در	تعریف	رنگ و بوی خویش	
.Ambergris.Jonqui.	۵	" عنبربو "	مذمت	سنبل	
		" عنبربو "	تعریف	رنگ و بوی خویش	
.cornpoppy.Adonis Anemone	۶	" شقائق "	"	آب و رنگ خویش	گل لالہ
Delphinium.larksp. ur	۷	" گل زبان درقفا	مذمت	شقائق	
		" " "	تعریف	آب و رنگ خویش	
whallflower, garden-Rocket Damis violet	۸	" شب بو در	مذمت	گل زبان باقفا	رات رانی
		" " " "	تعریف	رنگ و بوی خویش	
lilly of thi vally, lili-aceaus	۹	" " سوس "	مذمت	شب بو	
		(آسمانی رنگ کا پھول جسے شعرا زبان سے تشبیہ دیتے ہیں) گفتگوی سوس در	تعریف	آب و رنگ خویش	
Tulip. Anemone	۱۰	" لالہ سعد "	مذمت	سوسن	لالہ نعمان
		" لالہ "	تعریف	آب و رنگ خویش	
Dehiscent Opening of thi capsul of the Plan(ts)	۱۱	" شگوفہ "	مذمت	لالہ	
		" شگوفہ "	تعریف	حسن و جمال خویش	
Dark Blue Jasmine	۱۲	" یاسمین کبود "	مذمت	شگوفہ	
		" " "	تعریف	خویش	
lovetree siliquastrum	۱۳	گفتگوی ارغوان در	مذمت	یاسمین کبود	

انگریزی مترادفات	نمبر	فارسی			اردو
		گفتگوی ارغوان در	تعریف	حسن وجمال خویش	
white lily	۱۴	” زنبق سفید ”	مذمت	ارغوان سرخ	
		” ” ” ”	تعریف	رنگ وبوی خویش	
	۱۵	” گل عاشق ومعشوق ”	مذمت	زنبق سفید	
		” ” ” ”	تعریف	حسن خویش	
Amaranth cockscomb.	۱۶	” زلف عروس ”	مذمت	گل عاشق ومعشوق	تاج خروس [illegible]
		” ” عروسان ”	تعریف	آب ورنگ خویش	
Hemerocallis. Daylily	۱۷	” زنبق زرد ”	مذمت	زلف عروس	چنبیلی کی قسم
		” ” ”	تعریف	خویش	
	۱۸	” گل مشکیچه	مذمت	زنبق زرد	
		” ” ”	تعریف	آب ورنگ خویش	
clove gilli flower. caryophyllaceous	۱۹	” قرنفل ”	مذمت	گل مشکیچه	
		” ” ”	تعریف	آب ورنگ خویش	
white Jasmine	۲۰	” یاس سفید ”	مذمت	قرنفل	یاسمن
		” ” ” ”	تعریف	حسن خویش	
	۲۱	” گل عباس ”	مذمت	یاس سفید یا یاسمن سفید	
		” ” ”	تعریف	آب ورنگ خویش	
Sweet Basil	۲۲	” ریحان ”	مذمت	گل عباس	

انگریزی مترادفات	نمبر	فارسی					اردو
		گفتگوی ریحان	در	تعریف	آب و رنگ خویش		
Parsely, French-Marigold.	۲۳	، گل جعفری	،	مذمت	ریحان		
		، ،	،	تعریف	آب و رنگ خویش		
sweet brier-Eglantine	۲۴	، نسترن	،	مذمت	گل جعفری	جنگلی گلاب	سیوتی
Marshay Hollyhock Rose-mallow	۲۵	، خطمی	،	مذمت	گل نسترن		گل خیرو [نیلے رنگ کا پھول جو طبی دوا استعمال ہوتا ہے]
		، ،	،	تعریف	آب و رنگ خویش		
Yellow ochre	۲۶	، گل زرد	،	مذمت	گل خطمی		
		، ،	،	تعریف	رنگ و بوی خویش		
china Aster	۲۷	، گل رعنا	،	مذمت	گل زرد		گل مینا
		، ،	،	تعریف	رنگ و بوی خویش		
Rosebush Rosaceous	۲۸	، گل سرخ	،	مذمت	گل رعنا		سدا گلاب، گل پیادہ
		گفتگوی گل سرخ	در	تعریف	خود و رنگ و بوی خویش		
		تمثیل (غزل) از زبان بلبل	در	تعریف	گل سرخ		

. . . .

. . . .

. . . .

اس کے بعد بادشاہِ زمانہ سلطان حسین صفوی موسوی بہادر خاں کی مدح میں قصیدہ ہے۔ خطاب اور اختتامیہ اشعار میں کلیات کے نام کی صراحت کی گئی ہے۔ ص

نہادم نام او را رمزالریاحینؑ — کہ دردی ہست گوہری ناسفتہ

کلیات میں اصنافِ سخن کی تعداد:۔

(۱) قصاید (۴)، (۲) غزلیں (۳) (۳) قطعات (۲) (۴) تمثیل (۴) (۵) مثنوی (۱) طویل مثنوی۔ دربارۂ مناظرۂ گلہا۔ (۶) رباعیات (۴) = کل ۱۸۔

رمزی کے بکھرے ہوئے اشعار | (۷) حمد، مناجات، نعت، منقبت، معراج نامہ، ساقی نامہ۔

اشعار رمزی ماخوذ از تذکرۂ نصرآبادی (تالیف میرزا محمد طاہر نصرآبادی: با تصحیح و مقابلہ از وحید دستگیری ۱۹۵۳ء، کتابفروشی فروغی۔ ایران)

رباعی:۔ ۱۔ رمزی زکریم اگر خبردار شوی — از بہر عطای او گنہگار شوی

جز اینکہ کنی گناہ و احسان خواہی — مستوجب رحمت بچہ کردار شوی[1]

(۲) آنم کہ نہ حاصلی نہ کشتی دارم — نہ کار بکار خوب و زشتی دارم

از من ہمہ می رمند یاران وطن — دردوزخم و طرفہ بہشتی دارم

(۳) ہمدم بنود بکنج این دیر مرا — در گلشن بیکسی بود سیر مرا

ہمچون الفم ہراستی پا بر جا — نبود حرکت بخانۂ غیر مرا

(۴) ای مونس و غمگسار دیرینۂ من — بسی یاد تو دل مباد در سینۂ من

---

[1] ریحانۃ الادب، تالیف استاد علامہ میرزا محمد علی مدرس، جلد دوم ص۱۳۱ - ص۱۳۲ در تذکرہ گویند "درکمال پریشان از طبع توانا داشت، چنانچہ ہر لطیفہ و مثلی را کہ بنظرش میرسید آنرا موزون می کرد و مثلی را کہ مذکور می شد از شعر خود استشہاد می نمود" مدرس۔

گر پرتوی از لطف تو بر من تابد — زربفت شود لباس پشمینۂ من[1]

اشعار منتخبہ از غزلیات رمزی:-

۱- عارف میان خلق ہمان با خدا بود — در معدنست لعل و ز خارا جدا بود[2]

۲- بترس از ناوک آہ فقیران در دل شبہا — مگو تیر ہوائی بر نشان ہرگز نمی آید

۳- وحشی نگہان عاشق غمخوار نخواہند — در گلہ آہو نبود راہ شبان را[3]

۴- زبر دستی را کجا باک از زبر دستی بود — ہر کہ باشد در بلندی ہیش از پستی بود[4]

۵- گوشۂ ابرو چو پیش از وعدہ بنمای آشنا[5] — گر ہلال عیدی کم یک نماید خوشنما است

۶- بکاہد دل چو نقص دولت روشندلی بینم — چنان کز کاہش مہ مغز بادام استخوان کاہد[6]

تاریخ سد زایندہ رود در اصفہان:-

۱- مصمم بود شہ را عزم حبای — چو بشنید این سخن را منحرف شد
تا آذر با محبان آمد ببغداد — عنانش زان عزیمت منعطف شد
خبر شد حافظ احمد را از این عزم — سرش در فکر ہم وشش کنف شد
بجد شد در فرار خویش و برگشت — تو گفتی آفتابش منکشف شد
چو رفت این قسم تاریخش نوشتم — بحیص و بیص احمد منصرف شد

۲- چند اسدی کہ از غنا ابد بیش زندہ رود — از علای شاہ دین عباس ثانی بستہ اند
بہر تاریخش گذشت از آب رمزی نوشت — سد سکندر باب زندگانی بستہ اند

---

[1] رباعی ۱۳ تا ۱۴ + تذکرہ نصرآبادی صفحہ ۴۲۲ و ابن یوسف (کتابخانہ مجلس تہران - ۱۰۴، ۲۰۰)، [2] قاموس الاعلام ازش سامی (ترکی) صفحہ ۲۲۹۹ سنہ ۱۳۱۶ھ [3] زنوری (ر) روضۂ پنجم قسم دوم صفحہ ۳۳۲ [4] آذر صفحہ ۲۱۰ [5] روز عرفات در منتخب اللطائف مولفہ رحم علی خان ایمان ۱۰۴۹ھ سلسلہ نمبر ۳، ۶ (مولف نے صرف ایک شعر نقل کیا ہے)، [6] تذکرۂ نصرآبادی صفحہ ۴۲۲ [7] ایضاً صفحہ ۴۲۲ [8] ایضاً صفحہ ۲۸ (از آثار ملی اصفہان، از ابو القاسم رفیعی، تہران)

کچھواہہ راجہ بھگونت داس والیٔ انبیر

از

جناب عبدالرؤف خاں ایم۔ اے۔

آمیر (جے پور) کے ابتدائی کچھواہہ راجگان معمولی حیثیت کے زمیندار تھے جن کی تاریخ بجائے تاریخی حقائق و شواہد کے محض تخمین و ظن و قیاس آرائی پر مبنی ہے لیکن راجہ پرتھوی راج کچھواہہ (۱۵۰۳ء - ۱۵۲۷ء) کے عہد سے آمیر کے راجاؤں کو قدرے اہمیت حاصل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ پرتھوی راج خانواہ کنواہہ یا کانوہ کی جنگ ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا کے ہمراہ داد شجاعت دیتا ہوا بری طرح زخمی ہوا اور زخموں کی تاب نہ لا کر ۱۵۲۷ء میں ہی فوت ہو گیا۔ چنانچہ جے پور کے راجگان اسے ہی اپنا مورث اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے اپنے شجرہ کی ابتدا اسی سے کرتے ہیں، چندر محل اور البرٹ ہال (میوزیم) جے پور کی دیواروں پر جو تصویریں بنوائی گئی ہیں، ان میں

---

[1] ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ کچھواہہ رام چندر جی کے بڑے بیٹے کش کی نسل سے ہیں اس کے برعکس کچھ مورخ اس لفظ کو "کچھپ (سنگ پشت بر گھٹ (جسم) کی بگڑی ہوئی شکل تسلیم کرتے ہیں جس سے عام بول چال میں کچھواہہ بنا۔ کش کی نسل ہونے سے بھی "کشواہہ" کہلائے اور یہی کشواہہ عوامی لہجہ میں کچھواہہ ہو گیا۔ (ملاحظہ ہو "راجستھان کا اتہاس" ص ۱۰۵-۱۰۴۔ از گوپی ناتھ شرما مطبوعہ ۱۹۵۸ء۔

پہلی تصویر دسی پرتھوی راج کی ہے۔ کیونکہ اس خاندان[8] میں وہ پہلا ایسا راجہ تھا جسکی حکومت وسعت رقبہ اور کسی حد تک سیاسی اہمیت کے پیش نظر مستحکم ہوگئی تھی۔ راجہ پرتھوی راج کے نو[9] رانیاں تھیں جن میں بیکانیر کے راؤ لون کرن کی راجکماری بالاں بائی کے بطن سے بارہ[12] اولاد ذکور اور سات دیگر رانیوں سے تھے، اس طرح اس کے کل انیس[19] راجکمار تھے[13]۔ ان میں سے پورن مل، بھیم سی (بھیم دیو) اور بھار مل آمیر کے راجہ ہوئے۔ پرتھوی راج کے انتقال (۱۵۲۷ء) کے بعد پورن مل آمیر کی گدی پر بیٹھا، اس دوران میں مغل حکومت نسبتاً مستحکم و پائدار ہوگئی تھی۔ اس وجہ سے پورن مل نے مغلوں سے روابط قائم کرنا چاہے اور وہ پہلا راجپوت زمیندار تھا جو مغل شہنشاہ ہمایوں کے دربار میں حاضر ہوا اور "راجہ" کے خطاب نیز ماہی مراتب[20] کا اعزازی نشان

---

[1] دیکھئے موہتا نینسی ری کھیات، راجستھانی بھاکا میں بہت سے یاد فروش (یاد خواں) لوگوں کے ذریعہ مختلف کھیات" (شہرت نامے) لکھی گئیں ان میں موہتا نینسی کی کھیات بہت مشہور ہے جو تاریخی ماخذ کے علاوہ ادبی اہمیت کی حامل بھی ہے، برائے تفصیل ملاحظہ ہو حوالہ سابق ص ۱۴۳ تا ۱۴۷ ماہی مراتب کی وضاحت میں مؤلف ماثر رقمطراز ہے کہ ایک دفعہ ایران کے بادشاہ نوشیرواں کا نبیرہ خسرو تخت سے دستبردار کر دیا گیا تھا، فوجی طاقت حاصل کر کے وہ دوبارہ تخت نشین ہوا اس دن ماہ برج حوت میں تھا جسے خسرو نے فال نیک سمجھکر ماہی اور چاند کے سے ہوئے نشان کو "ماہی مراتب" کے نام سے مشہور کیا۔ خسرو نے اس نشان کے نقرہ و طلا سے علم بنوا کر اپنے امراء کو اعزازی طور پر دیئے۔ بعد ازاں شاہان مغل نے بھی اسکی پیروی میں اپنے جاں نثار امراء کو ماہی مراتب سے نوازنے کی ابتدا کی۔ صاحب فرہنگ آصفیہ لکھتے ہیں کہ ماہی مراتب وہ اعزازی نشان کہلاتے تھے جو بادشاہوں کی سواری کے آگے آگے ہاتھیوں پر چلتے تھے۔ اصل میں یہ سات شکلیں باعتبار سیارات بہ تفصیل ذیل ہوا کرتی تھیں۔ ہیکل[1] آفتاب یعنی سورج کا نشان، نشان[2] پنجہ، نشان[3] میزان، اژدہا[4] یکو سوشاخ[5] کھی مچھلی[6] اور گولہ یعنی گرد" (دیکھو لفظ ماہی مراتب کے تحت)

سے نوازا گیا۔ لیکن پورن مل کو ۱۵۳۳ء میں بھیم دیو شکست دے کر آمیر کا وارث بن گیا اور ۱۵۳۷ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا رتن سنگھ تخت نشین ہوا جسے اس کے چھوٹے بھائی آسکرن نے زہر دے کر مروا دیا اور خود حکمراں بن بیٹھا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد بھارمل نے سرداروں کو اپنا طرفدار بنا کر آسکرن کو ذلت آمیز طریقہ سے گدی سے دست بردار کر دیا اور جون ۱۵۴۸ء (سمبت ۱۶۰۴) میں خود آمیر کا حکمراں بن گیا۔ آسکرن بادشاہ وقت اسلام شاہ سور (۱۵۴۵ء۔ ۱۵۵۳ء) کی خدمت میں بغرض داد خواہی حاضر ہوا لیکن بھارمل نے بھی گوپال ناتھاوت کو اپنا سفیر بنا کر اسلام شاہ سور کے دربار میں روانہ کر دیا۔ اسلام شاہ نے بجائے آمیر کے "نرور" کا ٹھکانہ آسکرن کو دے دیا جہاں ۱۶۹۶ء تک اس کی نسل جاگیر پر قابض رہی۔ پرتھوی راج کے انتقال (۱۵۲۷ء) اور بھارمل کی تخت نشینی (۱۵۴۷ء) تک آمیر میں اس بیس سالہ مدت کے دوران انتشار، خلفشار اور سازشوں کا دور دورہ رہا۔

۱۵۵۶ء میں اکبر کے تخت نشین ہونے کے بعد بھارمل نے دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے حاجی خاں پٹھان کے خلاف نارنول کے مغل حاکم مجنوں خاں قاقشال کی مدد کی جس کے صلہ میں اسے اکبر نے دربار میں بلوا کر خلعت فاخرہ، اسلحہ اور زیورات مرصع سے نوازا اور ۱۵۶۲ء میں اپنی راجکماری ہیرا کنور[1] کی شادی اکبر سے کرنے کے بعد وہ مغل سلطنت کا

---

[1] استاذ محترم آنجہانی ڈاکٹر متھرا لال شرما اس راجکماری کا نام "ہیرا کنور" بتلاتے ہیں (ہسٹری آف جے پور) لیکن ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما لکھتے ہیں کہ شاید راجکماری کا پہلے کا نام مان متی تھا جسے "شاہی بائی" بھی کہتے تھے جیسا کہ بیکانیر आभा लेखा गार کے ایک شجرہ سے معلوم ہوتا ہے (راجستھان کا اتہاس ص ۲۵۵ ح ۳ش) اکبر نے اسے مریم الزمانی کا خطاب عطا کیا۔ شہزادہ سلیم (بقیہ حاشیہ ص ۳۱ پر)

امیر الامراء اور پانچہزاری ذات و سوار کا منصبدار بنا دیا گیا۔ یہ شادی مغل راجپوت اتحاد میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بھارمل کی وفات ۱۵۷۴ء میں فتح پور سیکری یا آگرہ میں ہوئی[1]۔ لیکن کرشن دت باجپئی نے اپنی تصنیف "برج کا اتہاس" جلد دوم میں لکھا ہے کہ بھارمل نے اپنے آخری ایام متھرا میں بسر کیے جہاں وشرام گھاٹ پر جنوری ۱۵۷۴ء میں اس کا انتقال ہوا اور اس کی نعش کے ساتھ اس کی رانی بدنا دیوی بھی "ستی" ہوئی جس کی یادگار کے طور پر ۱۵۷۰ء میں جمنا کے کنارے راجہ بھگونت داس نے پچپن[5] فٹ اونچا "ستی برج" تعمیر کروایا۔ اس (بدنا دیوی) رانی کے بطن سے بھارمل کے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ پہلا بھگونت داس اور دوسرا بھگوان داس۔ نام کی اسی مماثلت کے سبب راجستھان کے مشہور مورخ ڈاکٹر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کو بھی تذبذب کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ مان سنگھ بھگونت داس کا دوسرا (چھوٹا) راجکمار تھا جسے آمیر کے راجہ "بھگوان داس" نے اپنا متبنیٰ بنایا تھا[2]۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر اوجھا کے غلجان میں مبتلا ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے اکثر عصری فارسی کتب تاریخ میں بھگونت داس کی بجائے

(بقیہ حاشیہ ص ۳۰) اسی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ عوام الناس میں بالعموم یہ جودھا بائی کے نام سے مشہور ہے۔ جبکہ جودھا بائی (جگت گوسائیں) جہانگیر کی ملکہ تھی جس سے ۱۵۸۶ء میں شادی ہوئی، یہ راجکماری جودھپور کے موٹا راجہ اودے سنگھ کی لڑکی تھی (دیکھیے ہسٹری آف جہانگیر از ڈاکٹر بینی پرساد ص ۲۵-۶ مطبوعہ ۱۹۴۰ء راجستھان کا اتہاس از گوپی ناتھ شرما ص ۱۰۰-۲۳۳، امرائے ہنود وغیرہ) دراصل سلیم کی اس بیگم کو جودھپور کی راجکماری ہونے کے سبب جودھا بائی بھی کہا جاتا تھا (شرما ص ۲۳۱) [1] بانکی داس ری کھیات (نروتم داس) نمبر ۱۴۲۷، ۱۲۱۰، ص ۱۲۴ [2] راجپوتانہ کا اتہاس ۲: ۸۰۶، نیز مقالہ کچھواہوں کے اتہاس میں ایک الجھن "مشمولہ مادھری بابت اساڑھ سمبت ۱۹۷۳/۱۹۱۶ء۔

"بھگوان داس ہی لکھا ہوا ملتا ہے[۱] مگر علامی ابوالفضل اکبر نامہ میں بھگونت داس ہی لکھتا ہے[۲]
اور بھارمل کے انتقال کے بعد یہی بھگونت داس ماگھ سدی ۲ سمبت ۱۶۳۰ معادل ۴ فروری
۱۵۷۳ء کو آمیر کا راجہ ہوا۔ منشی دیوی پرساد اپنی تصنیف "آمیر کے راجہ" میں رقمطراز ہیں کہ
بھگونت داس کے ٹیکے (وہ قشقہ جو کسی راجہ کی پیشانی پر اس کی تخت نشینی کے وقت
لگایا جاتا ہے جسے راج تلک بھی کہتے ہیں) کا دستور فتحپور سیکری میں خود شہنشاہ اکبر نے
کیا اور پانچ ہزاری منصب عطا کرتے ہوئے امیرالامراء کا درجہ بھی تفویض کیا گیا اور
اسی وقت بھگوان داس کو قصبہ لوان (ناہن) کی جاگیر بخشی۔ اس قصبہ کو جو جے پور و دوسہ
کے درمیان کوہستانی سلسلہ کے درمیان واقع ہے، بھارمل نے ہی میناؤں (मीणा)
اقتدار ختم کرکے از سر نو آباد کیا تھا۔

آمیر کے کلیان جی کے مندر کے دروازہ کے کتبہ[۳] کی عبارت نیز دیگر کتبات اور
راجگان آمیر (جے پور) کے شجرات (Pedigree) کی یافت سے یہ بات پایۂ ثبوت
کو پہونچ گئی ہے کہ بھگوان داس فی الحقیقت بھگونت داس کا چھوٹا بھائی تھا جسے لوان کی
جاگیر دی گئی تھی جس پر اس کی اولاد جو "بانکاوت" کہلاتی ہے، ایک عرصہ تک قابض و متصرف
رہی۔ آمیر کے کلیان جی کا مندر جو غالباً آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر یا نویں صدی عیسوی
کے اوائل میں تعمیر ہوا تھا، کی مرمت شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہوئی تھی اور اسی وقت

---

[۱] طبقات اکبری ایلیٹ وڈاؤسن ۵: ۳۴۳ نیز صفحات مابعد، منتخب (لوئی) ۲: ۱۴۴، و ۲۳۴،
فرشتہ (برگز) ۲: ۲۳۶ و مابعد اردو ترجمۂ فرشتہ از عبدالحئی خواجہ ایم۔اے ۱: ۶۹۶، ۷۰۰، ۷۲۱،
نیز ۷۲۴، مکتبہ ملت دیوبند [۲] اکبرنامہ (بیورج) ۲: ۱۳[۳] اس کتبہ کو راجستھان کے محکمۂ آثار قدیمہ
کے افسر آثاریات جناب وجے کمار صاحب نے تلاش کیا ہے۔

کتبہ لگایا گیا تھا جس کا رسم الخط دیوناگری اور زبان راجستھانی ہے جس میں "ش" (श) کی بجائے "س" (स) کا استعمال کیا گیا ہے مثلاً "پات ساہ" (پادشاہ) وغیرہ۔ اس کتبہ میں آمیر کے عصری حکمراں کی حیثیت سے راجہ بھگونت داس ہی کا ذکر ہے نہ کہ بھگوان داس کا، کتبہ کی عبارت درج ذیل ہے:

"संवत १६३१ वरषे मांगसीर बदीर पातीसह श्री अकबर राजी राजाधिराज श्री भगवन्त दास जी क राज प्रोहीत श्री कान्हा जी प्रसाद मडाये सूत्रधार जगमाल पेरासुत भगवती तीषताकतर।"

کوی بھوشن (زینت) اور مہاکوی سورییہ مل میشن (مشرن) نے بھی مان سنگھ کو بھگونت داس ہی کا بیٹا بیان کرتے ہوئے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ آمیر کی حکومت بھگونت داس کو ہی وراثتہً حاصل ہوئی تھی، جو اکبر کا برادر نسبتی تھا، وہ اپنی تصنیف بھوشن بھارتی میں[1] لکھتا ہے:-

अकबर पायो भगवंत के तनै सोमान, बहुरि जगत सिंह महामरदाने सों, भूषपल्था पायो जहांगीर मान सिंह जूसों, शाहि जहाँ पायो जयसिंह जग जाने सों। अब औरंगज़ेब पायो रामसिंह जूसों औरो दिन-दिन पै है, कूरम के माने सों, केते राजा राम मान पावैं पातसाहन सों, पावैं पातसाह मान, 'मान' का घराने सों॥

---

[1] ص ۲۵۱۔

سوریہ مل مشرن مان سنگھ کو بھگونت داس کا راجکمار بتلاتے ہوئے اکبر سے انکی رشتہ داری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

कुमार हुतो भगवंत के धरत मान अभि धान
अकबर सालके होय हैं, बालका ब्याह विधान।[1]

قلعہ جو رام گڈھ (جے پور) کے ایک کتبہ سے، جو جے پور میوزیم میں محفوظ ہے، اس امر کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ بھگونت داس اور بھگوان داس برادر اعیانی تھے اور بڑے ہونے کی حیثیت سے آمیر کی راج گدی بھگونت داس کو حاصل ہوئی تھی نہ کہ بھگوان داس کو۔ جو رام گڈھ کے قلعہ سے دستیاب کتبہ کی عبارت حسب ذیل ہے :۔

"स्वस्ति श्रीमन नृपति विक्रमादित्य राज्यातीत संवत १६६ सालिवाहन शाकातीत १५३४ फालुन शुकल पक्षे ५ रवि वासरे श्री मजहांगीर साहि राज्ये वर्तमाने श्री रघुवंश तिलक कछवाह कुलमण्डन श्री राजा पृथ्वी राज तत्पुत्र श्री राजा भारहमल्ल तत्पुत्र श्रीराजा भगवंत दास तत्पुत्र सकल नरेन्द्र चूड़ामीण प्रताप प्राभूत समस्त शत्रुगण समस्त पृथ्वी-विजय प्राप्त महायशोराशि विराजमान श्री महाराजाधिराज मान सिंह नरेन्द्र कारितं रामगढ़ प्रकाराख्यं दुर्ग कृपा-राक्षिप-शोभितं तत्र परम पवित्र श्रीपदमाकर

---

[1] ونش بھاسکر ۲: ۲۲۳۴۔

पुरोहित पुत्र श्री पुरोहित पीतांबरस्याधिकारे सिद्धं।
तत्र कार्य नियुक्तशीलिस्म॥ एतद्देशीय निजामश्च॥ अन्ये
च तन्मतानुसारीण:॥"

صاف ظاہر ہے کہ رام گڑھ کا قلعہ، باغ اور کنواں سمبت ۱۷۶۹ شاکا سمبت ۱۶۳۴ (۱۷۱۲ء) میں راجہ بھگونت داس کے بیٹے مہا راجہ دھراج مان سنگھ نے اپنے پروہت 'پدماکر' کے بیٹے "پیتامبر" کی نگرانی میں تعمیر کروایا۔[1] تاریخ جے پور کے ماہر آنجہانی پروہت ہری نارائن شرما ودیا بھوشن نے اپنے مقالہ "فرزند دولت مہاراجہ شری مرزا راجہ مان سنگھ جی اول" میں مان سنگھ کو بھگونت داس کا پہلا صحیح النسب (Legitimate child) راجکمار بتلایا ہے جس کی ولادت پوس بدی ۱۳ سمبت ۱۷۰۰ مطابق آلواڑ ۱۲ دسمبر سنہ ۱۶۵۵ء کو بھگونت داس کی پٹ رانی (پہلی مہارانی) بھاگوتی یا بھگوتی (भगवती) پنوار 'पंवार' کے بطن سے ہوئی، جو مالپورہ کے بچاپن' पिचा यण' پنوار کی لڑکی اور "رادھو" کی پوتی تھی۔ اس رانی کے مان سنگھ کے علاوہ مادھو سنگھ، سور سنگھ اور پرتاپ سنگھ یعنی چار لڑکے پیدا ہوئے پرتاپ سنگھ کے بارہ میں بہت کم معلومات فراہم ہوتی ہیں، وہ لاولد تھا اور شاید نوعمری ہی میں فوت ہو گیا۔ اس رانی کے علاوہ بھگونت داس کے بارہ دیگر رانیاں اور خواص (کنیزیں) بھی تھیں۔ مذکورہ چار راجکماروں کے علاوہ اس کے تین راجکمار اور دو راجکماریاں نیز ایک خواص سے بھی دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اس طرح بھگونت داس کے کل نو لڑکے اور دو لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں مان سنگھ

---

[1] آمیر کے نزدیک "بھگونت ساگر" نامی تالاب بھی بھگونت داس نے ہی تعمیر کروایا تھا جو اسی کے نام سے مشہور رہا۔

سب سے بڑا تھا۔ راجکماریوں میں سے ایک مان کنورؒ کی شادی اس وقت جب کہ بھگونت داس لاہور کا صوبیدار تھا، شہزادہ سلیم کے ساتھ کی گئی (۱۵۸۴ء) یہ سلیم کی پہلی بیگم تھی، جس کی وفات (۱۶۰۴ء) پر شاہزادہ سلیم نے چار روز تینس پہر تک کچھ نہیں کھایا پیا۔ شہزادی سلطان النساء بیگم (پیدائش ۱۵۸۶ء) اور شہزادہ خسرو (پ ۱۵۸۷ء) اسی کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ شہزادہ خسرو کی پیدائش پر مان کنور (مان بائی) کو شاہ بیگم کا خطاب دیا گیا[۱]۔

مذکورالصدر دلائل نیز منشی دیوی پرساد کی تصنیف "شہنشاہ مہاراجہ مان سنگھ والی آمیر کی سوانحعمری" مطبوعہ سمبت ۱۹۴۷ء بارہٹ رام ناتھ رتنو کی "اتہاس راجستھان" مطبوعہ سمبت ۱۹۴۹ء نوآن ٹھکانے کے دستاویزات اور پروہت ہری نارائن شرما کی تصنیف اس سلسلہ میں اہم تاریخی مواد فراہم کرتی ہیں۔ ان شواہد کی بنیاد پر کسی تشکیک و ارتیاب کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ بھگونت داس، مان سنگھ اول کا باپ اور بھگوان داس چچا تھا۔ جے پور راج گھرانے کے شجرات کے مطابق بھگوان داس کے تین لڑکے۔

---

[۱] حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو "ہسٹری آف جہانگیر" از ڈاکٹر بینی پرساد ص ۲۴، ۲۵، اس ضمن میں مورخ ہند حضرت علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ المتوفی ۱۳۳۲ھ / نومبر ۱۹۱۴ء کی معرکتہ الآرا نظم معنون "شمیم انگیزیاں عطر محبت کی" بھی قابل مطالعہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:

قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی ۔۔۔ کہ یہ رشتہ عروس کشور آرائی کا زیور تھا

اور آخری شعر:

تمھیں لے دیکے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا ۔۔۔ کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

زبان زد عوام و خواص ہے [۲] بینی پرساد ص ۲۵ مطبوعہ ۱۹۴۰ء تیسرا ایڈیشن۔

انکے رام، ہیرا رام اور رُوپ سنگھ تھے، جبکہ بھگونت داس کے آٹھ یا نو لڑکے۔ مان سنگھ،[1] سور سنگھ،[2] پرتاپ سنگھ، مادھو سنگھ،[3] بھیم، کانہا یا کان جی اور بلی رام یا نبالی داس وغیرہ تھے۔ بھگونت داس[4] کے انتقال ۹۹۸ھ / نومبر ۱۵۸۹ء کے بعد راجہ مان سنگھ والیٔ آمیر ہوا۔ بہرحال فارسی تاریخوں کے اس تسامح کو رفع کرنے کے لیے ان حضرات کو مزید پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے اس سے خاطر خواہ تاریخی مواد فراہم ہو سکتا ہے۔

---

[1] کچھواہہ بنساولی میں راول ہرناتھ سنگھ ڈونڈلود نے آٹھ اور موہتا نینسی نے اپنی کھیات میں نو اولاد ذکور کا ذکر کیا ہے [2] سور سنگھ کی خدمات کے لیے دیکھیے موہتا نینسی دی کھیات [3] مادھو سنگھ کے کارہائے نمایاں کے لیے ملاحظہ ہو "ہسٹری آف جے پور اسٹیٹ" از استاذ محترم ڈاکٹر متھرا لال شرما آنجہانی صدر شعبہ تاریخ دانشگاہ جے پور۔ لٹریری ہیری ٹیج آف دی رولرز آف آمیر اینڈ جے پور از پنڈت گوپال نارائن بوہرا نیز نینسی دی کھیات [4] بھگونت داس اور بھگوان داس کی اسمی مماثلت کی نتیجہ خیز بحث کے لیے ملاحظہ ہو "راجستھان کا اتہاس" ص ۹-۳۵۸، از ڈاکٹر گوپی ناتھ شرما سابق صدر، شعبۂ تاریخ یونیورسٹی جے پور

کیا شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے؟[1]

از

جناب رام لعل نابھوی صاحب

شیخ سعدی دنیا کے ان بڑے ادیبوں اور شاعروں میں ہیں جن کی شہرت اور مقبولیت ان کے زمانے سے لے کر آج تک قائم ہے۔ ان کی دو فارسی کی کتابیں گلستاں اور بوستاں تو گھر گھر ملتی ہیں۔ متعدد بار ایڈٹ ہو کر شایع ہوئی ہیں۔ بوستاں کا تو منظوم اردو ترجمہ گوبند پرشاد فضا لکھنوی نے کیا اور وہ نولکشور پریس میں چھپا۔ یہ دونوں کتابیں بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کے درس و مطالعہ میں شامل رہی ہیں۔

بوستان کے آٹھویں باب میں "حکایت سفر ہندوستان و ضلالت بت پرستان" کے عنوان سے ایک حکایت درج ہے جس پر کافی لکھا جا چکا ہے۔ لیکن معارف اعظم گڈھ کے جون ۱۹۸۹ء کے شمارہ میں پروفیسر نذیر احمد علی گڈھ نے لکھا ہے :۔

" × × × حال ہی میں دو مقالے و حکایت سفر سومنات سے متعلق امریکا کے دو رسالوں میں نظر سے گذرے۔ ایک انگریزی اور دوسرا فارسی میں، دونوں کے نقطۂ نظر میں بڑی حد تک توافق پایا جاتا ہے۔ فارسی والا مضمون ایران نامہ تابستان

---

[1] معارف: جناب رام لعل صاحب کا مضمون بہت پہلے ملا تھا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت اب آئی جس کے لیے شرمندگی ہے۔

۱۳۶۴ شمسی - ۱۹۸۵ء میں پروفیسر جلال متینی نے شایع کیا ہے وہ لکھتے ہیں
کہ اس حکایت پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا دراصل یہ ایک منظوم مقامہ ہے
جس میں داستان فرضی ہوتی ہے۔ اس کو شاعر خود گڑھتا ہے اور اس طرح وہ
واقعہ اس کی زندگی سے براہ راست کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ گویا سفر سومنات کی
داستان سعدی کی گڑھی ہوئی ہے، اس کو براہ راست ان کی زندگی پہ منطبق کرنا
درست نہیں x x"

یہ نظریہ پہلے سے چلا آرہا ہے اور کچھ مضامین میں اس نظریہ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش بھی ہوئی ہے، چنانچہ اس مضمون میں اس پر بحث کی گئی ہے کہ اس حکایت کو لکھنے کی شیخ سعدی کی غرض و غایت کیا تھی؟ اور یہ بھی کہ شیخ نے اگر اسے گڑھا ہوتا تو اس کی شکل داستان کی ہوتی نہ کہ اس میں غلط بیانیاں ہوتیں۔ اس حکایت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے پینٹنگ بھی بنی جو ایشیاٹک سوسایٹی کلکتہ کی کتاب مغل پینٹنگز Moghal Paintinugs. میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس پینٹنگ کی پلیٹ نمبر ۱۹ ہے۔

اس وقت میرے پیش نظر مندرجہ ذیل کتابیں اور مضامین ہیں جن میں اس مسئلہ پر بحث و گفتگو موجود ہے۔

۱۔ بوستاں مئی ۱۸۴۵ مطبع دارالسلام دارالخلافت شاہجہاں آباد صفحہ ۱۹۸، ۱۴۵ سال پرانی
۲۔ تاریخ فرشتہ اردو جلد اول دسمبر ۱۸۹۹ء نولکشور پریس صفحہ ۱۵۱، ۹۱ سال پرانی
۳۔ رسالہ صمصام ہند ۱۸۸۰ء مطبع سود درشن مرادآباد از منشی اندرمن صفحہ ۹۵-۹۶ ۱۱۰ سال پرانی
۴۔ بستان سعدی ۱۹۱۸ء رام پریس میرٹھ از منشی گوبند رام ۷۲ سال پرانی
۵۔ حیات سعدی ۱۸۸۸ء مجتبائی پریس لاہور از الطاف حسین حالی صفحہ ۱۲۲ ۱۰۲ سال پرانی

۶۔ حالات سعدی ۱۹۰۲ء پیسہ اخبار لاہور از منشی احمد حسین صفحہ ۱۵ ،۸۸ سال پرانی

۷۔ حیات سعدی ۱۹۲۳ء رنگین پریس دہلی مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۵۴ ، ۶۹ سال پرانی

۸۔ دانش رسالہ اسلام آباد شمارہ ۱۲ مضمون اختر راہی صفحہ ۱۱۱

۹۔ ہماری زبان نئی دہلی جون ۱۹۸۶ء مضمون رام لعل نابھوی

۱۰۔ معارف اعظم گڑھ جون ۱۹۸۹ء مضمون پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ صفحہ ۴۳۱/۴۳۲

۱۱۔ مغل پینٹنگز ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ پلیٹ

۱۲۔ تناظر نئی دہلی کالیداس گپتا نمبر صفحہ ۱۹۵

۱۳۔ بوستاں مترجم منظوم ۱۸۷۸ء نولکشور پریس گوبند پرشاد فضا لکھنوی ۱۱۲ سال پرانی

زیر بحث حکایت کا عنوان بوستان میں یوں درج ہے۔ "حکایت سفر ہندوستان و ضلالت بت پرستان"۔ خواجہ حالی نے اس کا خلاصہ یوں تحریر کیا ہے :۔

" جب میں سومنات میں پہنچا اور ہزاروں آدمیوں کو دیکھا کہ ایک بت کی پرستش کے لیے دور دور سے وہاں آتے ہیں اور اس سے مرادیں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاندار ایک بے جان چیز کی کس لیے پرستش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس مورت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں اور اس کے سامنے مورت کی سخت مذمت اور حقارت کی۔ برہمن نے مندر کے پجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے مجھ کو آن کر گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً ان کے سرگروہ سے کہا کہ میں نے کوئی بات بداعتقادی سے نہیں کی۔ میں خود اس مورت پر فریفتہ ہوں۔ لیکن چونکہ میں نووارد ہوں اور اسرار نہانی سے ناواقف ہوں اس لیے اس کی حقیقت دریافت

کرنی چاہتا ہوں۔ تاکہ سمجھ بوجھ کر اس کی پوجا کروں۔ اس نے یہ بات پسند کی
اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ۔ تجھ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائے گی۔
میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے
اور اس مورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب
جے جے پکارنے لگے۔ جب وہ لوگ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا کیوں
اب تو کچھ شبہ باقی نہیں رہا۔ میں ظاہرداری سے رونے لگا اور اپنے سوال پر
شرمندگی اور انفعال ظاہر کیا۔ سب براہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر
اس مورت کے سامنے لے گئے۔ میں نے مورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بہ ظاہر چند
روز کے لیے برہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا تو ایک روز رات کو
جب سب چلے گئے میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا اور مورت کے تخت کے پاس
جا کر غور سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ وہاں مجھے ایک پردہ نظر آیا۔ جس کے پیچھے
ایک پجاری چھپا ہوا بیٹھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک ڈور تھی۔ معلوم ہوا کہ جب
اس ڈور کو کھینچتا ہے فوراً اس مورت کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ اس کو عام لوگ انکا
کرشمہ سمجھتے ہیں۔ اس پجاری نے جب دیکھا کہ راز فاش ہو گیا۔ وہ کھسیانا سا ہو کر
وہاں سے بھاگا۔ میں بھی اس کے پیچھے دوڑا اور اس خوف سے کہ کہیں پکڑا کر مروا
نہ ڈالے اس کو پکڑ کر ایک کنوئیں میں گرا دیا۔ اس کے بعد میں فوراً وہاں سے
بھاگ نکلا اور ہندوستان ہوتا ہوا یمن کے رستے حجاز میں پہنچا۔"

یہ خلاصہ نہایت نامکمل ہے۔ خواجہ حالی نے شیخ سعدی کے ان اشعار کا خلاصہ
نہیں دیا جو محققین کی نظر میں سراسر غلط اور واقعات کے برخلاف ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو

اس پورے باب کا احاطہ کرتے ۔ ہر شعر پر بحث کرتے اور صحیح نتیجہ نکالتے ۔ وہ نتیجہ یہ نکالتے ہیں۔

"اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پجاری اور سیکڑوں بھجن گانے والے مرد اور عورت اور سیکڑوں جاتری شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اسکے سوا کوئی متنفس باقی نہ رہا اس کے سوائے ایسے سناٹے کے وقت جبکہ مندر میں کوئی متنفس موجود نہ تھا پردہ کے پیچھے ایک پجاری کا ڈور تھام کر بیٹھنا کس غرض سے تھا اور کیوں تھا۔

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید اصل واقعہ یعنی سومنات میں جانا اور مندر میں ہندو بن کر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کوئیں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو مگر اس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ کے تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھنچ سکی ۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن وقافیہ کی ضرورت سے کہیں کہیں اصل مدعا میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہہ کر اصل واقعہ سے دور جا پڑتا ہے .....

.... پس اگر اس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کو اس کی طرف التفات نہیں ہوتا ورنہ اہل غرض کو اس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔"

خواجہ حالی نے اگر حکایت کے اشعار کا احاطہ کیا ہوتا تو شاید وہ اس نتیجہ پر نہ پہنچتے انھوں نے تو اعتراض کا جواب دیا ہی نہیں اور نہ ہی تاریخ فرشتہ کے اس باب کا حوالہ

دیا جس کا عنوان ہے "ذکر سومنات کے توڑنے کا"۔ حقائق سے دانستہ چشم پوشی کی ہے اور اسی لیے قاضی عبدالودود (مرحوم) کو کہنا پڑا "اور حیات سعدی' کا حوالہ دے کر کہ اس میں بھی حالی نے سعدی کی کذب بیانی کو نظر انداز کیا ہے یہ" یہاں تاریخ فرشتہ سے "ذکر سومنات کے توڑنے کا" اقتباس دیا جاتا ہے:۔

" x x اور بت خانہ سومنات میں رات کو یا دن کو خسوف یعنی چاند گہن یا کسوف یعنی سورج گہن واقع ہوتا تھا۔ دو تین لاکھ سے زیادہ آدمی جمع ہوتے تھے اور دور دور تر ممالک سے نذریں اس جگہ لاتے تھے اور جمیع قریے جو حکام ہندوستان نے سومنات میں وقف کیے تھے قریب دو ہزار کے ہوتے تھے اور ہمیشہ دو ہزار برہمن سومنات کی پرستش کرتے تھے اور شب کو سومنات کو گنگا کے تازہ پانی سے غسل دیتے تھے۔ باوصف اس کے کہ سومنات اور نہر گنگ میں مسافت چھ سو کوس سے زیادہ ہوگی اور ایک زنجیر طلائے خاص دو سو من کا کہ گھڑیال خواہ گھنٹے اس کے اطراف میں بھی گوشہ کنیسہ سے تعبیر کی تھی اور ساعت معین پر اسے حرکت دیتے تھے تو اس کی صدا سے براہمہ کو عبادت کا وقت معلوم ہو دے اور پانسو گائیکیں ناچنے گانے والی اور تین سو مرد سازندہ اس بت خانہ میں ملازم رہتے تھے اور اسی طرح سے تین سو آدمی زائرین یعنی تیرتھ کرنے والوں کے موئے سر تراشی اور ریش تراشی کے واسطے معین تھے x x" ۔ ۱۲

اب اس حکایت کے چند ضروری اشعار نیچے درج کیے جاتے ہیں۔

بتے دیدم از عاج در سومنات	مرصع چو در جاہلیت منات
چناں صورتش بستہ تمثال گر	کہ صورت نہ بندد ازاں خوب تر

مغی را کہ با من سروکار بود | نکوگوی و ہم حجرہ و یار بود
مہیمن برہمن راستو دم بلند | کہ اے پیر تفسیر استا و ژند
شبی ہمچو روز قیامت دراز | مغاں گرد من بی وضو در نماز
کشیشاں ہرگز نیاز ردہ آب | بغل ہا چو مردار در آفتاب
بتنک رائکی بوسہ دادم بدست | کہ لعنت بر او باد و بر بت پرست
بتقلید کافر شدم روز چند | برہمن شدم در مقالات ژند
کہ ناچار چون درکشد ریسماں | برآرد صنم دست فریاد خواں
بتا زید و من در پیش تا ختم | نگونش بچاہی در انداختم

خواجہ حالی کی حیات سعدی ۱۸۸۸ء کی ہے۔ انھوں نے معترض کا نام وغیرہ نہیں لکھا ہے۔ لیکن "رسالہ صمصام ہند" جو سنہ ۱۸۸۰ء میں یعنی ۸ سال پہلے چھپا، اس میں غالباً سب سے پہلے اعتراضات کیے گئے ہیں۔ یہ رسالہ منشی اندرمن نے لکھا جو عربی فارسی۔ اردو اور سنسکرت کے بڑے عالم تھے۔ منشی اندرمن لکھتے ہیں :۔

"... پھر سعدی ازبس کاذب ہے کیونکہ باب ہشتم بوستان میں کہتا ہے کہ میں سومنات میں آیا اور وہاں ہاتھی دانت سے بنا ہوا ایک بت پایا کہ صبحدم ہاتھ اٹھاتا تھا اور اعجاز دکھلاتا تھا۔ پس میں نے مجاوران سومنات کے سامنے تلبیس و تدلیس سے اپنے تئیں براہمن قرار دیا اور بوقت قابو ان میں سے ایک کو ہلاک کرکے وہاں سے فرار کیا۔ فقط ذرا غور کرو کہ اسبات کی کچھ بھی اصل نہیں ہے کیونکہ زمانۂ سعدی میں سومنات کا وجود ہی نہیں تھا کہ عہد سعدی سے تخمیناً دو سو برس پیشتر محمود غزنوی نے سومنات تباہ کیا تھا نہ بت چھوڑا تھا۔

وہاں نہ بت خانہ بلکہ اب تک بھی وہ مکان ویران پڑا ہے۔ لیکن تھوڑی مدت گذرے کہ اہلیا بائی نے اس کے پاس ہی نیا مندر بنا دیا ہے جو لوگ کہ علم تواریخ سے بہرہ ور ہیں ان کی رائے پر کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ قطع نظر ازیں سومنات نام ہے ایک مندر عظیم الشان کا جس میں مہادیو کا جوت لنگ رکھا تھا فی الحقیقت وہ لنگ ہی باسم سومنات موسوم تھا جو کوئی ہندوؤں کی رسمیاں سے واقف ہے بخوبی جانتا ہے کہ مہادیو کے جتنے لنگ ہیں نہ ان کے ہاتھ ہوتے ہیں نہ پاؤں پس دروغ محض ہے کہ وہ بت صبحدم ہاتھ اٹھاتا تھا۔ قطع نظر ازیں ہندوؤں کے یہاں ہاتھی دانت سے مورت بنانا مروج نہیں ہے۔ درصورتیکہ سعدی اپنے دعویٰ میں سچا ہوتا تو ایسے اظہر من الشمس ملاقات میں خلاف واقعہ بیان نہ کرتا قطع نظر ازیں جو مسلمان کہ ایام طفولیت سے ہندوستان میں مقیم ہیں اور ہندوؤں کے اوضاع و حالات سے بخوبی علیم ہیں اگر قریباً اپنے کو ہندوانہ لباس میں ظاہر کریں تو ممکن نہیں ہے کہ ان کا فریب چل سکے۔ علی الخصوص سعدی کہ اہل ہند کے چال چلن سے کچھ بھی آگاہ نہیں تھا اور کبھی ہندوستان میں نہیں آیا تھا اپنے تئیں براہمن بنائے اور نہ پہچانا جائے۔ حاشا و کلا سعدی تو کس کھیت کی مولی ہے کہ ہندوؤں کو باغ سبز دکھلائے اور قتل سبزۂ بیگانہ از بیخ بر کندہ نہ کیا جائے اکثر ایرانی و عربی اگرچہ سالہائے دراز ہند میں بود و باش کرتے رہے۔ لیکن الفاظ ہندی زبان سے ہرگز صحیح نہیں بر آئے۔ پھر سعدی مجاوران سومنات کو پیر استاد ژند بتاتا ہے اور یہ سرود سے رود گاتا ہے۔ ابیات

مہین برہمن را ستودم بلند — کہ اے پیر تفسیر استاد ژند

بہ تقلید کافر شدم روز چند برہمن شدم در مقالات ژند

کون نہیں جانتا کہ استا و ژند زرتشتی مذاہب کی کتابیں ہیں۔ زبان پارسی میں'
انکو دین ہنود سے کچھ تعلق نہیں ہے کیونکہ ہندوؤں کی کتابیں زبان سنسکرت
میں ہیں۔ پس سعدی نے جو برہمنان سومنات کو پر تفسیر استا و ژند کہا ہے
سراسر جھوٹ لکھا ہے۔ پھر سعدی لاف زن ہے کہ میں نے بت کو بوسہ دیا اور
اس حیلہ سے مجاوران سومنات کو خوش کیا چنانچہ بتک را یکے بوسہ دادم بدست
یہ یک لخت خلاف واقعہ ہے کیونکہ ہندوؤں کے یہاں مورتوں کا لمس بھی مجاوروں
کے سوا ہر شخص کے لیے روا نہیں ہے۔ بوسہ دینے کا تو کیا ذکر ہی۔ پس قول سعدی
دروغ صریح و کذب فصیح ہے"۔

"بہتان سعدی" منشی گوبند رام ما بھوی کی تصنیف ہے۔ یہ بھی عربی۔ فارسی۔ اردو اور
سنسکرت کے عالم تھے وہ دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

" × × بہرحال اب یکتائے زمن و یش کل بھوشن جناب منشی اندرمن صاحب مرحوم
مرادآبادی نے اپنے "رسالہ صمصام ہند" میں مختصراً اس کا رد و قدح کیا۔ بعد کو
ابھی ازیں راقم نے قصہ کے شعر شعر کا رد لکھا ہے۔ جس میں بدلائل ساطع شیخ جی کا کذب
ظاہر کیا گیا ہے × × ×"۔

شیخ سعدی کا ایک شعر ہے۔

مغ را کہ با من سر و کار بود نکو گوی و ہم حجرہ و یار بود

منشی گوبند رام کا کہنا ہے کہ مغ آتش پرست زرتشست مذہب کا پیرو ہوتا ہے
ہندو اس کو لمس بھی نہیں کرتے پھر اس کا مندر میں کیا کام۔ ہم حجرہ و یار وہ ہو سکتا ہے جس سے

خورد و نوش میں پرہیز نہ ہو اور ہم زبان ہو۔ اس وقت کے ہندو مسلمان کے ساتھ ایک فرش پر بیٹھ کر پانی تک نہیں پیتے تھے پھر ہم حجرہ ہونا کیسا۔ منت کا حجرہ مندر کے اقرب ہوتا ہے۔ ایک اور شعر ہے۔

بہ نرمی بہ پرسیدم اے برہمن عجب دارم از کار ایں بقعہ من

منشی جی کا کہنا ہے یہ غلط ہے۔ نہ شیخ صاحب ہندی داں تھے۔ نہ برہمن فارسی خواں پھر گفت و شنید کیسی۔ × × تمام ہندوستان کے سفر سے یہی ایک قصہ قابل اندراج ملا اور عجائبات ہندوستان میں نہ تھے۔ یہ امر بھی حیرت انگیز ہے۔

منشی جی کے نزدیک :۔

شبے ہمچو روز قیامت دراز مغاں گرد من بے وضو در نماز

کنشیشان اور ہرگز نیاز روہ آب بغلہا چو مردار در آفتاب

ایسے اشعار ہیں جو جھوٹ سے لبریز ہیں ان کا کہنا ہے کہ تمام ہندو خصوصاً پجاری صبح ہی ضروریات سے فارغ ہو کر پہلے اشنان کرتے ہیں۔ روزمرہ غسل کرنے اور پاک صاف رہنے والوں کی بغلوں سے ہرگز بد بو نہیں آتی۔

منشی جی نے شیخ کے اس شعر

بہ تقلید کافر شدم روز چند برہمن شدم در مقالات ژند

پر بھی سخت اعتراض کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ ژند زرتشتیوں کی کتاب ہے۔ برہمن اسکے قائل نہیں۔ پس شیخ جی ایک تو پیدائش سے مسلمان دوسرے مقالات ژند کے زیر فرمان پھر برہمن کبھی نہیں ہو سکتے۔ منشی جی سعدی کے اس شعر

کہ ناچار چوں در کشد ریسماں برآرد صنم دست فریاد خواں

کے بارے میں لکھتے ہیں کہ پجاری رات کو کس کے دکھانے کے لیے رسی ہاتھ میں سے کب کھینچ رہا تھا۔ × × بھلا رسی سے بت ہاتھ تو اٹھا لیتا تھا فریاد خوانی کیونکر کرتا تھا گیا ہوگا۔
منشی گوبند رام نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ پورا واقعہ طوفان افتراہے۔

"حیات سعدی" میں مولانا شبلی نعمانی رقمطراز ہیں :۔

"ہندوستان کے سفر کا ایک واقعہ شیخ نے بوستاں میں لکھا ہے لیکن بیان واقعہ میں اس قدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ مشتبہ ہوجاتا ہے۔ . . . ان واقعات کے بیان میں عام غلطیاں تو یہ ہیں کہ بت کو ہاتھی دانت کا بتایا ہے۔ حالانکہ ہاتھی دانت کو ہندو پاک نہیں سمجھتے اس لیے اس کا بت نہیں بنا سکتے۔ برہمنوں کو لکھا ہے کہ وہ پاژند پڑھتے تھے۔

چو سگ با من از بہر آں استخواں   فتادند گبراں پاژند خواں

حالانکہ پاژند ہندوؤں کی کتاب نہیں پارسیوں کا صحیفہ ہے۔ برہمنوں کو کہیں گبر اور کہیں مطران کہتے ہیں۔
ع پس پردہ مطران آذر پرست۔ حالانکہ مطران عیسائیوں کے پادری کو کہتے ہیں۔ پھر مطران کو آذر پرست کہنا اور بھی لغویت ہے۔ ان جزئیات کے سوا اصلی واقعہ بھی نہایت دور از قیاس ہے۔ شیخ کتنی ہی بت پرستی کرتے لیکن یہ ناممکن تھا کہ ایک ایسے عظیم الشان بت خانہ میں تمام برہمن اور پجاری اکیلے ان کے ہاتھ میں بت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جاتے اور ان کو یہ موقع ملتا کہ چاروں طرف سے دروازے بند کرکے جو چاہتے کرتے۔ حقیقت یہ ہے کہ تازہ ولایت تھے۔ خدا جانے کس چیز کو کیا سمجھے اور کس واقعہ کو کیونکر لکھ گئے۔"

"حالات سعدی" میں منشی احمد حسین خاں لکھتے ہیں :۔

"میں کہتا ہوں اس روایت میں کوئی بات فوق العادت یا سوپر نیچرل نہیں ہے شیخ نے ظاہرداری سے وہاں اپنا رنگ ایسا جمایا کہ تمام پجاری اسے براہمن ہی سمجھتے رہے کیا عجب ہے کہ یہ فعل اس نے ایسے موقع پر کیا ہو جبکہ مندر میں کسی اتفاق سے کوئی موجود نہ تھا اور چاروں طرف سے مطلع صاف تھا۔ شیخ مرحوم نے یہ واقعہ نظم میں بیان کیا ہے اس کو پابندی نظم مدنظر تھی۔ اسے حسن بیان اور زینت الفاظ کا خیال تھا۔ پس اگر وہ قصہ کی تمام جزئیات کے بیان کرنے میں قاصر رہا تو اس میں کوئی اچنبا نہیں"[۳۵]

منشی احمد حسین نے واقعہ کی تہہ میں جا کر اور اعتراضات کی چھان بین کیے بغیر خواجہ حالی کے تجزیہ کو ہی دہرا دیا ہے جس کے بارے میں تفصیل سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔ سوال واقعہ نظم کرنے کا نہیں بلکہ یہ ہے کہ کیا واقعہ صحیح بھی ہے یا محض بہتان ہے۔

"دانش" اسلام آباد کے شمارہ ۱۳ میں ڈاکٹر اختر راہی اپنے مضمون برصغیر پاک و ہند میں مطالعۂ سعدی کے پیرا "کیا شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے؟" میں رقمطراز ہیں:-

" x x x حقیقت یہ ہے کہ یہ نظم شیخ سعدی کی کاوش طبع کا نتیجہ ہے مگر واقعہ سنا سنایا ہے جو اخلاقی نصائح پیش کرنے کے لیے صیغۂ متکلم میں نظم کر دیا گیا ہے یہ ضروری نہیں کہ جو کچھ ادب میں صیغۂ متکلم میں بیان کیا جائے وہ یقیناً آپ بیتی کا حصہ ہو۔ "بوستاں" اور "گلستاں" کی بعض دوسری حکایات اور شیخ سعدی کی ذاتی زندگی کے درمیان تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ ان حکایات کو آپ بیتی کے بجائے جگ بیتی کا حصہ خیال کیا جائے۔

بوستاں سے سومنات اور ہندوستان کے سفر کی موہوم اطلاع سے آگے

بڑھ کر دہلی میں شیخ سعدی کی آمد کی روایت بھی بیان کی گئی ہے اور مقصد سفر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ امیر خسرو سے ملنے آئے تھے۔ حیرت ہے کہ شیخ سعدی جیسا شاعر دہلی آئے اور معاصر مورخین اس کے بارے میں خاموش رہیں۔ حتیٰ کہ جس شخص کی کشش انہیں دہلی کھینچ لائے وہ دنیا بھر کی اطلاعات دینے کے باوجود اس ملاقات کے بارے میں کچھ نہ لکھے۔

مذکورہ بالا بحث سے واضح ہے کہ شیخ سعدی کی برصغیر آنے کی روایت مشتبہ ہے اور تاریخی طور پر پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

آخر میں ہم پروفیسر نذیر احمد علی گڑھ کی رائے دیتے ہیں :۔

" × × سفر کے بارے میں جو معلومات ہیں وہ بھی شبہ سے پاک نہیں۔ × × ان کی شہرت کا معاملہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر سعدی کی متذکرہ بالا حکایت مشتبہ ہو جاتی ہے۔

اسی طرح سعدی کے قیام سومنات کا معاملہ ہے۔ سعدی نے سفر سومنات کا ذکر بوستاں کی ایک طویل حکایت میں کیا ہے۔ اگرچہ اس واقعہ میں کوئی تاریخی قباحت نہیں البتہ واقعہ میں اسقدر غلطیاں ہیں کہ سرے سے اصل واقعہ ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ بت کو ہاتھی کے دانت کا بتایا ہے۔ ہاتھی کے دانت کے بت نہیں ہوتے۔ برہمنوں کو پاژند خواں بتایا ہے۔ پاژند اول کتاب کا نام نہیں۔ دوم اس کا تعلق زردشتیوں سے ہے۔ ژند کو براہمنوں کی طرف منسوب کیا ہے برہمن شدم در مقالات ژند۔ برہمن کو گبر اور مطران کہا ہے۔ گبر کا تعلق بھی زردشتوں سے ہے اور مطران کا عیسائیوں، برہمن مطران آذر پرست کہا گیا ہے۔

جو نہایت لغو ہے۔ برہمنوں کے لیے ایسی اصطلاحات بیان کی گئی ہیں جن میں سے

بعض کا تعلق زردشتیوں سے، بعض کا عیسائیوں سے اور بعض کا مسلمانوں سے

ہے ان کے علاوہ اصل واقعے میں بھی دور از قیاس باتیں ہیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے

کہ تمام برہمن اور پجاری سعدی کے ہاتھ میں بت خانہ چھوڑ کر باہر نکل جائیں اور

اس طرح ان کو موقع دیں کہ وہ چاروں طرف کے دروازے بند کر کے جو چاہیں

کریں۔"

پروفیسر جلال متینی کی رائے پر جس کا ذکر شروع میں ہوا ہے۔ پروفیسر صاحب

کا فرمانا ہے :-

" بہت ممکن ہے کہ متینی صاحب کی رائے ہمارے لیے قابل قبول نہ ہو۔ بہرحال

انھوں نے گلستان اور بوستان کی ان داستانوں میں مندرج واقعات کی

توجیہ کی ہے جو بادی النظر میں تاریخی لحاظ سے غلط معلوم ہوتے ہیں۔"[۱۴]

شیخ سعدی کی غرض و غایت اس واقعہ کو بتانے سے بت پرستوں کی

ضلالت بتانا ہے۔ اسطرح ہندوؤں خصوصاً برہمنوں کی مذمت بھی انھوں نے کردی ہے

جو غلط ہے، یہ واقعہ داستان نہیں، اس میں تبلیغ کا شائبہ ہے۔

داستان یا قصہ میں داستان کا رنگ ہوتا ہے۔ کسی مورخ نے آج تک یہ نہیں کہا کہ

شیخ سعدی ہندوستان آئے تھے۔ ناقدوں نے اس قصے کی جزئیات کو غلط بتایا

ہے اور واقعہ کو لغو سراسر بہتان۔ ان ہی کتابوں میں شیخ سعدی کی غلط بیانیوں کا

ذکر اور بھی ہوا ہے۔ چونکہ بوستان کے اس واقعہ کو آج بھی صحیح بتانے کی کوشش

ہو رہی ہے۔ اس لیے ہمیں ضرورت پڑی کہ مختلف کتب۔ مضامین۔ پنٹنگ سے

اور اس معاملہ کی گہرائی میں جانچ کر کے حقائق پیش کریں۔ تاریخ فرشتہ۔ ٹیپو سلطان کی کتابیں۔ امیر خسرو کی کچھ تحریریں بھی نفرت اور حقارت کا مظہر ہیں۔

حوالجات

۱؎ حیات سعدی از خواجہ الطاف حسین حالی۔ صفحہ ۳۷/۳۹

۲؎ ایضاً صفحہ ۳۹

۳؎ تناظر کالیداس گپتا نمبر۔ دہلی ۱۹۸۴۔۱۹۸۵ صفحہ ۱۹۵

۴؎ ترجمہ تاریخ فرشتہ اردو جلد اول نولکشور صفحہ ۵۱

۵؎ رسالہ صمصام ہند صفحہ ۹۵/۹۶

۶؎ بستان سعدی از منشی گوبند رام —

۷؎ حیات سعدی از مولانا شبلی نعمانی صفحہ ۸/۹

۸؎ حالات سعدی از منشی احمد حسین خاں صفحہ ۵۱

۹؎ دانش اسلام آباد شمارہ ۱۷ صفحہ ۱۱۱

۱۰؎ معارف اعظم گڈھ جون ۱۹۸۹ء صفحہ ۴۳۱/۴۳۳

بہرائچ کے بعض صوفیہ کرامؒ

جناب معین احمد علوی

۱۔ شیخ فیروز ترک بخاریؒ

ان کا مزار بہرائچ عیدگاہ کے شمال میں دریائے سرجو کے کنارے بلندی پر واقع ہے۔ یہ نہایت پُر فضا اور پُر سکون جگہ ہے جہاں اللہ کی یاد میں جی خوب لگتا ہے عرف عام میں یہ جگہ "فیروز شہید" کے نام سے مشہور ہے شیخ فیروز مولانا عبدالحق محدث دہلوی کے اجداد میں ہیں۔ مولانا نے اپنی مشہور کتاب اخبار الاخیار کے ضمیمہ میں انکا مفصل حال قلم بند کیا ہے۔ اردو میں خلیق نظامی صاحب نے "حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی" میں اس کی مزید تفصیل تحریر کی ہے۔ شجرۂ نسب یہ ہے۔

آغا محمد ترک بخاری۔ (زمانۂ علاؤالدین خلجی)

|

ملک معزالدین

|

ملک موسیٰ

|
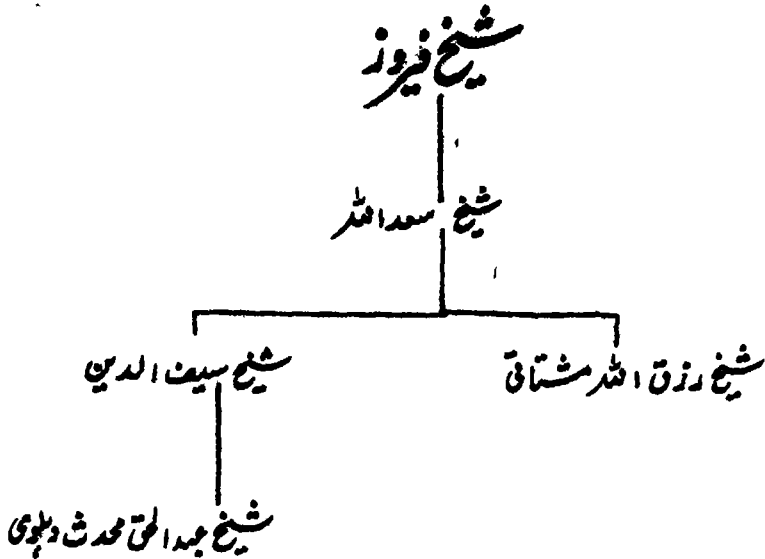
اس طرح شیخ فیروز شیخ محدث علیہ الرحمہ کے پردادا تھے۔ جن کے لیے شیخ نے "جد حقیقی ما" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس خانوادہ کے آغا محمد ترک بخاری ترکوں کی ایک بڑی جماعت کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ شاہ عبد الحق صاحب اخبار الاخیار میں لکھتے ہیں:۔

"ترکوں کی ایک بڑی جماعت بھی جو ان سے سلسلۂ قرابت رکھتی تھی اپنے اصلی وطن سے منتقل ہو کر ان کی خدمت میں یہاں آ گئی"

یہ سلطان علاؤ الدین خلجی (۱۲۹۶ء۔ ۱۳۱۶ء) کا زمانہ تھا جو مسلمانان ہند کے سیاسی و ثقافتی عروج کا دور تھا۔ سلطان نے آغا محمد ترک کی دستگیری کی اور انکو اعلیٰ مدارج سے نوازا۔ ۶۹۸ھ مطابق ۱۲۹۸ء میں جب خلجیوں نے گجرات پر حملہ کیا (خزائن الفتوح امیر خسرو ص۴) تو سلطان نے ان کو گجرات اور اس کے بندرگاہوں کی فتح کے لیے سپہ سالار الغ خان اور نصرت خان کے ساتھ کر دیا۔ شیخ محدث لکھتے ہیں:۔

"وہ بڑے امرا کی ایک جماعت کے ساتھ ملک گجرات اور اس کے بندرگاہوں کی فتح پر مامور ہوئے اور اس مہم کی انجام دہی میں شاہی حکم سے وہیں مقیم ہو گئے"

(اخبار الاخیار صفحہ ۱۴۲)

آغا محمد ترک نے گجرات کی فتح کے بعد وہیں سکونت اختیار کر لی۔ اللہ نے انکو
بیر اولاد دی تھی۔ ایک سو ایک بیٹے تھے۔ جن کے ساتھ وہ نہایت شان و شوکت
رت و وقار، سکون اور اطمینان کے ساتھ دن گزارتے تھے لیکن ایک ہولناک حادثہ
یں تمام لڑکے انتقال کر گئے۔ صرف سب سے بڑے فرزند معزالدین باقی بچے۔
س کے بعد دنیا کی طرف سے ان کا دل اچاٹ ہو گیا اور سب کچھ خیرباد کہہ کر دہلی
چلے آئے اور شیخ صلاح الدین سہروردی کی خانقاہ میں بیٹھ گئے۔ وہ شیخ صدر الدین
سہروردی کے مرید اور خلیفہ اور شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے معاصر اور
ہمسایہ تھے۔

اخبار الاخیار سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین تغلق (۱۳۲۰ء-۱۳۲۵)
کے عہد تک گجرات رہے اور ۱۷ ربیع الآخر ۷۲۹ھ مطابق ۱۳۲۸ء یعنی سلطان محمد تغلق
کے زمانہ میں آغا محمد ترک نے دہلی میں وفات پائی اور عیدگاہ شمسی کے عقب میں دفن ہوئے۔

ملک معزالدین سے خاندانی سلسلہ جاری ہوا۔ خدائے تعالیٰ نے ان کو بڑی
صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں شیخ محدث لکھتے ہیں :۔

"حق تعالیٰ نے ملک معزالدین کو یہ مرتبہ دیا تھا کہ گویا سو انسانوں کی استعداد
اور فیضان ان کو تنہا عطا فرما دیا۔"

ملک معزالدین نے خاندان کے ماتم ماحول کو ختم کر کے دہلی میں سکونت اختیار

کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند ملک موسیٰ نے بڑی عزت اور شہرت حاصل کی۔

فیروز تغلق (المتوفی ۱۳۸۸ء) کے بعد دہلی کے سیاسی حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہوگئے کہ علما و مشائخ اسے چھوڑ کر گجرات، جونپور، بنگال اور دوسرے علاقوں کی طرف متوجہ ہو جانے کے لیے مجبور ہوگئے۔ ملک موسیٰ بھی بددل ہوکر ماوراالنہر چلے گئے۔ (اخبار الاخیار، ص ۲۹۰)

لیکن وہاں زیادہ عرصہ تک رہنا نصیب نہ ہوا۔ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا (۱۳۹۸ء) تو ملک موسیٰ اس کی فوج کے ہمراہ پھر ہندوستان آگئے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے:

"صاحب قران امیر تیمور گورگان کے ساتھ دہلی آئے اور اپنے بزرگوں کے سلسلہ کا احیاء کیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔"

ملک موسیٰ کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں شیخ فیروز امتیازی شان رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے خاندان کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ وہ علم، سپہ گری، شعر و شاعری، سخاوت و لطافت سب میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے۔ شیخ محدث انکی بابت لکھتے ہیں:۔

"وہ ظاہری باطنی اور وہبی و کسبی فضائل کے جامع تھے، سپاہ گری میں اپنے زمانہ میں بے مثل تھے اور فن جنگ میں بے نظیر سلیقہ رکھتے تھے۔ علم شعر، شجاعت و سخاوت خوش طبعی بذلہ سنجی، عشق و محبت اور دیگر خوبیوں میں ان کا جواب نہ تھا اور دولت و حشمت، جاہ و مرتبہ عزت و عظمت میں بے عدیل تھے۔ شاعری اور خوش طبعی کی بنا ہمارے خاندان میں ان ہی سے پڑی (اخبار الاخیار، ص ۲۹۰)

انھوں نے سلطان بہلول لودی اور سلطان حسین شرقی کی جنگ کا پورا واقعہ نقل کیا اس سے دو شعر شیخ محدث نے نقل کیے ہیں۔ حسین شرقی بہلول لودی کو مخاطب کرکے کہتا ہے ؎

ایا قابض شہر دہلی شنو — حیاتت چہ خواہی از یں جا برو
منم قابض ملک مارا ست ملک — خدا داد ما را خدا داست ملک

شیخ فیروز ۸۶۱ھ میں بہرائچ کے کسی معرکے میں شہید ہوئے اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ لڑائی پر جانے سے قبل انکی بیوی نے جو ان دنوں حاملہ تھیں ان کو روکنے کی کوشش کی تو جواب دیا۔

"میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ بیٹا ہو اور اس سے نسل چلے اس کو اور تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں نہ معلوم اب مجھے کیا پیش آئے" (حیات شیخ محدث ص۵۶)

کچھ دنوں کے بعد شیخ سعد اللہ پیدا ہوئے جو شیخ محدث کے دادا تھے۔ وہ بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور ان میں اپنے شہید باپ کے سب اوصاف پائے جاتے تھے۔

شیخ فیروز کے مزار پر عموماً جمعرات کے دن خاص رونق رہتی ہے۔ عیدین کے موقعوں پر تمام پڑھی لکھی آبادی عقیدت سے حاضری ضرور دیتی ہے۔ مزار پرانا اور ایک اونچے چبوترے پر ہے۔ درختوں کی گھنی چھاؤں، دریا کا کنارہ، پُر فضا بلندی اور سکوت عبادت کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ حضرت شاہ بڈھن بہرائچی

شاہ بڈھن بہرائچی | حضرت سید بڈھن بہرائچی اپنے زمانہ کے مشہور مشائخ اور حضرت قاضی سید عبد الملک المعروف شاہ اجمل کے اجل خلفا میں تھے۔ سلسلہ چشتیہ سہروردیہ

کی۔ ان کے بعد ان کے فرزند ملک موسیٰ نے بڑی عزت اور شہرت حاصل کی۔

فیروز تغلق (المتوفی ۱۳۸۸ء) کے بعد دہلی کے سیاسی حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہوگئے کہ علماء و مشائخ اسے چھوڑ کر گجرات، جونپور، بنگال اور دوسرے علاقوں کی طرف متوجہ ہوجانے کے لیے مجبور ہوگئے۔ ملک موسیٰ بھی بددل ہوکر ماوراء النہر چلے گئے۔ (اخبار الاخیار، ص ۲۹)

لیکن وہاں زیادہ عرصہ تک رہنا نصیب نہ ہوا۔ جب تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا (۱۳۹۸ء) تو ملک موسیٰ اس کی فوج کے ہمراہ پھر ہندوستان آگئے۔ شیخ محدث نے لکھا ہے:

"صاحب قران امیر تیمور گورگان کے ساتھ دہلی آئے اور اپنے بزرگوں کے سلسلہ کا احیا کیا اور یہاں مستقل سکونت اختیار کی۔"

ملک موسیٰ کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں شیخ فیروز امتیازی شان رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے خاندان کی شہرت اور عظمت کو چار چاند لگا دیے۔ وہ علم سپہ گری۔ شعر و شاعری۔ سخاوت و لطافت سب میں یکتائے زمانہ سمجھے جاتے تھے شیخ محدث ان کی بابت لکھتے ہیں:۔

"وہ ظاہری باطنی اور وہبی و کسبی فضائل کے جامع تھے، سپاہ گری میں اپنے زمانہ میں بے مثل تھے اور فن جنگ میں بے نظیر سلیقہ رکھتے تھے۔ علم شعر، شجاعت و سخاوت خوش طبعی بذلہ سنجی، عشق و محبت اور دیگر خوبیوں میں ان کا جواب نہ تھا اور دولت وحشمت، جاہ و مرتبہ عزت و عظمت میں بے عدیل تھے۔ شاعری اور خوش طبعی کی بنا پر سے خاندان میں ان ہی سے بڑھی (اخبار الاخیار ص ۲۹)

انھوں نے سلطان بہلول لودی اور سلطان حسین شرقی کی جنگ کا پورا واقعہ نظم کیا تھا اس کے دو شعر شیخ محدث نے نقل کیے ہیں۔ حسین شرقی بہلول لودی کو مخاطب کرکے کہتا ہے ؎

ایا قابضِ شہرِ دہلی شنو　　حیاتت چو خواہی ازیں جا برو

منم قابضِ ملکِ ما راست ملک　　خدا داد ما را خدا راست ملک

شیخ فیروز ۸۶۱ھ میں بہرائچ کے کسی معرکے میں شہید ہوئے اور وہیں سپرد خاک کیے گئے۔ لڑائی پر جانے سے قبل انکی بیوی نے جو ان دنوں حاملہ تھیں ان کو روکنے کی کوشش کی تو جواب دیا۔

"میں نے خدا سے دعا کی ہے کہ بیٹا ہو اور اس سے نسل چلے اس کو اور تم کو خدا کے سپرد کرتا ہوں نہ معلوم اب مجھے کیا پیش آئے" (حیات شیخ محدث ص۵۶)

کچھ دنوں کے بعد شیخ سعد اللہ پیدا ہوئے جو شیخ محدث کے دادا تھے۔ وہ بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے اور ان میں اپنے شہید باپ کے سب اوصاف پائے جاتے تھے۔

شیخ فیروز کے مزار پر عموماً جمعرات کے دن خاص رونق رہتی ہے۔ عیدین کے موقعوں پر تمام پڑھی لکھی آبادی عقیدت سے حاضری ضرور دیتی ہے۔ مزار پُر انوار ایک اونچے چبوترے پر ہے۔ درختوں کی گھنی چھاؤں، دریا کا کنارہ، پُر فضا بلندی اور سکوت عبادت کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ حضرت شاہ بڈھن بہرائچی

شاہ بڈھن بہرائچی

حضرت سید بڈھن بہرائچی اپنے زمانہ کے مشہور مشائخ اور حضرت قاضی سید عبدالملک المعروف شاہ اجمل کے اجل خلفا میں تھے۔ سلسلۂ چشتیہ سہروردیہ

مداریہ ۔ قادریہ تمام سلسلوں میں اجازت و خلافت انھیں سے پائی۔

حضرت شیخ عبدالمقتدر بن رکن الدین شریحی کے واحد شاگرد ۔ مخدوم شیخ حسام الدین فتح پوری سے تعلیم حاصل کی اور اول انھیں سے سلسلۂ چشتیہ کی اجازت پائی۔ خزینۃ الاصفیا میں ہے کہ "از اکمل خلفائے ولیست" (ان کے بڑے کامل خلفا میں تھے)

سلسلۂ نسب سادات حسینی سے ملتا ہے۔ ان کے بزرگ ساتویں ہجری میں کاشغر سے وارد ہوکر بہرائچ میں متوطن ہوئے یہ اور شاہ اجمل بہرائچی ایک ہی خاندان سے تھے۔ قاضی جلال الدین چندن کے بھائی قاضی دانیال کے یہاں رشتہ قائم ہونے کیوجہ سے انھوں نے بہرائچ میں توطن اختیار کیا۔

تاریخ آئینہ اودھ کے مصنف مولانا ابوالحسن مانکپوری ۱۸۷۵ء کے قریب بہرائچ آئے تھے اور تحقیقات کی تھی وہ لکھتے ہیں :۔

" مولانا سید المخدوم بڈھن کی طہارت نسب میں کوئی شک نہیں مگر علی الاتصال شجرۂ نسب پدری مولف کو نہ ملا۔ اسی باعث لکھنے سے معذوری ہے۔ بالفعل انکی اولاد میں سید ابوالحسن صاحب نواسۂ شاہ نعیم اللہؒ و خلف الرشید مولانا شاہ بشارت اللہ صاحب باقی ہیں اور علاتی بھائی حافظ محمد اسماعیل و محمد خلیل و محمد موسیٰ ہیں۔

کچھ دیہات ان کے خاندان میں باقی تھے۔ عملداری عہد انگلشیہ میں اثر قانونی سے ایک تعلقدار کے قبضہ میں جاتے رہے اب محض توکل پر بسر اوقات ہے۔ موجودہ تحصیل بہرائچ انھی کی زمین پر تعمیر ہوا۔ اس کے علاوہ موضع نکاہی پرگنہ فخرپور تحصیل قیصرگنج بھی ان کی معافی میں تھا۔ موجودہ مزار کے چاروں طرف کی زمین با اثر لوگوں نے قبضہ کرلی۔"

مکان محلہ بڑی ہاٹ میں اس جگہ واقع تھا جہاں اب معز الدین صاحب کے لڑکے رہتے ہیں۔ یعنی املی کے نیچے اکھاڑے کے جنوب میں، مزید حالات معلوم نہ ہوسکے۔

مولانا شاہ محمد اسلم صاحب جانشین خانقاہ نعیمیہ نے خود راقم سے بیان کیا کہ میرے نانا مولانا شاہ ابو محمد صاحب نواسہ شاہ نعیم اللہؒ متوفی ۱۲۳۴ھ کی ایک تحریر ہمارے خاندانی کاغذات میں محفوظ ہے جس سے معلوم ہوا کہ بہرائچ کی آبادی پہلے پھوس کے چھپروں سے گاؤں کے انداز پر آباد تھی۔ پختہ مکانوں میں صرف ہمارا ہی پہلا مکان تھا جو مولسری والی مسجد سے ملحق اب بھی موجود ہے۔ اس کی تاریخ تعمیر این است محل برکت یعنی زمانۂ شہنشاہ جہانگیر ہے۔ زمانۂ قدیم میں پھونس کے مکانات ہونے کی وجہ سے بہرائچ میں دو بار بھیانک آگ لگی۔ جس میں لوگوں کا اثاثہ ضایع ہوگیا۔ اسی آگ میں شاہ بڈھن کے گھر کا اثاثہ قیمتی نوادرات اور نسخ سب ضایع ہوگئے، اسی وجہ سے کچھ تفصیل نہیں ملتی۔ خزینۃ الاصفیا جلد اول (ص ۳۰۴) پر معارج الولایت کے حوالہ سے منقول ہے کہ ایام خوردسالی سے حضرت مخدوم حسام الدین فتحپوری قدس سرہٗ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی اور کمال ظاہری اور باطنی کو پہونچے اور خود حضرت مخدوم کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"از اولیائے نامدار و مشائخ	بڑے نامی گرامی اولیا میں تھے۔ بڑا
با وقار است و خلقِ کثیر بتوجہ	با وقار تھا۔ بڑی آبادی کو اپنی توجہ سے
موجہ خویش بخدا رسانید۔	خدا تک پہونچا دیا۔

شیخ بڈھن کے والدان کو چھ برس کی عمر میں حضرت مخدوم شیخ حسام الدین فتحپوری کی خدمت میں لے گئے اور عرض کی۔

چندان پسرانم قبل ازین بعالم طفولیت
ضایع شدہ اند۔ حالا می خواہم کہ این
پسر بدعائے شما از عمر طبعی برخوردار
باشد۔ فرمود کہ انشاء اللہ تعالےٰ
پیر کبیر خواہد شد۔ باز عرض کرد کہ
قدرے علم ہم نصیب این برخوردار
گردد بہتر است۔ فرمود کہ عالم متبحر
گردد۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔ باز بعرض
پرداخت کہ علم بے معرفت قدرے
ندارد۔ فرمود کہ بعنایت ربانی ہم عارف
وہم عمر دراز خواہد شد۔ پس حسب
فرمودہ شیخ بوقوع آمد کہ شیخ بڈھن
بہمہ اوصاف موصوف بود

اس سے پہلے میرے چند لڑکے بچپن ہی میں
فوت ہو گئے اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کی دعا
سے یہ اپنی طبعی عمر کو پہونچ کر پھلے پھولے۔
فرمایا کہ انشاء اللہ پیر کبیر ہوگا میں نے
عرض کیا کہ اچھا ہو کچھ لکھ پڑھ جائے
فرمایا کہ بڑا عالم ہوگا۔ انشاء اللہ۔
پھر عرض کیا کہ علم بے معرفت
کسی کام کا نہیں۔ فرمایا خدا نے
چاہا یہ عارف ہوگا اور بڑی عمر
پائے گا۔ پس جیسا کہ شیخ نے
فرمایا۔ ویسا ہی ہوا اور شیخ
بڈھن ان تمام کمالات سے
متصف ہوئے۔

مخدوم شیخ بڈھن نے ۸ شوال سنہ ۸۸۰ھ کو وفات پائی۔ مزار پر انوار بہرائچ میں زیارت گاہ خلائق ہے۔ ریلوے اسٹیشن جانے والی سڑک کے پورب جانب پڑتا ہے پہلے ایک بڑا املی کا درخت چبوترہ پر سایہ فگن تھا سنہ ۱۹۶۰ء کے قریب منتظمین نے املی کا درخت کٹوا کر نئے سرے سے چبوترہ کی مرمت کرا کے مزار پر چھت قائم کر دی۔

مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین جلد دوم صفحہ ۱۱۱ میں ذیل کا قطعہ تاریخ وفات دیا ہے۔

مقتدائے طریقت ز احسن　　شیخ اہل جہاں شہ بڈھن

رفت زیں جہان خضر وصال   ہشتمیں بود از مہ شوال

سال ترحیل آن خرد فرمود   صاحب کشف شاہ بڈھن بود

وفیات الاخیار میں آپ کی تاریخ وصال غلط ہے۔ اس کتاب میں عموماً تاریخیں غلط ہیں۔ مولانا محمد اسلم صاحب نے فرمایا کہ ہمارے خاندان میں ثقہ بزرگوں کے ذریعہ جو دو روایات سینہ بسینہ متواتر چلی آرہی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت مخدوم بڈھن رمضان شریف میں پیدا ہوئے۔ دن میں کبھی آپ دودھ نہیں پیتے تھے۔ دوسرے ان کے سر کے بال بوقت پیدائش سفید تھے۔ صاحب نزہتہ الخواطر کا بیان ہے کہ "سلسلۂ مداریہ وسہروردیہ اور دوسرے طریقوں میں حضرت شیخ اجمل بن احمد حسینی بہرائچی ثم جونپوری سے اجازت پائی اور حضرت محمد بن القاسم سے بھی فیض حاصل کیا۔" (جلد سوم ص۳۵)

۲۔ قاضی سید عبدالملک مشہور بشاہ اجمل بہرائچی

یہ علوم شریعت وطریقت کے جامع، ورع وتقویٰ میں بلند پایہ اور اپنے زمانہ کے نامور مشائخ میں تھے۔ سلسلۂ عالیہ چشتیہ، قادریہ وسہروردیہ میں حضرت جلال الدین بخاری مشہور بہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے مرید وخلیفہ تھے۔ خرقۂ خلافت حضرت قاضی شیخ قوام الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے پایا تھا جو حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے مرید وخلیفہ تھے اور ان کی وفات کے بعد حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی خدمت میں حاضر ہوکر مرتبہ تکمیل اور درجۂ خلافت حاصل کیا۔ (مسالک السالکین)

سلطان ابراہیم شرقی بادشاہ جونپور کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ اس نے اپنی سلطنت میں ان کو صدر جہان کے عہدہ پر ممتاز کیا تھا۔ ان کے لیے دریا کے

کنارے نہایت خوبصورت مسجد بنوائی تھی جو آج بھی جھجری مسجد کے نام سے مشہور ہے سلطان کا ایک شاہزادہ اور خود سلطان بھی ان کی خانقاہ کے قریب دفن ہیں (تجلی نور جلد اول ص۴) ایک مرتبہ سلطان ان کو اپنے ساتھ بنگالہ کی مہم پر بھی لے گیا تھا۔ (معارف مئی ۱۹۳۳ء مضمون ملا محمود جونپوری) تلاش و تفحص کے باوجود ابتدائی حالات نہیں معلوم ہو سکے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب اخبار الاخیار (ص۱۶۳) میں لکھتے ہیں کہ:-

سیدے بود اورا شیخ اجمل می گفتند از اکابر وقت بود

ایک سید تھے جن کو شیخ اجمل کہتے ہیں اپنے وقت کے بزرگوں میں شمار ہوتے تھے۔

ایک بار قاضی شہاب الدین دولت آبادی وزیر سلطنت جونپور اور قاضی صدر جہاں سید اجمل بہرائچی سے کسی امیر کی محفل میں آگے پیچھے بیٹھنے پر کچھ چشمک اور گفتگو ہوگئی۔ قاضی شہاب الدین علم میں ان سے زیادہ متبحر تھے۔ ان کے دل میں وزارت عظمیٰ کے ساتھ علم کے وقار کا سوال بھی پیدا ہوا۔ شاہ اجمل سے یہ کہہ کر کہ آپ کا علم مشکوک اور مشتبہ ہے اس لیے مجھ کو آگے بیٹھنا چاہیے۔ بیٹھنے میں سبقت لے گئے تھے اور سید صاحب بوجہ آل رسول ہونے کے اپنی افضلیت چاہتے تھے۔ غرضکہ یہ بحث چل پڑی اور قاضی شہاب الدین دولت آبادی نے ایک رسالہ علم کی افضلیت پر لکھ ڈالا لیکن جب قاضی صاحب کے استاد کو اس بحث اور رسالہ کی اطلاع ہوئی تو ان کو یہ جسارت پسند نہ آئی اور ان کی طرف سے مزاج میں برگشتگی پیدا ہوگئی۔

اخبار الاخیار ص۱۶۳ میں ہے کہ:-

استاد قاضی شہاب الدین را ایں

قاضی شہاب الدین کے استاد کو یہ (جرأت)

از وے ناخوش آمد و مزاج از وے منحرف گشت — پسند نہ آئی اور انکی طرف سے مزاج میں برگشتگی پیدا ہو گئی۔

قاضی شہاب الدین کو جب استاد کی خفگی کا علم ہوا تو انھوں نے استاد کی خفگی کو دور کرنے کے لیے

کتابے کہ تصنیف کردہ بود در دریا	قاضی صاحب نے اپنی تصنیف کردہ کتاب کو
انداخت بجائے آن در مناقب سادات	دریا میں ڈبو کر سادات کی افضلیت و تقدس
رسالہ تالیف کردہ (خزینۃ الاصفیا ج۱ ص۳۹۰)	میں رسالہ تصنیف کیا۔

اور سابقہ خیال سے رجوع کر کے استاد کی خدمت میں عذر و معذرت پیش کی۔

(اخبار الاخیار ص۱۶۶) مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اپنے مضمون (معارف جون ۱۹۸۱ء) میں استاد سے مراد حضرت سید اشرف جہانگیر (کچھوچھہ شریف) متوفی ۸۰۸ھ لیتے ہیں۔ کیونکہ اس قضیہ کے وقت قاضی صاحب کے دوسرے اساتذہ خواجہ عبدالمقتدر اور مولانا خواجگی (کالپی) وفات پا چکے تھے۔ صرف حضرت اشرف جہانگیر سمنانی حیات تھے۔ ان کو سادات اور اہلبیت سے اس قدر عقیدت و محبت تھی کہ اہل سنت والجماعت کے محتاط مسلک کے باوجود یزید پر لعنت کے جواز میں ایک کتاب لکھدی تھی۔

اس زمانہ کے مشہور عالم شیخ مشید بن مخدوم شیخ محمد بن خضر (والد ملا محمود جونپوری) متوفی ۸۱۱ھ سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ دونوں بچپن کے ساتھی اور ایک دوسرے کے غم خوار تھے۔ صدر جہاں سید اجمل نے بارہا سلطان کی طرف سے اور خود اپنی طرف سے التماس کی کہ بار خاطر نہ ہو تو فقرا اور واردین و متعلقین کے لیے کچھ جاگیر قبول فرمالیں۔ مگر شیخ مشید کسی طرح آمادہ نہ ہوئے جب سید شاہ اجمل کا اصرار بڑھا تو استخارہ کے بعد پرگنہ محمد آباد میں ولید پور وغیرہ بارہ ۱۲ قریات

قبول کرلیے۔

حضرت شاہ اجمل کو سلاسل سبعہ میں اجازت وخلافت تھی (معمولات مظہریہ) اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

(۱) سلسلۂ چشتیہ نظامیہ۔ میں حضرت جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے اجازت وخلافت ملی جو حضرت نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے خلیفہ تھے۔

(۲) سلسلۂ مداریہ قلندریہ۔ میں حضرت بدیع الدین شاہ مدار سے اجازت پائی۔ (تذکرۃ المتقین[1] فی احوال خلفائے سید بدیع الدین ج ۲۔ ص ۱۲)

(۳) سلسلۂ قادریہ
(۴) سہروردیہ
(۵،۶) کبرویہ اور فردوسیہ
میں حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ان کو اجازت ملی (معمولات مظہریہ)

ان کے خلفاء میں حضرت مخدوم بڈھن بہت مشہور ہوئے جو بہرائچ میں مدفون ہیں۔ ان کے خلیفۂ اجل حضرت درویش بن قاسم اودھی سے یہ سلسلہ خوب پھیلا۔ مولوی ابوالحسن مانکپوری تاریخ آئینۂ اودھ میں رقمطراز ہیں:۔

"ان کی اولاد میں مولوی ابوالحسن صاحب خلف الرشید مولوی بشارت اللہ صاحب ہیں اور علاتی بھائی سید ابوالحسن کے حافظ محمد اسماعیل و محمد خلیل و محمد موسیٰ ہیں مولانا سیدنا مخدوم بڈھن کے طہارت نسب میں کوئی شک نہیں مگر علی الاتصال شجرۂ نسب پدری مولف کو نہ مل سکا اس باعث اس کے لکھنے میں معذوری ہے"

مسالک السالکین فی تذکرۃ الواصلین میں ہے کہ ان کی وفات ۲۵ رمضان المبارک

---

[1] اس کتاب کی گیارہویں فصل خاص مشائخ اجمل کے تذکرہ کے لیے مختص ہے۔

[illegible] (سلطان بہلول لودی کے عہد میں) ہوئی۔ مزار پُرانوار شہر بہرائچ میں بستی سے اوتر قریب مزار حضرت مولوی شاہ نعیم اللہ قدس سرہٗ شکستہ اور سڑک کے کنارے واقع ہے۔

اب بہرائچ سے گونڈہ جانے والی سڑک پر دو کیلو میٹر کے بعد سیٹھ بہاری لال کی کوٹھی کے بالکل سامنے سڑک کے اتر جانب ان کا مزار واقع ہے جو ایک چہار دیواری کے اندر ½ ۱ فٹ اونچے چبوترے پر کھجور کے درخت کے نیچے ہے۔ ۱۹۵۵ء میں راقم الحروف اول بار مزار پر فاتحہ خوانی کے لیے حاضر ہوا تھا۔

اب ان کی اولاد میں حضرت شاہ نعیم اللہ بہرائچیؒ کے گھرانے کے ذریعہ سلسلۂ رشد و ہدایت قائم ہے۔ مسالک السالکین سے ذیل کا قطعۂ تاریخ نقل کیا جاتا ہے۔

شاہ اجمل ولی پاک خدا — عطر اللہ قبرہٗ ابدا
چون بخلد برین سفر فرمود — بست و پنجم زماہ رمضان بود
سال نقلش خرد چو گو ہر سفت — شد ولی جہاں بخت گفت
باز ترحیل آں چہ خوب و خنک — رحمۃ اللہ علیہ گفت ملک
باز نقلش بہ اختلاف سند — شیخ اہل کمال گفت خرد
۸۶۴

(باقی)

اخبار علمیہ

بابری مسجد کا قضیہ ملک کی سیاست میں ہلچل اور اضطراب کا باعث ہونے کے ساتھ ہندوستان کے علمی اور تاریخی حلقوں میں بھی بحث و نظر کا موضوع بنا ہوا ہے، اس کے تجزیے اور جائزے کا سلسلہ لامتناہی ہوتا جارہا ہے، متعدد مقالات و مضامین اور رسائل و کتب میں بھی اس پر مسلسل اظہار خیال ہورہا ہے۔ اسی فہرست میں نیا اضافہ بار کاونسل آف انڈیا ٹرسٹ کی کتاب 'رام جنم بھومی بابری مسجد' تاریخی دستاویزات، قانونی آرا اور فیصلے ہے انگریزی زبان میں اسے وشنے چندر مصرا نے مرتب کیا ہے، انھوں نے قضیہ کے دونوں پہلوؤں کے متعلق بعض اہم تحریریں جمع کردی ہیں الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے ریڈر سوشیل سریواستو نے رام جنم بھومی کے مسمار کیے جانے کے دعوی کو افسانہ محض قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستان کے کسی قدیم مورخ اور سیاح نے رام جنم بھومی کا ذکر نہیں کیا حتی کہ ابوالفضل اور ابن بطوطہ جنھوں نے ہندوستان کے متعلق جزئیات تک کو اہتمام سے بیان کیا ہے، ایسے اہم تاریخی اور مقدس مقام کے بارے میں خاموش ہیں، فیض آباد کے ۱۷۳۰ء سے ۱۸۱۹ء تک کے واقعات کو محمد فیض بخش نے مفصل بیان کیا ہے۔ لیکن ان میں بھی ایسے کسی مندر کی بات نہیں، خود تلسی داس نے رام جنم بھومی

کے وجود و قوع سے بے خبر ہیں، وشو ہندو پریشد کی جانب سے حکومت ہند کو جو کاغذات پیش کیے گئے تھے وہ بھی اس کتاب میں شامل ہیں، دو اور مقالہ نگاروں بی، آر گروور سابق ڈائریکٹر انڈین کونسل آف ہسٹاریکل ریسرچ اور ایس، پی گپتا سابق ڈائریکٹر الہ آباد میوزیم کے مقالات حیرت انگیز طور پر وشو ہندو پریشد کے کاغذات کی نقل ہیں، لیکن ٹائمز آف انڈیا کی نظر میں یہ اتفاق غیر متوقع نہیں ہے، حالیہ برسوں میں اس قضیہ کے متعلق جو اہم اور قابل ذکر تحریریں، دستاویزیں اور عدالت کے فیصلے ہوئے ہیں ان سب کا یہ کتاب مجموعہ ہے جو اس کی بڑی خوبی ہے۔

حقایق بالآخر ظاہر ہو کر رہتے ہیں، ذرہ ذرہ میں ذوق آشکارائی، فطرت کا خاصہ ہے چنانچہ علم حشریات اور آثار قدیمہ کی نئی دریافت کے مطابق مصر، ہند، چین اور عراق وعرب دنیا کی قدیم ترین مہذب و متمدن اقوام میں شامل ہونے کے حق دار ہوئے، اب شکاگو کے فیلڈ میوزیم کے ماہرین آثار قدیمہ نے دعوی کیا ہے کہ انھوں نے دریائے آمیزون کی وادی میں ایک ایسی تہذیب کا سراغ پالیا ہے جو میکسیکو، پیرو اور مایا تہذیبوں سے ہزاروں سال پہلے اپنے عروج پر تھی، دریائے آمیزون میں مچھلی اور صدف کی غیر معمولی فراوانی اس تہذیب کے عروج کی بنیاد تھی، وادی آمیزون کے موجود نہایت گھنے جنگلوں کی تاریکیوں میں ایسے قدیم نقوش محفوظ رہے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وادی سے نہ جانے کتنے کارواں گذرے ہوں گے۔

وادی کی مٹی وادی سندھ و نیل کی مٹی سے مشابہ ہے جو کثیر آبادی اور اجتماعی معاشرت کی تکوین و تشکیل کا باعث بنی، یہاں ایسے منقش گلی ظروف بھی پائے گئے ہیں جو اس تہذیب کی داستان سنانے کے علاوہ اس کی تاریخی توقیت یعنی تقریباً آٹھ ہزار برس پہلے کا تعین بھی کرتے ہیں۔ دنیا کے اس سب سے بڑے دریا کی گزرگاہ کے اردگرد موہن جو ڈارو جیسی بستیوں کا امکان، ماہرین کے ذوق تجسس کیلئے مہمیز کا کام کر رہا ہے۔

سرزمین مصر بھی آثار قدیمہ کے شیدائیوں کا پسندیدہ آماجگاہ ہے، گذشتہ دنوں دریائے نیل سے چند میل کے فاصلہ پر چند بڑی کشتیاں برآمد ہوئیں۔ قاہرہ کے جنوب میں ایک مقام پر بارہ بڑی چوبی کشتیاں ۱۴ سے ۲۰ میٹر تک لمبی دریافت ہوئیں جو تقریباً پانچ ہزار سال پرانی ہیں، قاہرہ کے روزنامہ 'الاخبار' میں ان کشتیوں کو مصر کی قدیم ترین شاہی کشتیوں کا ایک حصہ بتایا گیا ہے، ماہرین کی نظر میں قدامت کے علاوہ تاریخ مصر کے فرعون اول کی غیر معلوم تاریخ کے سراغ ملنے میں بھی یہ بڑی مفید ثابت ہوں گی۔

مصر کے ایک قدیم دارالسلطنت اوارس AVARIS کی کھدائی کے دوران محکمہ آثار قدیمہ کو یہاں ۳۶۰۰ سال پہلے یونانی تہذیب کے اثرات و باقیات کے شواہد ملے ہیں، ایک پختہ اور عالی شان قلعہ دریافت ہوا ہے جس میں دیواری تصویروں کے ایک عظیم الشان سلسلہ کے بعض اجزا بھی ملے ہیں جو جزیرہ کریٹ کی کی نین وال پینٹنگس سے حیرت انگیز

طور پر مشابہ ہیں، یہ جزیرہ مصر سے تقریباً ۵۰۰ کیلو میٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور اس کے پایہ تخت ہونے کی صورت میں مورخین کا خیال ہے کہ مصر کا حکمراں ہیکساس تھا جس کے معنی "بیرونی شہزادہ" کے ہیں، اب تک یہ خیال عام تھا کہ بیرونی شہزادوں سے مراد موجودہ اسرائیل اور لبنان کے باشندے ہیں، لیکن اس جدید تحقیق سے انجیل کی بعض روایات مشتبہ ہو جاتی ہیں، بعض محققین کی رائے میں جب ہیکساس مصر کا حکمراں تھا تو حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے صاحبزادگان مصر میں متوطن تھے اور یہ خروج بنی اسرائیل سے بہت پہلے کی بات ہے بہرحال اس نئی کھدائی کے نتیجہ میں اس عہد کی تاریخ پر از سر نو نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

ایک دلچسپ خبر یہ بھی ہے کہ آسٹریا میں کوہ آلپس کی ایک برفیلی چوٹی پر ایک برفانی آدمی کی میانی ہوئی لاش ملی، یہ چمڑے کے لباس میں ہے ساتھ میں ایک چاقو بھی ہے، سائنسدانوں نے پہلے تو تقریباً چار ہزار سال قدیم بتاتے ہوئے اسے برونز عہد کی ایک نادر دریافت سے تعبیر کیا لیکن اب اس جثہ کو سائنسدانوں کے خیال سے بھی زیادہ قدیم تصور کیا جا رہا ہے، اس برفانی لاش کے چاقو کی دھار تانبہ کی ہے جو برونز عہد سے بھی قدیم زمانہ کی نشاندہی کرتی ہے۔

عہد رفتہ کے مدفون و مستور خزینوں کی بازیافت کی ایک خبر یہ ہے کہ ہندوستان کے صوبہ اروناچل پردیش میں ایک چار سو سالہ قدیم بودھ صومعہ سے تقریباً ۹۰۰ کتبات اور مخطوطات

کا ذخیرہ برآمد ہوا ہے، یہ زیادہ تر مہایانہ بدھ مت کے ملفوظات ہیں اور تبتی زبان و رسم الخط میں ہیں، طاقتاہ میں اٹھارویں صدی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا تھا جو اب بالکل منتشر اور پراگندہ ہے۔ یہ خزانہ اسی کے غبار میں مستور تھا۔

ایک جانب زمین اپنے بعض رازہائے سربستہ کو مسلسل درس عبرت بنا کر پیش کر رہی ہے تو دوسری طرف خلائے بسیط، علم اشیاء کے وارثوں کو علم و حیرت کی نئی جہات سے روشناس کرتی جاتی ہے، حال ہی میں برطانیہ کے سائنسی مجلہ SPECTRUM نے اطلاع دی ہے کہ مانچسٹر یونیورسٹی کے پروفیسر اینڈریو لین نے اپنے بعض ساتھیوں کے ساتھ جارڈل بینک کی ۷۶ میٹر ریڈیو دوربین سے نظام شمسی سے پرے ایک ایسے سیارہ کا مشاہدہ کیا جو اپنی نوعیت میں منفرد اور اولین ہے، یہ سیارہ لاکھوں کیلو میٹر کے فاصلہ پر جس طرح کبھی دور اور کبھی قریب ہوتا ہے اس سے اس کے ساتھی کسی اور سیارہ کے وجود کا بھی پتہ چلتا ہے جو ہماری زمین سے تقریباً دس گنا زیادہ بڑا ہے، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ متحرک اور رواں سیارے جسامت میں ہمارے سورج سے کہیں زیادہ بڑے تھے لیکن بعد میں وہ نیوٹرون ستاروں سے متصادم ہو گئے، ان کے اندر نہایت طاقتور مقناطیسی زمین ہے فضائے بسیط میں یہ نور کی چادر یا خوشۂ نور کی مانند مسلسل گردش میں رہتے ہیں اور جب یہ زمین کے رخ پر ہوتے ہیں اسوقت ریڈیو ٹیلسکوپ انکی لہروں کے ارتعاش کو محسوس کر لیتا ہے، اس نئے سیارے کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ اس میں زندگی کا وجود ہے یا نہیں، لیکن یہ امید ضرور کی ہے کہ اسکے علاوہ اور بھی سیاروں کا وجود ممکن ہے جو شاید حیات انسانی کیلئے موزوں اور سازگار ہو۔

ع - ص -

وفیات

ڈاکٹر عبدالمنعم النمر

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

اس دور میں مصر کے دو ازہری عالموں نے ہندوستان کی اسلامی تاریخ اور یہاں کی علمی و دینی خدمات و شخصیات سے خصوصی اعتنا کیا ہے اور اس موضوع کے بارے میں عالم عرب اور عالم اسلام کے لیے بیش بہا معلومات فراہم کیں، ایک سابق وزیر اوقاف مصر ڈاکٹر عبدالمنعم النمر رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے مدیر کلیہ شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالعزیز عزت حفظہ اللہ وسلمہ، اس وقت شیخ عبدالمنعم النمر کا ذکر مقصود ہے جنھوں نے ۲۷ ماہ ہندوستان میں رہ کر عربی زبان وادب اور ثقافت کی تعلیم دینے کے ساتھ کشمیر سے مالابار تک سیاحت کر کے یہاں کے اسلامی آثار و تاریخ کا بغور مطالعہ کیا اور کتابیں لکھیں، نیز مولانا ابوالکلام آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور استاذ عبدالعزیز عزت نے یہاں کی متعدد کتابوں کا عربی میں ترجمہ شایع کیا، یہ دونوں عالم جامع ازہر اور موتمر اسلامی کی طرف سے ہندوستان میں مبعوث تھے، شیخ النمر کے ذکر سے پہلے استاذ عزت کا مختصر تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے۔

استاذ عبدالعزیز عزت نے جامع ازہر میں تعلیم حاصل کی اور اسی میں اردو زبان سیکھی اردو کی کتابیں اور اخبارات و رسائل بے تکلف پڑھتے اور سمجھتے ہیں البتہ بات چیت میں عربی اردو بولتے ہیں جس طرح یہاں کے علماء عربی کتابیں پڑھتے پڑھاتے ہیں اور گفتگو میں ہندی عربی بولتے ہیں اور دونوں کے لیے یہ عیب کی بات نہیں ہے بلکہ اس سے سننے والے

اہل زبان کو لطف آتا ہے، وہ جامع ازہر اور موتمر اسلامی کی طرف سے بمبئی میں عربی زبان کی تعلیم کے لیے مبعوث ہوئے اور تقریباً چار سال کے بعد ۱۹۶۵ء میں واپس ہوئے، اس درمیان میں میرے ان کے تعلقات عزیزانہ انداز کے ہوگئے اس کے بعد وہ پاکستان میں مبعوث ہوئے اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر تحقیقی مقالہ لکھکر کراچی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، مینر سید صاحب مرحوم کی کتاب "عربوں کی جہاز رانی" کا عربی میں ترجمہ الملاحۃ عند العرب کے نام سے شایع کیا جس کا مقدمہ پاکستان میں مصر کے سفیر سید علی ابوالفضل خشبہ نے لکھا ہے، موصوف نے مصر میں ایک ملاقات میں بتایا کہ اس کا مسودہ اسکندریہ یونیورسٹی کے استاذ بحریات نے مطالعہ کے لیے طلب کیا اور تقاضا کے باوجود واپس نہیں کیا مگر بعد میں کسی طرح اس کو حاصل کرکے شایع کیا، موصوف نے میری کتاب "عرب وہند عہد رسالت میں" کا ترجمہ العرب والھند فی عھد الرسالۃ" کے نام سے کرکے ۱۹۷۳ء میں قاہرہ کی الھیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب سے شایع کیا، اور "ہندوستان میں عربوں کی حکومتیں" کا ترجمہ الحکومات العربیۃ فی الھند والسند" کے نام سے مکتبہ آل مد اللہ البکیرو ریاض سے شایع کیا، وہ فی الحال مجمع البحوث الاسلامیہ کے رکن رکین اور مدیر مکتبہ شیخ الازہر ہیں،

شیخ عبدالمنعم النمر اگست ۱۹۱۳ء میں مصر کے مشہور شہر دسوق میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم مقامی درسگاہ میں حاصل کرکے جامع ازہر میں داخل ہوئے اور ۱۹۳۹ء میں کلیۃ اصول الدین سے عالمیت کی سند پائی، پھر وہیں سے ۱۹۴۱ء میں ماہر تعلیم کی سند حاصل کرکے جامع ازہر اور مصر کے دیگر معاہد و جامعات میں تعلیمی خدمت انجام دی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جامع ازہر اور موتمر اسلامی نے ان کو دارالعلوم دیوبند بھیجا جہاں انھوں نے

میں ادارہ کر عربی ادب و ثقافت کی تعلیم دی اور ہندوستان کی سیاحت کر کے یہاں کی اسلامی تاریخ و آثار کے متعلق معلومات جمع کیں، ان کے ساتھ شیخ عبدالعال العقبادی بھی استاد و معلم کی حیثیت سے تھے، ۱۹۶۵ء میں کویت کے مجلہ الوعی الاسلامی کے رئیس التحریر ہوئے، اور مختلف علمی و فقہی موضوعات پر پُر مغز مضامین و مقالات لکھے، اسی دوران امارت عربیہ متحدہ سے مجلہ المنار جاری کیا، ۱۹۷۵ء میں جامع ازہر کے وکیل بنائے گئے اور مدیر المبحثات الازہریہ کی حیثیت سے مفوضہ خدمات بوجوہ احسن انجام دیں ۱۹۷۹ء میں وزیر اوقاف بنائے گئے اور ۱۹۸۶ء میں حکومت مصر کی طرف سے ان کی علمی، تحقیقی اور دوسری مختلف خدمات کے اعتراف کے طور پر توصیفی سند پیش کی گئی اور مئی ۱۹۹۱ء (اواخر ذوقعدہ ۱۴۱۱ھ) میں قاہرہ میں انتقال کیا رحمۃ اللہ علیہ۔

شیخ عبدالمنعم النمر کی شخصیت بڑی طرح دار تھی، وہ قدیم و جدید کے جامع اور متوازن ذہن و مزاج کے عالم تھے، علمی و تحقیقی اور تعلیمی و تصنیفی مشاغل کے ساتھ عالم اسلام کے مسائل و معاملات سے عملی تعلق رکھتے تھے، اسلامی و سیاسی مؤتمرات میں اپنی باوزن شخصیت اور صائب رائے کے ساتھ حصہ لیتے تھے، بہترین خطیب تھے، اپنی مختلف الجہات صلاحیت کی وجہ سے دینی و علمی اور سیاسی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول تھے، ایک موقع پر ان کے شیخ الازہر ہو جانے کا امکان پیدا ہو رہا تھا، راقم کی ان سے پہلی ملاقات اکتوبر ۱۹۵۶ء میں جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس سورت میں ہوئی، اسی سال وہ دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے، ہندوستان کی اسلامی تاریخ ان کی طرح میرا بھی خاص موضوع تھا، اس لیے دونوں میں اچھا خاصا تعارف و تعلق ہو گیا، بعد میں مکہ مکرمہ کے

مجلد الحج میں انھوں نے المسلمون فی الہند کے عنوان سے مقالات لکھے جس میں بعض باتیں میرے حوالہ سے نقل کیں اور تقریباً دو ہفتہ تک ان سے تفصیلی ملاقات ۱۹۵۵ء میں بمبئی میں ہوتی رہی جب کہ وہ واپس جارہے تھے، پہلی بار میرے کمرے میں آئے، اور اندر قدم رکھا تو بے ساختہ کہا یا سلام تا ھلت بالکتب والکتابۃ، اس وقت چٹائی پر کتابیں اور اخبارات بکھرے ہوئے پڑے تھے، ان کا یہ جملہ میرے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس وقت رجال السند والہند مطبعہ حجازیہ بمبئی میں چھپ رہی تھی، اس پر اپنی رائے لکھی اور مطبوعہ فرمے اپنے ساتھ لیتے گئے۔ اس کے بعد وہ تین بار بمبئی، دیوبند اور دہلی تشریف لائے اور اتفاق سے ہر بار ان سے ملاقات ہوتی رہی اور سب سے زیادہ ملنا جلنا قاہرہ میں ۱۹۷۰ء میں ہوا جب وہ مدیر البعثات الازہریہ تھے، اور میں عرب و افریقہ کے علمی سفر میں تھا۔

جس زمانہ میں ڈاکٹر صاحب الوعی الاسلامی کویت کے رئیس التحریر تھے، ایک لکھے پڑھے آدمی کو جو بمبئی آرہا تھا، مجھ سے ملاقات کرنے اور سلام پہنچانے کی تاکید کی تھی، وہ صاحب عشاء کے وقت میرے کمرے میں آئے مغربی لباس میں تھے، حسب معمول کمرے میں چٹائی اور چادر بچھی ہوئی تھی وہ کھڑے رہے، میں نے تشریف رکھنے کو کہا، انھوں نے کہا کہ میں تاج محل ہوٹل کے فلاں کمرے میں ہوں، آپ وہیں آجائیں، یہ کہکر وہ چلے گئے اور میں نہیں گیا، موجودہ دور کے مصر و عرب کے فضلاء و مشائخ سمجھ نہیں سکتے کہ ہندوستان کے بوریہ نشین علما کس طرح دینی و علمی خدمت کرتے ہیں، انھوں نے ہندوستان سے واپس جاکر قاہرہ میں ہندوستان کے متعلق تین کتابیں تصنیف کیں (۱) تاریخ الاسلام فی الہند (۲) کفاح المسلمین فی تحریر الہند (۳) سبعۃ و عشرون شہرا فی الہند

اور مولانا ابوالکلام آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ تاریخ الاسلام فی الہند ۱۳۷۸ھ (۱۹۵۹ء) میں شایع ہوئی اور ۱۲ اپریل ۱۹۶۰ء کو موصوف نے میرے پاس بھیجا۔ اس کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ جب جامعہ ازہر اور موتمر اسلامی نے مجھے ہندوستان بھیجنے کا ارادہ کیا تو میں بڑی کشمکش میں پڑ گیا کیونکہ اس ملک کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کو محمد بن قاسم ثقفی اور سلطان محمود غزنوی نے فتح کیا ہے اور یہاں کے لوگ ہاتھی پر سواری کرتے ہیں، اسی وجہ سے یہاں کی اسلامی تاریخ کی تلاش و تحقیق کا خیال پیدا ہوا اور یہاں آکر تدریس و تعلیم کی مشغولیت میں کشمیر سے مالابار تک مختلف تقریبوں سے سفر کیے اور ہر جگہ مختلف ذرایع سے معلومات حاصل کی۔

مرحوم نے تاریخ الاسلام فی الہند کے ساتھ جو خط مجھے لکھا اس سے ان کی اسلامی ہند کی تاریخ سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، لکھتے ہیں کہ میں آپ کے پاس یہ کتاب بھیج رہا ہوں، مجھے امید ہے کہ اس میں آپ کے لیے خوش کن باتیں ہوں گی، نیز یہ کہ آپ مجھے اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھیں گے اور جو کمی ہو اس کی نشان دہی کریں گے، تاکہ طبع ثانی میں اس سے استفادہ کروں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی کتاب رجال السند والہند کی پہلی جلد شایع ہو چکی ہے، مجھے ایک نسخہ بھیج دیں اس طرح میں ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں ایک کتاب لکھ چکا ہوں جس میں ہندوستان کی تحریک آزادی سے قیام پاکستان تک مسلمانوں کی جدوجہد کی تفصیل بیان کی ہے، اس موضوع کے بارے میں اگر کوئی خاص بات معلوم ہو تو لکھیں تاکہ اس سے مدد لوں، اس سال (سنہ ۱۹۶۰ء) قاہرہ کے ہندوستانی سفارت خانہ نے صوت الہند کے نام سے جریدہ

شمارہ شائع کیا ہے میں نے اس میں ایک طویل مقالہ" النشاط العلمی والاجتماعی للمسلمین فی الھند"
کے عنوان سے تحریر کیا ہے اور انجمن خدام النبی ؐ اور اسکے ارکان کے بیان پر ختم کیا۔
یہ جدید عالم عربی میں تقسیم کیا گیا ہے، موسم حج کی مناسبت سے شایع کیا گیا ہے،
اور حجاز میں بھی تقسیم کیا جائے گا۔

میری کتاب مترجمہ ڈاکٹر عبدالعزیز عزت الحکومات العربیۃ فی الھند و السند
پر ڈاکٹر عبدالمنعم النمر مرحوم نے ۱۸ اگست ۱۹۸۰ء کو نہایت شاندار مقدمہ لکھا ہے،
مرحوم سے میری آخری ملاقات گذشتہ سال دہلی میں ہوئی تھی جب کہ وہ سرکاری
مہمان کی حیثیت سے مولانا ابوالکلام آزاد صدی تقریبات میں آئے تھے، ان کی طلب پر میں نے
العقد الثمین فی فتوح الھند پیش کی اور کہا کہ آپ اب بوڑھے ہوگئے ہیں انھوں
نے اس کے جواب میں کہا وانت ایضاً،

یادِ رفتگاں

مولانا سید سلیمان ندوی ؒ نے وفیات کے تحت یادداشت میں اپنے دور کے جن مشاہیر اور ممتاز اہل علم و قلم
کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کیے تھے یہ کتاب ان کا مجموعہ ہے اس میں اپنے اساتذہ، شیخ طریقت احباب و معاصرین
اور مختلف طبقوں کے لوگوں کا دلچسپ اور پر از معلومات تذکرہ کیا ہے اور مسلمانوں کے علاوہ بعض ہندوؤں،
عیسائیوں اور یہودیوں کا بھی ذکر ہے قیمت ۵۰ روپیہ

بزمِ رفتگاں

یہ کتاب جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ؒ کے قلم سے دو حصوں پر مشتمل ہے اس میں انھوں نے اپنے
عہد کے مختلف طبقے کے اصحاب علم و ادب اور قومی و ملی زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد کے بارے میں
اپنے تاثرات و مشاہدات قلم بند کیے ہیں، اسکا پہلا حصہ مکتبہ جامعہ دہلی نے شایع کیا ہے اور دوسرا
دارالمصنفین سے چھپا ہے۔ حصہ دوم قیمت ۳۵ روپیہ

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

GABRIEL'S WING از ڈاکٹر انا میری شمل، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۰۲، قیمت ۵۰ روپیے پتہ: اقبال اکاڈمی لاہور پاکستان۔

علامہ اقبال کے کلام و پیام کے شیدائیوں اور شارحین میں جرمنی کی ڈاکٹر انا میری شمل بھی ہیں جو اپنے بلند پایہ مقالات اور کتابوں کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں، زیر نظر کتاب علامہ اقبال کے پچیسویں سال وفات کے موقع پر شائع ہوئی تھی پچیس برس گزرنے کے بعد اب اس کا یہ دوسرا اور جدید ایڈیشن شائع ہوا ہے، اس میں شاعر مشرق کے مذہبی نظریات کا جامع جائزہ تین ابواب میں لیا گیا ہے اور اسلام کے پانچ بنیادی ارکان اور جہاد کے علاوہ انبیا علیہم السلام، کتب آسمانی، روز آخرت، قضا و قدر اور خیر و شر کے متعلق جس عالمانہ انداز سے بحث کی گئی ہے اس سے مصنف کی وسعت مطالعہ اور اصابت رائے کا اندازہ ہوتا ہے علامہ اقبال علمی و دینی معاملات میں مولانا سید سلیمان ندویؒ سے برابر رجوع کیا کرتے تھے، مصنفہ نے اس سلسلہ میں سید صاحبؒ اور علامہ کی مراسلت کا ذکر کرکے صحیح اور مثبت نتائج اخذ کیے ہیں، ان کی نظر میں یہ مراسلت، حیات اقبال کے نظریاتی باب کا جاذب ترین حصہ ہے، پہلے باب میں علامہ کے سوانح، خاندانی پس منظر، مذہبی محرکات کے علاوہ ان کے کلام کے جمالیاتی پہلو پر بھی مفید گفتگو کی گئی ہے مستشرقین

سے تعلق کی بحث بھی پر مغز ہے خود مصنف نے اسے خصوصی مطالعہ کا مستحق قرار دیا ہے'
انھوں نے جرمنی کے عصر حاضر کے نامور فلسفی رڈولف پان وٹیز کے حوالہ سے یہ ثابت
کرنے کی سعی کی ہے کہ اسلامی افکار پر مشتمل ہونے کے باوجود فلسفہ اقبال، غیر مسلموں کے
لیے بھی پرکشش ہے، کتاب کے مراجع اور فہرست کتب سے بھی مصنف کی محنت کا اندازہ
ہوتا ہے، آخر میں سلیقہ سے اشاریہ بھی دیا گیا ہے۔ پچیس برس گزرنے کے بعد بھی کتاب
کی تازگی باقی ہے

AKBAR AND RELIGION از پروفیسر خلیق احمد نظامی،
متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش صفحات ۴۰۰، قیمت ۳۵۰ روپے
پتہ: ادارۂ ادبیات دلی ۲۰۰۹، قاسم جان اسٹریٹ، دلی ۱۱۰۰۰۶۔

مغل حکمراں جلال الدین محمد اکبر کی زندگی کے مختلف مدارج میں مذہبی افکار کے بوقلموں
مظاہر، مورخین کے لیے متنازعہ اور مختلف فیہ مباحث رہے ہیں اور ان میں افراط و تفریط کے
عنصر کی کارفرمائی واضح طور پر نظر آتی ہے، بعض مورخین نے اسے ملحد و مرتد ثابت کرنے
کی کوشش کی تو بعض نے اس کی غیر معمولی ذہانت اور جویائے حق طبیعت کے سیاق
میں بد عقیدہ ظاہر کرنے پر اکتفا کیا، زیر نظر کتاب کے تین حصوں میں اکبر کی پرکشش
شخصیت، خاندانی اثرات، تعلیم، علم و دانش، معاصر مذہبی تحریکوں اور رجحانات'
علماء و صوفیہ، ہندوستانی سیاست کا مزاج و روایات اور مذہب کے متعلق اکبر کی
کشمکش اور اس کے خیالات اور ان کے رد و قبول پر مفصل بحث کی گئی ہے، فاضل
مولف کے نزدیک اسلام کے بارہ میں اکبر کا پہلا دور ہمدردی، دوسرا بے حسی اور
تیسرا نفرت و بے زاری کا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں عہد اکبری کے تمام اہم اسباب

واقعات کا مورخانہ نقطہ نظر سے جائزہ لیا، ان کے خیال میں اکبر کے مذہبی رویہ کی صحیح علمی توجیہ صرف تاریخ کے جھروکوں سے ہی کی جا سکتی ہے۔ اس کے درباریوں اور اس کے عہد کے مورخوں کے نفسیاتی جائزہ کے علاوہ ہندومت، نصرانیت اور مجوسیت سے اس کے تعلق کو ہندوستان کی سیاست کے پس منظر میں دیکھا گیا ہے، اس قابل قدر کتاب کی تدوین میں انھوں نے ہندوستان کے علاوہ برطانیہ، اٹلی اور ایران کے علمی ذخیروں سے بھی خوشہ چینی کی ہے جس سے اس بحث میں جدت و ندرت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ آخر میں چند ضمیموں میں بعض تاریخی دستاویز، محضر، اکبر کے خطوط، سکوں، عمارتوں اور تصویروں کے علاوہ اہم حالات کو بلحاظ سنین درج کر دیا گیا ہے اور کتابیات اور اشاریہ اس پر مستزاد ہے۔

SOCIO ECONOMIC DIMENSION OF FIQH LITERATURE IN MEDIEVAL INDIA

از ڈاکٹر ظفر الاسلام، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۵۰، قیمت ۹۰ روپیے، ناشر: ریسرچ سیل، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، نسبت روڈ لاہور، پاکستان

قرون وسطیٰ کے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومتوں کے استحکام اور ان کے معاشرہ کے قیام کے بعد یہاں کے مختلف مذاہب اور ان کی تہذیب و معاشرت کی موجودگی کی بنا پر اسلامی قانون و فقہ کو نئے مسائل و حوادث کا سامنا کرنا پڑا جن سے عہدہ برآ ہونا ناگزیر امر تھا، چنانچہ محصول آراضی، زمین کی ملکیت، زراعتی قوانین، زکوٰۃ کا مصرف، مسلم و غیر مسلم تعلقات کی نوعیت وغیرہ کے بارے میں عہد سلطنت اور مغلیہ دور کے سیاسی و تمدنی تاریخ میں فقہاء کے اقوال و آراء متفرق طور پر جا بجا ملتے ہیں، زیر نظر

کتاب میں لائق مصنف نے عہد سلطنت میں فقہ اسلامی کے ارتقا اور فتاویٰ فیروز شاہی کی روشنی میں اس عہد کے سیاسی و معاشرتی مسائل اور مسلم و غیر مسلم تعلقات کا جائزہ لیا ہے اور فتاویٰ عالمگیری کی روشنی میں محصول آراضی اور اسکے متعلق اورنگزیب کے فرمان پر بھی بحث کی ہے، انکے علاوہ سولہویں صدی کے زرعی قوانین کے متعلق شیخ جلال الدین تھانیسری کے رسالہ در بیع آراضی اور مغل دور حکومت میں جائداد کے متعلق اٹھارویں صدی کے قاضی محمد اعلا تھانوی کے رسالہ احکام الاراضی پر بھی بحث کی ہے۔ لائق مولف نے فقہ جدید کی تدوین اور جدید مسائل کے حل کے لیے سلاطین کی علم پروری اور حوصلہ افزائی کا خاص طور سے ذکر کیا ہے، ان فتاویٰ سے بعض دلچسپ سیاسی و سماجی نتائج اخذ کیے گئے ہیں مثلاً دولت آباد کے رویت ہلال کو دلی میں تسلیم کیا جانا گو یہ ایک خالص فقہی مسئلہ ہے لیکن اس سے ہندوستان کے شمال و جنوب کے درمیان ربط و یک جہتی کا پتہ چلتا ہے، اسی طرح دلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں آباد ہونے والے مسلم مہاجرین کے آبائی وطن کو اصلی وطن کی قانونی حیثیت سے کالعدم قرار دیے جانے سے ہندوستان میں مسلم معاشرے کی آبادکاری کے منصوبہ پر روشنی پڑتی ہے، سکندر لودی کے عہد میں کورکشیتر کے ایک کنڈ کے متعلق علماء نے فتویٰ دیا کہ کسی بھی عبادت گاہ کو منہدم کرنا جائز نہیں، اسی طرح مسلم و غیر مسلم تعلقات کی نوعیت پر فتاویٰ فیروز شاہی میں جو سوال و جواب مذکور ہیں، انکی عمدہ ترجمانی کی گئی ہے۔ لائق مصنف مسلم یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کے نوجوان اور لائق استاد ہیں، ملک و بیرون ملک کے ممتاز علمی مجلوں میں ان کے مقالات شایع ہوکر اہل علم و نظر کی توجہ کا مرکز بن چکے ہیں، ان کی یہ کتاب مفید اور قابل قدر ہے، اس کی اشاعت پر اس کے ناشر مولانا عبد المتین ہاشمی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۴۹ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۲ء عدد ۲

مضامین

ضروری اعلان

ہر قسم کا چیک، ڈرافٹ اور منی آرڈر صرف دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کے نام سے آنا چاہئے جس مہینے کا پرچہ نہ ملے اس کی اطلاع دوسرے مہینے کے شروع میں ضرور کردی جائے ورنہ تعمیل ممکن نہ ہوگی۔

"منیجر"

شذرات

ہندوستان کے دورِ محکومی میں تاریخ سیاسی مصلحتوں کے ماتحت مسخ کی جاتی رہی ہے، انگریزوں نے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی باتیں جمع کی تھیں جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات میں نفرت و اشتعال پیدا ہو اور اختلاف و افتراق کی خلیج کم نہ ہونے پائے، اب گو ہندوستان کو انگریزوں کی سیاسی غلامی سے نجات مل گئی ہے لیکن ابھی تک یہاں کے لوگ نہ ان کی ذہنی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں اور نہ ان کا درسِ انتشار بھولے ہیں، اس لیے اب بھی تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے اور یہ دکھایا جا رہا ہے کہ ہندوستان کی ان دونوں قوموں میں میل ملاپ کے بجائے ہمیشہ تصادم اور ٹکراؤ رہا، انگریزوں کے دور کی طرح آزاد ہندوستان کے مورخین بھی مسلمانوں کے مظالم کے فرضی قصے بیان کر کے دونوں قوموں میں نفرت و اشتعال بڑھا رہے ہیں۔

اسکول کے کم سن بچوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کیلئے اب جو کتابیں داخل درس ہیں ان میں ہندوؤں پر مسلمان حکمرانوں کے ظلم و زیادتی کے فرضی واقعات درج ہیں، راجستھان کے ایک خطہ سے معلوم ہوا کہ وہاں کے ہر ضلع میں درجہ ہشتم میں مسلم عہد حکومت کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے، کئی سال سے اورنگ زیب سے متعلق Objective type Paper میں یہ مسموم سوال دُہرایا جاتا ہے کہ "ہندوؤں پر انتہائی اتیاچار کرنے والا مغل سمراٹ تھا" مکتوب نگار نے اس کی چار عدد فوٹو کاپی بھی بھیجی ہے، ضلع انسپکٹر اور ڈائرکٹر آف ایجوکیشن راجستھان سے احتجاج کرنے پر کبھی وقفہ دے دیا جاتا ہے، اس سال پرچہ بنانے والی کمیٹی کے پرنسپل سے ملاقات کی گئی تو ششماہی امتحان میں بیک جنبش تین شہنشاہوں کو نشانہ بنا دیا، سوال نمبر ۱ "ہندوؤں کے ساتھ اَدار نیتی اپنانے والا مغل سمراٹ تھا (الف) بابر۔ (ب) ہمایوں۔ (س) اکبر۔ (د) جہانگیر۔ ظاہر ہے اس سے صرف ہندو طلبہ کا ذہن ہی مسموم نہیں ہوگا بلکہ سادہ اور خالی الذہن مسلمان بچوں کے دلوں میں بھی مسلم فرمانرواؤں سے اور گھن پیدا ہوگی۔

بلاشبہ مغل حکمراں معصوم نہیں تھے لیکن انھوں نے ملک کی عظمت میں چار چاند بھی لگائے ہیں، اور بلا تفریق مذہب و ملت اس کے تمام باشندوں کے ساتھ عمدہ سلوک بھی کیا ہے، سرجادو ناتھ سرکار سے لیکر اب تک کے اکثر مورخین اورنگ زیب کو ہندو کش، ظالم اور ستمگر کہے چلے جارہے ہیں، لیکن کیا اس کی کتاب زندگی کے صفحات محبت، انصاف، رواداری، فراخ دلی اور حب الوطنی کے واقعات سے معرا ہیں، کیا اس کے متعدد فرامین میں بنارس کے مندروں اور پانڈوں کے مصارف کے لیے جاگیریں عطا کیے جانے کا ذکر نہیں ہے؟ لیکن تاریخ کی کتابوں میں ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، دراصل اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں ہے جن کے پڑھنے سے دونوں قوموں کے درمیان اختلاط و محبت کے جذبات پرورش پائیں اور منافرت کے بجائے یکجہتی اور اتحاد کی تخم ریزی ہو، لیکن جب نیتیں صاف نہ ہوں تو ان پر نظر کیسے پڑ سکتی ہے؟ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ ارشاد آج بھی بہت معنی خیز ہے "ہندوستان کو آگے چلنا ہے تو پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہیے، اس بحث سے کہ سلطان محمود کا حملہ ہندوستان پر جائز تھا یا ناجائز اور شہاب الدین غوری نے کتنے مندر غارت کیے اور عالمگیر نے ہندوؤں پر کیا کیا ظلم کیے، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا"۔

روس سے اشتراکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے مگر ہندوستان کے اردو ادیب و شاعر ابھی تک اس کا گن گا رہے اور مارکس و لینن کے خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں، الحاد و بے دینی کا پرچار ان کا شیوہ بنا ہوا ہے، اسی قسم کے ادیب "اردو والے" کہلاتے ہیں، اردو کے ان اجارہ داروں میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبۂ اردو کے اساتذہ اور سرکاری امداد سے چلنے والے اردو اداروں سے وابستہ افراد بھی شامل ہیں، اس بنا پر اردو کا ہر اعزاز انہی کو ملتا ہے اور یہی اس کے نام پر حاصل ہونے والی فتوحات و غنائم سے بھی متمتع ہوتے ہیں، ان کے حلقوں سے باہر کے اردو کے کسی بڑے سے بڑے مصنف کو اعزاز و انعام دیا جانا انھیں بہت گراں گذرتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں وہ "اردو والا" نہیں ہے۔

اردو کے جن اداروں نے اردو میں علمی و تحقیقی تصنیفات کا انبار لگایا ہے اور مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے اس کے ذخیرہ کو مالا مال کیا ہے، بلکہ بعض مصنفین نے تن تنہا مذہب، فلسفہ، کلام، تصوف، ادب اور تاریخ و سیر میں مفید اور بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں جو کسی زبان کیلئے بھی مایۂ فخر ہو سکتی ہیں، اور جن کے ملک و بیرون ملک کی مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں، اس موقع پر بے اختیار ہماری زبان پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نام آگیا جو عربی کے علاوہ، اردو کے بھی مشہور اہل قلم اور اچھے انشا پرداز ہیں اور جنھوں نے اپنے والد بزرگوار کی مقبول تصنیف "گل رعنا"

پر ادبی، تنقیدی اور تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ مقدمہ لکھا ہے، ان کی سرپرستی میں "رابطہ ادب اسلامی" کے نام سے ایک ادبی تحریک بھی جاری ہے جس کے سیمینار ہر سال پابندی سے کسی بڑے شہر میں ہوتے ہیں، اس کے باوجود "اردو والوں" میں ان کا شمار نہیں، یا للعجب!

"اردو والے" بقول خود وہ ہیں جو نظمیں، غزلیں، افسانے، ڈرامے اور ناول لکھتے ہیں اور ان کے ادبی و تنقیدی مضامین کے دو چار مجموعے چھپے ہیں یا جنھوں نے بعض متون کو اڈیٹ کیا ہے، حالانکہ اردو کے ان اجارہ داروں کو اس کے فروغ و ترقی کے بجائے صرف اپنے اعزاز و انعام سے سروکار ہوتا ہے، آج اردو غریب پر جو سخت اور نازک وقت آیا ہے، اس کے ذمہ دار بڑی حد تک اس کے یہی کرم فرما ہیں، ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اردو اس ملک میں "اردو والوں" کے بجائے عربی مدارس، اردو کے غیر سرکاری اداروں اور ان ارباب قلم کی بدولت زندہ ہے جو نام و نمود، صلہ و ستایش اور فتوحات و غنائم سے بے پروا ہو کر خاموشی سے اردو کی خدمت و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔

افسوس ۲ر فروری کو دار المصنفین کے مخلص اور قدیم کارکن منشی عطاء اللہ صاحب نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، ان کا اصلی وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا، ۱۹۱۶ء میں دار المصنفین میں پریس قائم ہوا تو ان کے بڑے بھائی منشی عبد الحفیظ صاحب مرحوم نے اس کے انصرام کی ذمہ داری قبول کی، ان ہی کے ساتھ یہ بھی اعظم گڈھ آکر شعبۂ طباعت سے وابستہ ہوئے، جب کبر سنی کی وجہ سے ملازمت ترک کرنی چاہی تو سید صباح الدین صاحب مرحوم کا شدید اصرار اس میں مانع ہوا، پھر اپنے سعادت مند فرزند ڈاکٹر محمد نعیم ندوی کے اصرار سے گھر پر آرام کرنا منظور تو کر لیا لیکن ان کا دل دار المصنفین ہی میں لگا رہتا تھا، اس لیے جب تک قوت رہی برابر دوسرے تیسرے روز یہاں آتے رہے، وہ طبعاً نیک، صلح پسند اور دیندار تھے، اپنی دینداری کی وجہ سے اپنے اکلوتے بیٹے ڈاکٹر محمد نعیم ندوی کو حفظ کرانے کے بعد ندوہ میں داخل کیا جو فراغت کے بعد دار المصنفین کے رفیق رہے اور اب ابو ظبی کے محکمۂ شرعیہ سے وابستہ ہیں، منشی عطاء اللہ صاحب اپنی نیکی، بھلمنساہت اور ملنساری کی وجہ سے شہر میں بھی مقبول تھے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مقالات

عہد غالب کا فکری اور تہذیبی ماحول[1]

از

پروفیسر خلیق احمد نظامی

غالب نے جب آنکھ کھولی تو سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال گہن میں آچکا تھا صدیوں کا سیاسی اور تہذیبی ماحول تیزی کے ساتھ رنگ بدل رہا تھا۔ اقبال نے ۱۷۹۹ء کو دنیائے اسلام میں تغیر احوال اور زوال و انحطاط کا سال قرار دیا ہے۔ ایک طرف ٹیپو سلطان کے خاتمہ نے مشرق میں تجدید و احیاء کی آخری امید پر پانی پھیر دیا تھا، تو دوسری طرف مغرب میں جنگ نوارینو (Navarino) میں ترکی بیڑے کی شکست نے مسلمانوں کی طاقت کا شیرازہ منتشر کردیا۔ اس کے بعد ہر طرف زوال و ادبار کے بادل منڈلانے لگے۔ غالب نے جب ہوش سنبھالا تو شاہجہاں کی دہلی کہیں دور تاریخ کے دھندلکوں میں غائب ہوچکی تھی۔ لال قلعہ اب بھی وہیں تھا جہاں شاہجہاں نے بنایا تھا، دربار عام اور دربار خاص اب بھی منعقد ہوتے تھے لیکن ان کی حیثیت بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہ تھی۔ بایں ہمہ ذہن اب تک یاد ماضی سے آزاد نہ ہوئے تھے۔ ایک بار غالب کی زبان سے بے اختیار نکل گیا ؎

ورتہ ایں شہر زوال باز آمد　　　می شناسم کہ مگر شاہجہاں باز آمد

---

[1] معارف: یہ فاضلانہ مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے بین الاقوامی غالب سیمینار میں ۲۱ دسمبر ۱۹۹۹ء کو پیش کیا گیا اور اب اسے معارف کی زینت بنایا جارہا ہے۔

یہ دل کی خاموش تمنائیں تھیں جن کے پیچھے دلی کی یادِ ماضی کروٹیں لے رہی تھی۔ لیکن یہ خواب اب شرمندۂ تعبیر ہونے والے نہ تھے۔ تاریخ اپنا ورق الٹ چکی تھی۔ نئی دنیا عالم وجود میں آ رہی تھی۔ یہ تبدیلی صرف ایک شاہی خاندان کی نہ تھی بلکہ ایک پوری تہذیب کا دمِ واپسیں تھا۔ نئے نظام کے پیچھے یورپ کا صنعتی انقلاب تھا، تجارت کی منڈیاں تھیں، تاجروں کے قافلے تھے اور تسخیرِ اقوام کے نئے جال تھے۔ تہذیبی قدریں، فکر و نظر کے سانچے، خوب و زشت کے پیمانے اپنے محور بدل رہے تھے۔ غالب کے بیقرار دل نے دعا مانگی ؎

بایدکہ جہانے دگر ایجاد شود تا کلبۂ ویرانِ من آباد شود

یہ وہی کیفیت تھی جس کے متعلق ایک انگریز شاعر نے کہا ہے :

Wandering between two worlds, one dead

The other powerless to be born.

غالب کے لیے نہ ماضی سے رشتہ توڑنا آسان تھا، نہ حال کی حقیقتوں کو نظر انداز کرنا ممکن۔ ان کی ذہنی کیفیت حالات کے اس تضاد کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ جب اپنے عہد کا یہ سب سے بڑا شاعر غمِ روزگار کا بوجھ اپنے سر پہ لیے کلکتہ کی طرف قدم اس طرح اٹھاتا ہے کہ

چہرہ اندودہ بہ گرد و مژہ آغشتہ بہ خون خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنوان رفتم

تو زخمِ دل کے ٹانکے ٹوٹتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جب کلکتہ پہنچتے ہیں تو وقت اور مصلحت ان کے اندازِ تکلم کو بدل دیتے ہیں اور وہ کلکتہ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ بقول مولانا آزاد :

"مرزا غالب کے بہت سے رجحانات و امیال کی طرح یہ تاثر بھی ایک خاص جذبہ کا نتیجہ

تھا" (نقش آزاد، ص ۲۷۵)

غالب نے جگہ جگہ آزمایش کا ذکر کیا ہے۔

ع جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

یا

ع نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمایش ہے

یہ آزمایشیں سیاسی اور تمدنی حالات کی پیدا کی ہوئی تھیں جن سے ان کو نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا۔ انھوں نے اس دور میں اپنی ذہنی کشمکش کو پورے شاعرانہ اعجاز کے ساتھ ایک دلکش تصویر کے سہارے اس طرح پیش کر دیا ہے ؎

بہ چوں عکس پل بسیل بذوق بلا برقص   جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

دریا کے امنڈتے ہوئے طوفان میں پل کا عکس جس طرح رقص کرتا نظر آتا ہے طوفان میں زندہ رہنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ عکس پل کی طرح رقص کرتے رہو لیکن اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اس شعر میں غالب نے اپنی ساری نفسیاتی کیفیت کو جس میں بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیبی قدروں کو سینے سے لگائے رکھنے کا جذبہ بھی پوشیدہ ہے ایک متحرک پیکر کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ حیات غالب کا جتنا مطالعہ کیجیے یہی شعر چشم تصور میں ان کی زندگی کا ترجمان بن کر بار بار ابھرے گا۔ اگر مشاہدہ حق کی گفتگو، بادہ و ساغر کہے بغیر نہ بنتی تھی، تو غم روزگار کی کیفیت بھی تشبیہہ و استعارہ کے بغیر بیان کرنا آسان نہ تھا۔

عصر حاضر کے مشہور مورخ اور دیدہ ور ماہر عمرانیات ارنلڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee) نے لکھا ہے کہ جب ایک تہذیب شکست کھا کر دوسری تہذیب کے لیے جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو Schism of the soul روح کا انتشار پیدا

ہو جاتا ہے اور افکار و احساسات کی پوری دنیا کو متزلزل کر دیتا ہے۔ ادب، آرٹ، کلچر غرض زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اثر سے نہیں بچتا۔ پھر Response اور challenge کا فطری عمل تیز تر ہو کر نئے ماحول سے مفاہمت کو کبھی آسان اور کبھی مشکل بنا دیتا ہے۔ بالآخر پرانی تہذیب وقت کے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں ایک لمحہ کی غفلت منزل سے صدیوں کی دوری پیدا کر دیتی ہے۔ غالب نے سماجی انقلاب کے اس تہذیبی بحران سے یہ کہہ کر گزرنے کی کوشش کی ع

آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

لیکن حقیقت نے دامنِ دل پکڑ لیا اور ان کو یہ اعتراف کرنا پڑا

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

کعبہ و کلیسا کا ٹکراؤ یہاں شاعرانہ علامتیں نہیں، بلکہ زندگی کی زبردست حقیقتیں ہیں جن سے غالب کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ سماجی تبدیلی کے اس ہوش ربا دور میں جذبات کے یہ تغیرات بالکل فطری Response کے آئینہ دار ہیں۔ تحیر تجسس، احساس، و یقین کی کیفیات پیکر بدل بدل کر ان کے کلام میں ظاہر ہوتی ہیں اور دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

غالب کے افکار و اعمال کے تجزیے کے لیے ان کے ماحول پر نظر ہونی ضروری ہے اسی کی مدد سے ان کے عمل اور ردِ عمل کی حقیقی نوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غالب کی عمر ۳ سال تھی جب سرنگا پٹم میں ٹیپو سلطان نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جنگ کرتے ہوئے جان دی۔ اسی زمانہ میں چراغ علی شاہ اور ان کے ساتھیوں نے ترائی میں انگریزوں کے کارخانوں پر حملے شروع کیے۔ غالب ۳۰ سال کے تھے جب سید احمد شہیدؒ نے بالاکوٹ کے میدان میں شہادت پائی۔ اسی سال بنگال میں نرکل بریا کے میدان میں فرائضی تحریک کے مشہور رہنما تیتو میاں

نے انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دی۔ غالب کی عمر ۶۰ سال سے اوپر تھی جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رستاخیز برپا ہوا۔ ممکن نہیں کہ وہ جنگ آزادی کے ان معرکوں سے، جو ہندوستان کے تین اہم مقامات، سرنگاپٹم، بالاکوٹ اور دہلی برپا سے تعلق رکھتے ہیں، ناواقف رہے ہوں۔ لیکن ان کا رد عمل صرف ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے متعلق ملتا ہے۔ پہلے تین حوادث میں سے کسی کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا۔ ان سے پیدا شدہ اثرات کو ان کے کلام میں تلاش کرنے کے لیے نفسیاتی پیمانوں کی مدد درکار ہو گی۔ دلی ہندوستان کا قلب و جگر تھی، جہاں شمال و جنوب ہر طرف کی آواز سنائی دیتی تھی۔ انھوں نے ان سب ہنگاموں کے متعلق ضرور سنا ہوگا لیکن مصلحت اندیشی نے ان کی زبان پر مہر سکوت لگا دی۔ وہ ۱۸۵۷ء کے حوادث کا ذکر ضرور کرتے ہیں لیکن ان کے دل و دماغ کی کشمکش عجیب عجیب پہلو بدلتی نظر آتی ہے۔ مکتوبات میں ان کا دل تحیر و تفکر کے عالم میں آہیں بھرتا ہے۔ دستنبو میں ان کا دماغ تسلی دیتا اور تبدیلیوں کو قبول کرنے کی تلقین کرتا نظر آتا ہے۔ مصلحت اندیشی زخم دل کو چھپانے پر مجبور کرتی ہے۔ غم فردا، غم امروز پہ غالب آجاتی ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے اپنی غزلوں میں محشرستان بے قراری، دل و مژگان کا مقدمہ، کشاکش ہستی، پندار کا صنم کدہ کہہ کر اپنے کتنے جذبات پر پردے ڈالے ہیں۔ یہ سارے ہنگامے جن کو وہ غم عشق کی داستان بنا کر پیش کرتے ہیں، حقیقت میں یہ سب فکری اور تہذیبی زندگی کے معرکے تھے جن سے ان کو دوچار ہونا پڑا تھا۔

مشرق میں یورپ کے اقتدار و تسلط نے بے شمار تہذیبی، فکری اور سماجی مسائل پیدا کر دیے تھے۔ ان کو سمجھنا اور پستی و ادبار سے نکلنے کی راہ اور وسائل کی تلاش کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا تھا۔ ہندوستان، مصر، ترکی، ایران اور تیونس کے داعیان اصلاح

نے ان حالات میں مختلف طریقے اختیار کیے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد نے ان تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے جمعیۃ العلماء کے ایک خطبہ صدارت (۱۹ نومبر ۱۹۲۱ء) میں کہا تھا:

"مسلمانوں کو موجودہ پستی اور ادبار سے نکالنے اور ان کے عروج و اقبال رفتہ کے واپس لانے کے لیے کیا اسباب و وسائل اختیار کرنے چاہئیں اور راہ عمل و فوز کیا ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ابتدا سے تین مختلف مذاہب اصلاح ہیں جو ہندوستان، مصر، ترکی، ایران، تیونس اور بلاد ترکستان و قفقاز کے داعیانِ اصلاح نے اختیار کیے... جب یورپ کے تمدن کا ہوشربا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بے نقاب ہوا تو دو مختلف اثرات دو مختلف جماعتوں پر مرتب ہوئے۔ غالب جماعت نے تو اپنی غفلت اور جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیر کی طرف نظر ہی نہ اٹھائی لیکن ایک جماعت ارباب بینش و خبر کی بھی تھی جس نے فوراً تغیر احوال محسوس کیا... لیکن مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا ہو گئے۔ ہندوستان میں سر سید احمد خاں.... ترکی میں سلطان محمود خاں، مصر میں محمد علی پاشا، تیونس میں خیر الدین صاحب اقوام المسالک اور بیرم تیونسی صاحب صفوۃ الاخبار اسی گروہ میں محسوب ہیں..... دوسرا مذہب اصلاح سیاسی تھا .... ممالک اسلامیہ میں اس مذہب اصلاح کے سب سے بڑے داعی سید جمال الدین اسدآبادی اور ترکی میں مدحت پاشا تھے۔"

اس عالمی خاکے میں غالب مختلف اور متضاد انداز ہائے فکر کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ کبھی تغیر کی طرف آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ کبھی تقلید کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ کبھی نئے رجحانات و افکار کی مدح و ستایش میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔

اس دور کے ہندوستان کے علمی اور مذہبی ماحول پر نظر ڈالی جائے تو ہر طریقہ فکر اور

ہر انداز اصلاح و عمل کے داعیان سرگرم عمل نظر آئیں گے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے گھرانے نے کھل کر مقابلہ و مقاومت کی راہ اختیار کی، جہاد و دارالحرب کے فتوے دیے اور میدان عمل میں کود پڑے۔ شاہ غلام علیؒ کے گھرانے نے انگریزی ملازمت کو ناجائز قرار دیا اور سر سید کی نذر کو جو انھوں نے سرکاری ملازمت قبول کرنے کے بعد پیش کی تھی، قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شاہ عبدالغنی مہاجر مدنیؒ نے مفتی صدرالدین آزردہ کے بھیجے ہوئے روپیہ اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ ان کی صدرالصدوری کی تنخواہ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ شاہ احمد سعیدؒ نے جہاد کی کھلم کھلا تلقین کی اور جب حالات ناقابل برداشت ہوئے تو ہجرت کر کے حجاز چلے گئے، شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کا خاندان بازار خانم میں رہتا تھا۔ اس علاقہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے باعث اس طرح برباد کیا گیا کہ نشان تک باقی نہ رہا۔ خواجہ میر درد کے خاندان اور میاں نصیرالدین عرف کالے صاحب نے خاموشی اختیار کی۔ غالب کا یہ کہنا کہ وہ کالے کی قید سے نکل کر گوروں کی قید میں آ گئے، مذاقیہ انداز میں ہو، لیکن ایک دردناک حقیقت کا اظہار تھا۔ مولانا مملوک العلی نے درس و تدریس کے ذریعہ اصلاح حال کی کوشش کی۔ اس عہد کے تمام علمی مراکز نے انکے سایہ میں پرورش پائی۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے بانی سر سیدؒ، اور دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسمؒ اور مظاہر العلوم سہارنپور کے علما و مدرسین ان ہی کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ ان کے شاگردوں نے قدیم و جدید دونوں علوم کی طرف توجہ کی۔

دہلی سے باہر مشاہیر علما و مشائخ نے جن میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے کھل کر برطانوی اقتدار کا مقابلہ کیا اور جب حالات نے بے بس کر دیا تو مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ ایک ایسے دور میں جب ہر ذی ہوش انسان اپنے مستقبل سے ناامید یا اسکے لیے متفکر تھا اور اپنے لیے راہ عمل کی تلاش کر رہا تھا، غالب کا معاملہ کہہ گیم دگہہ خندم کا

لیا۔ انھوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال پر آنسو بھی بہائے لیکن چھپ کر، انھوں نے بہادر شاہ کے لیے سکہ کے شعر بھی لکھے لیکن ڈر کر، انھوں نے جیسا کہ خود نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کو ایک فارسی خط میں لکھا تھا "بظاہر آشنا" و "بہ باطن بیگانہ" کا معاملہ رکھا لیکن انھوں نے ایک شاعر کی تیز نگاہی کے ساتھ یہ محسوس کر لیا تھا کہ وقت کا قافلہ آگے بڑھ گیا ہے، اب ماضی کی بازیافت ممکن نہیں، چنانچہ انھوں نے دبے پاؤں اپنے احاطۂ فکر سے نکل کر حالات سے مصالحت کر لی۔ جس وقت لفٹنٹ گورنر کے سامنے، ایسی حالت میں سماعت اور بینائی دونوں جواب دے چکے تھے، زرافشاں کاغذ پہ یہ شعر لکھوا کر پیش کیا کہ

رسم است کہ مالکان تحریر آزاد کنند بندۂ پیر

تو زندگی کا وہ تضاد جو مدت العمر سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہا تھا اور باوجود کوشش ان کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا، بالکل ختم ہو گیا۔ لیکن اس تضاد سے کشمکش نے ان کی روح کو گھلا دیا۔ کہنے لگے ع

رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

غلام غوث بے خبر نے کیفیت مزاج پوچھی تو لکھا:

" (تم نے) میرا حال پوچھا۔ یہ پرسش حکم نشتر کا رکھتی ہے"

ذہنی اور قلبی کشمکش کا یہ دور غالب کی زندگی کا سب سے زیادہ تلخ تجربہ تھا۔ انکی بذلہ سنجی، آزادانہ روش اور شاعرانہ مزاج نے ان کے زخم دل کو بے نقاب نہ ہونے دیا۔ کسی نے زمانہ سازی کا طعنہ دیا، کسی نے انگریز کی خوشامد کا الزام لگایا۔ انکو مجبوراً کہنا پڑا ع

واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے

اس سیاسی اور سماجی تبدیلی نے ہندوستان میں جو فکری انقلاب پیدا کیا تھا اس کا اظہار دو طریقوں سے ہوا۔ ایک جہاد سے، دوسرا اجتہاد سے اور حقیقت یہ ہے کہ عہد غالب کے سامنے فکری اور تہذیبی مسائل ان ہی دو کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک نے مسائل کا عملی اور دوسرے نے فکری حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

عملی میدان میں سید احمد شہیدؒ اس دور کی مرکزی شخصیت تھے۔ انھوں نے جہاد کا جو نعرہ بلند کیا تھا اس سے سارا ہندوستان گونج اٹھا تھا۔ بنگال میں فرائضیوں نے جو خود ایک منزل پر سید شہیدؒ کی تحریک سے منسلک ہو گئے تھے، "الارض للہ" (زمین خدا کی ملکیت ہے) اور "ہندوستان دارالحرب ہے" کی آواز اٹھائی۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ سید شہیدؒ کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی تھی۔ مومن جیسا شاعر جو کوچۂ رقیب میں سر کے بل چلتا تھا، پکار اٹھا تھا۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے سید احمد شہیدؒ کے ان مکتوبات کی طرف توجہ دلائی ہے جن میں راجہ گوالیار ہندو راؤ کو تحریک آزادی میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی اور لکھا تھا:

"بر رائے عالی روشن و مبرہن است کہ بیگانگان بعید الوطن ملوک زمین و زمن گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ امارت امرائے کبار و ریاست رؤسائے والی مقدار برباد نمودہ اند و عزت و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ"

ساتھ ہی ساتھ وہ مسلمانوں کی دینی اور سماجی زندگی میں اصلاح کے لیے کوشاں تھے۔

انھوں نے اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کتنی ہی کمزوریوں پر انگلی رکھی اور اصلاح کے لیے پُر خلوص جد و جہد شروع کر دی۔ حالی کا بیان ہے:

"مسلمانوں میں ظاہراً دو شخصیتیں ایسی ہیں کہ دونوں دلی کی خاک سے اٹھیں، کسی نے سوشل ریفارم پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسمٰعیل، دوسرے سید احمد خاں"

خود سرسید نے مولانا شہیدؒ کے جذبۂ حق گوئی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور سید احمد شہیدؒ کا حال لکھتے ہوئے تو آثار الصنادید میں ان کا قلم وجد میں آگیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماں سے ملی ہوئی عقیدت ان کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک میں اس دور کی تمام تحریکیں ضم ہو گئی تھیں فرائضی، وہابی، اہلِ حدیث وغیرہ وغیرہ۔ حد یہ ہے کہ ٹیپو سلطان کے خاندان کے بچے ہوئے افراد جو کلکتہ میں مقیم تھے وہ بھی ان کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہو گئے تھے سرسید کا بیان ہے کہ بالا کوٹ کی جنگ کے دس پندرہ سال تک مجاہدین کے قافلے پہاڑوں کی طرف جاتے نظر آتے تھے۔ ہندوستان میں شاید ہی کسی مذہبی تحریک نے اتنا زبردست اثر انسانی ذہنوں پر ڈالا ہو۔

۱۸۵۷ء تک انگریزوں نے مصلحتاً سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو نظر انداز کیا لیکن ۱۸۵۷ء میں جب جماعتِ مجاہدین کو پیش پیش پایا تو ان کو "وہابی" کا لقب دے کر ان کی غارت گری پر اتر آئے۔ سرسید نے انگریزوں کی انتقامی آگ کو بجھانے کے لئے وہابیوں اور ان کے مسلک کی مختلف توجیہیں کیں اور خود اپنے آپ کو "وہابی اور نیم چڑھا" کہہ کر حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔

غالب کے یہاں اس تحریک کا کوئی ذکر نہیں ملتا حالانکہ جس دلی میں وہ رہتے تھے

وہ جہاد کے نعروں سے پُر شور تھی۔ ان کی زندگی کے آخری سال تھے جب انبالہ اور پٹنہ کے تاریخی مقدمات سازش چلائے گئے تھے۔ ان مقدمات نے عوام کے جذبات میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ الدر المنثور میں مولانا عبدالرحیم نے اپنے چچا مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور دیگر مجاہدین کے حالات لکھے ہیں ۱۸۶۵ء میں عید کے دن ان کے مکانوں کو جس طرح مسمار کیا گیا، اس کا حال مولانا عبدالحمید نے ایک مثنوی میں لکھا ہے۔

چوں شب عید را سحر کردند ہمہ را از مکاں بدر کردند!
ضبط و تاراج جملہ مال و متاع اشتر و فیل و گاو و اشتر و اسپ
باغ را منازل دل چسپ آں بناہائے شامخ و محکم
کہ بہ گیتی بود عدیلش کم! اندراں خانہ طالباں چوں نجوم
روز و شب مشتغل بہ درس علوم جملہ دیوار و سقف و خانہ و در

بیل زن کردہ منہدم یکسر

غالب کی کسی نظم، کسی خط، کسی تحریر میں اس تحریک کا ذکر نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ مومن کے انتقال پر، جو اس تحریک جہاد کے زبردست داعی تھے۔ انھوں نے کہا تھا ؎

کافر باشم اگر بہ مرگ مومن چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

دہلی میں شاہ ولی اللہ محدثؒ کا گھرانا علمی، دینی اور سیاسی جد و جہد کا مرکز تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی مسند درس کی بادشاہت پورے ہندوستان پر پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کے "دارالحرب" ہونے کا فتویٰ دے کر مذہبی ذہن کو عملی جد و جہد کی طرف

لگا دیا تھا۔ مسجد اکبر آبادی میں جہاد کے درس دیے جاتے تھے، اسی بنا پر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اس مسجد کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے بھائی، عزیز اور شاگرد جن میں شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالغنیؒ، شاہ مخصوص اللہؒ، مولانا محمد اسحاقؒ، نواب قطب الدین خاںؒ وغیرہم شامل تھے، اپنے فضل و کمال میں بے مثال تھے اور ان کی موجودگی نے دلی کی علمی فضا کو انحطاط کے دور میں بھی چار چاند لگا دیے تھے۔

بقول میرؔ ؎

دل و دلی گرچہ دو نوں ہیں خراب ... پہ کچھ لطف اس اجڑے نگر میں بھی ہے

غالب کے یہاں خاندان ولی اللہی کی ان عظیم المرتبت شخصیتوں سے تعلق کے اشارے نہیں ملتے۔ مثنوی ششم میں ایک مقام پر صرف اتنا لکھا ہے یا لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں

مولوی معنوی عبدالعزیز ... واں رفیع الدین دو دانش منہ
شاہ عبدالقادر دانش سگال ... کایں دو تن را بود در گوہر جمال

اس خاندان سے کسب فیض کرنے والوں میں دو عالم مفتی صدرالدین آزردہؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادیؒ غالب کے خاص دوستوں میں تھے۔ ہر چند کہ خاندان ولی اللہی کا ذکر نہ ہونا تعجب خیز ہے لیکن یہ گمان صحیح نہ ہوگا کہ غالب شاہ صاحبؒ کے علمی مقام سے ناواقف تھے۔ حالی کا بیان ہے کہ مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ ایک بار نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے شاہ ولی اللہؒ کا کوئی رسالہ مفہوم سمجھنے کے لیے پیش کیا۔ غالب نے اس کا مطلب ایسا خوبی سے سمجھایا کہ بقول حالی شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے۔

تصور جہاد انگریزی سامراج کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ اس کو باطل قرار

دینے والوں کو دھرنے بنانے کے بعد مختلف نوعیت کی تدابیر کی گئیں۔ اسی سلسلہ کی حمایت میں شیعوں کو کھلی [illegible] کی دعوت دی تھی۔ غالب کے عزیز ترین دوست مولانا فضل حق خیرآبادی نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ الثورۃ الہندیہ میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کے دردناک حالات بیان کیے ہیں۔ وہ انڈمان میں نظربند کر دیے گئے تھے۔ غالب پر اپنے دوست کے مصائب کا کیا اثر ہوا اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ آزردہ نے جہاد کے فتویٰ پر دستخط تو کر دیے لیکن نام کے آگے بالجبر لکھ دیا۔ دستخط کرانے والوں نے الخیر سمجھا۔ بعد کو انھوں نے انگریزوں کے سامنے اس کو الجبر بتا کر اپنی جان بچائی۔ لیکن ان کا زخمی احساس پکارتا رہا ہے

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے   سر ہے اور جوش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جان پہ بن جاتی ہے   مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

قتل اس طرح بے جرم جو صہبائی ہو

غالب نے اس طرح آہ وزاری نہیں کی۔

تلقین جہاد کے دو پہلو تھے۔ ایک نئے حالات میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید اور دوسرے ائمہ مذاہب کی قطعیت سے انکار۔ برطانوی اقتدار کے قیام اور نئی تہذیبی قدروں کے تصادم نے علماء کو ازسرنو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر اس دور کے فتاویٰ کے مجموعے دیکھے جائیں تو اندازہ ہوگا کہ کس کس طرح یہ مسائل ابھر کر سامنے آرہے تھے: مثال کے طور پر اگر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (۱۸۴۸ - ۱۸۸۶) کے فتاویٰ پیش نظر ہوں تو معاملہ کی نوعیت واضح ہو جائے گی۔ کیا چلتی ہوئی گاڑی میں نماز ادا ہو سکتی ہے؟ (ج ۱ ص ۲۹)؛ کیا

رویت ہلال کی شہادت تار کے ذریعہ دی جا سکتی ہے؟ (ج ۱ ص ۷۰)، کیا سگار اور سگریٹ کا پینا جائز ہے؟ (ج ۱ ص ۸۰)؛ کیا ایسی انگریزی دواؤں کا استعمال جائز ہے جن میں کوئی مشکوک جزو شیلی دوا کا ہو؟ (ج ۱ ص ۳۲۹)؛ کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟ (ج ۱ ص ۱۶۱-۱۶۰)؛ کیا انگریزی تعلیم جائز ہے؟ (ج ۱ ص ۳۳۵)؛ کیا فیکٹری میں بنا ہوا کپڑا پہننا جائز ہے؟ (ج ۲ ص ۵۱-۵۰)؛ کیا اسٹامپ فیس کا ادا کرنا اور بعد کامیابی مقدمہ واپس وصول کرنا جائز ہے؟ (ج ۲ ص ۳۴۲)؛ کیا پنشن قبول کرنا جائز ہے؟ (ج ۳ ص ۱۱۲)۔ یہ اور ایسے بے شمار مسائل تھے جن کو مجتہدانہ فکر کے سہارے ہی حل کیا جا سکتا تھا!

اجتہادی فکر کی ضرورت اور نوعیت کا اظہار مختلف انداز سے ہوا: (۱) سرسید نے سائنس اور مذہب کے درمیان تطبیق کی کوشش کی۔ (۲) اہل حدیث نے جو غیر مقلد کہلائے، مذاہب اربعہ سے تعلق منقطع کیا اور ایک نوع کی فکری آزادی اختیار کی، لیکن مذہب کے متعینہ حدود کے اندر رہ کر۔ (۳) اہل قرآن نے فقہی مذاہب کے ساتھ ساتھ حدیث کی قطعیت کو بھی ماننے سے گریز کیا۔ (۴) پھر ایک طبقہ ایسا بھی سرگرم عمل ہوا جو صرف تقلید کو فلاح کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ان کے اعتقاد و عمل کا آئینہ دار اقبال کا یہ شعر ہے ؎

ملت از تقلید می گیرد ثبات مضمحل گردد چو تقویم حیات

ان سب طریقہ ہائے فکر نے مذہبی اعمال اور اعتقادات پر اثر ڈالا۔

سرسید نے جس خلیج کو پُر کرنے کی کوشش کی تھی وہ تاریخ عالم کا ایک خاصہ تھا جب بھی مذہب اور سائنس مخالفانہ روبرو آئے ہیں اس مخالفت کو دور کرنے کی جدوجہد کی گئی ہے۔ یورپ میں معرکۂ دین و سائنس برپا ہوا لیکن جلد ہی ختم ہو گیا۔ ہندوستان

میں یہ میدان کافی عرصہ بعد سجا اور مدتوں تک جنگ جاری رہی۔ سرسید نے اس خلیج کو پُر کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ وقت گزرنے کے ساتھ غیر ضروری ہو گئی اور مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اس طرزِ فکر کو مسترد کر دیا اس لیے کہ مذہبی فکر اب معرکۂ دین و سائنس سے نکل کر نئے میدانوں میں داخل ہو چکی تھی۔

مغربی سائنس کی جانب ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن سترہویں صدی میں مائل نظر آتا تھا۔ دانش مند خاں کے یہاں فرانسیسی ڈاکٹر سائنس کے تجربات کرتے تھے۔ فرانسیسی کتابوں کے ترجموں کی کوشش بھی کی جاتی تھی لیکن انیسویں صدی میں سائنس اور مغربی علوم کی طرف ایک مخالفانہ رویہ ابھر آیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مغربی علوم انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے جلو میں آرہے تھے۔ صنعتی انقلاب نے زندگی کا نقشہ جس طرح بدل دیا تھا اس کا سب سے پہلے ٹیپو سلطان کو احساس ہوا۔ اس نے مغربی طرز پر فوج کی تنظیم کرنی چاہی، بحری بیڑے تیار کیے، بیرونی ممالک میں تجارتی منڈیوں کے قیام کی تدابیر سوچیں اور سائنس کی ایجادات سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس جد و جہد میں تنہا رہ گیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک اس طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ غالب کا سائنس کی طرف رویہ آئین اکبری کی تقریظ سے ظاہر ہے۔ آئین اکبری کی اہمیت سے ان کا انکار بے معنی تھا لیکن بقول مولانا آزاد ان کے استدلال سے جدید فنون کے علم و اعتراف کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اجتہادی فکر کا دوسرا مظہر وہابی علماء اور مجاہدین تھے۔ انھوں نے اتباعِ شریعت پر زور دیا اور سماجی اصلاح کی مختلف تدابیر اختیار کیں۔ نکاحِ بیوگان کی تحریک شروع کی اور غلط رسوم کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ مولانا حالی اس

اندازِ فکر سے متاثر ہو گئے تھے۔ انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں ایک رسالہ لکھا تھا اور اتباعِ شریعت کی طرف غالب کی توجہ مبذول کرانے کی بھی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ نماز پنج گانہ کی پابندی کریں۔ کھڑے ہو کر نہ ہو سکے تو بیٹھ کر، وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سے۔ غالب کا ان دنوں یہ حال تھا کہ "سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر"۔ حالی نے اپنی درخواست لکھ کر پیش کی۔ غالب کی طبیعت نے جو رسم و تقلید کی تمام بندشوں سے آزاد ہو چکی تھی۔ چند اشعار میں بات کو ٹال دیا اور اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔

غالب، جہاد و اجتہاد کی کسی تحریک سے متاثر نہیں ہوئے۔ نواب صدیق حسن خاں نے فارسی نثر کی کچھ عبارتیں ان سے پڑھی تھیں۔ انھوں نے شاگردی کے تعلق کو نبھایا اور دو موقعوں پر ان کی مدد کی۔ ایک اس وقت جب جوئے کے مقدمے میں وہ پھنسے تو شیفتہ نے نواب صدیق حسن خاں کی مدد سے ان کی رہائی کرائی۔ دوسرے جب خود شیفتہ گرفتار ہوئے تو غالب نے نواب صدیق حسن خاں کو لکھ کر ان سے مدد کرائی۔ بایں ہمہ غالب نے ان سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھا۔ ان کے بڑے بھائی سید احمد حسن قنوجی نے خط لکھا تو ان کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور ایک جملہ بڑا پر معنی لکھا۔

"نامہ نگار کا حال بر سبیل اجمال یہ ہے کہ سیاست سے محفوظ رہا ہوں اور حکام کی عنایت سے محظوظ رہا ہوں۔"

ایک ایسے دور میں جب جہاد و ارتداد کے تصورات مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے حکمرانِ سیاست نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کو ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے جن کا زندگی اور مسائلِ زندگی سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں

شروانی مرحوم کا بیان ہے کہ انگریز حکام اس زمانہ میں خود مذہبی اختلافات پیدا کرکے مختلف گروہوں میں تصادم کا سامان مہیا کرتے تھے۔ اقبال نے اسی صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

ابن مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے؟ ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات؟
آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
تم اُسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے تا بساط زندگی میں اسکے سب مہرے ہوں مات؟

امتناع نظیر خاتم النبین، امکان کذب، رفع یدین، استمداد و توسل، آمین بالجہر وغیرہ مسائل جن پر اس زمانہ میں کافی بحث و مباحثے ہوئے اور مولانا فضل حق خیرآبادی بھی نہ صرف ان میں پھنس گئے بلکہ غالب کو بھی اس میں گھسیٹنے کی کوشش کی۔ غالب نے دوستی کا حق نبھایا۔ لیکن اس بحث میں دور تک نہیں گئے۔ برطانوی سیاست نے ذہن کو جہاد اور دارالحرب سے ہٹا کر ان مسائل میں ایسا الجھایا کہ مدتوں ذہن ان سے باہر نہ نکل پائے۔ عید میلاد النبیؐ کو غالب نے "دلکش و جان پرور" کہا اور عرسوں کی اجتماعی حیثیت کے متعلق لکھا۔

گرچہ ترویج روح اولیاء است در حقیقت آں ہم از بہر خدا است

غالب کا دل عشق رسولؐ سے بھرا ہوا تھا۔ ان کا یہ شعر ؎

ہر کجا ہنگامہ عالم بود رحمۃ اللعالمینے ہم بود

اقبال کے دل پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوا کہ وہ بے اختیار پکار اٹھے ؎

نالۂ کو خیزد از سوز جگر ہر کجا تاثیر او دیدم دگر

قمری اند تا شیر او و اسوختہ   بلبل از وے رنگہا اندوختہ

غالب نے اس شعر میں ایک قرآنی ارشاد کو کس عقیدت سے پیش کر دیا ہے۔

ہر کس قسم بانچہ عزیز است می خورد   سوگند کردگار بجان محمد است

غالب کو تصوف سے دلچسپی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ اخلاق انسانی کی اصلاح و تربیت کا ایک عظیم الشان لائحہ عمل تھا بلکہ اس لیے کہ ان کی آزادیٔ فکر کو اس سے کچھ تقویت پہونچی تھی گو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی دکھتی ہوئی کمر تصوف کی دیوار سے لگا لیتے تھے۔ لیکن اس میں بھی ان کو اپنے درد کا درماں نہ ملا۔ وہ صرف اس حد تک تصوف کے حامی تھے جہاں تک ان کی آزادیٔ فکر و عمل پر اثر انداز نہ ہو۔ انھوں نے اپنے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروف کے ساتھ جو پیری مریدی بھی کرتے تھے، شجرہ کے سلسلہ میں جو مذاق کیا تھا اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالب کی آزادیٔ طبع تصوف کی عائد کردہ پابندیوں یا رسوم کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ نہ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کے قائل تھے، نہ خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات کے۔ انھوں نے دنیا کو صرف معاشی عینک سے دیکھنا چاہا۔ ایک موقع پر کہتے ہیں۔

در عالم بے زری کہ تلخ است حیات   طاعت نتواں کرد بامید نجات

اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰۃ   بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ

یوم حساب اپنی بے زری کو شراب نوشی کا جواز بنا کر داور محشر کے سامنے اس طرح لب کشا ہوتے ہیں :

حسابے ورامش و رنگ و بو   ز جمشید و بہرام و پرویز جو

یکے از بادہ تا چہرہ افروختند　　دل دشمن و چشم بد سوختند

نہ از من کہ از ناب مے گاہ گاہ　　بدریوزہ رخ کردہ با شمع سیاہ

جہاں از گل ولالہ و بو و رنگ　　من و حجرہ و دامنے زیر سنگ

شراب نوشی کا سبب کہیں افراطِ زر اور افزونی عیش ونشاط ہوتا ہے تو کہیں غربت، بے زری، بدحالی اور غمِ روزگار بھی اس کوچہ میں لے جاتا ہے۔ ایک بار قرض خواہوں نے غالب پر مقدمہ دائر کر دیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ کی عدالت میں پیشی ہوئی۔ غالب نے یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آزردہ مسکرا دیے اور اپنے پاس سے انکے قرضے کا روپیہ ادا کر دیا۔

غالب زندگی کی سب سے بڑی حقیقت معاشی مسئلہ کو سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ معاشی زبوں حالی اس وقت اپنی آخری منزل پر پہونچی ہوئی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ پہلے مسلمان مفکر تھے۔ جس نے سلطنت مغلیہ کے زوال کے معاشی اسباب تلاش کیے تھے۔ میرؔ نے عوام کی بے بسی کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

اب خرابہ ہوا جہان آباد　　ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

بے زری کا نہ کر گلہ غافل　　رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اس دور میں لکھے گئے شہر آشوب سماج کے ہر طبقہ کی غربت، بے بسی اور بدحالی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شہزادے جن کو "سلاطین" کہا جاتا تھا، چھتوں پر چڑھ کر آوازیں لگاتے تھے، "ہم بھوکے مرتے ہیں" ہم بھوکے مرتے ہیں"۔ غالب نے پنشن و عطیات کے سہارے اپنی زندگی تو کسی طرح گزار دی، گو اسمیں بھی

بعض اوقات جوئے کی سرپرستی جیسے ذرایع آمدنی کی مدد لینی پڑی، لیکن معاشی حالات کی تبدیلی اور بدحالی ان کے لیے عذاب جان بن گئی۔ انھوں نے نئے نظام کو برا نہیں کہا، حالات اور زمانہ اس کی اجازت نہ دیتے تھے لیکن ان کی پوری زندگی اس پر تنقید تھی۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ زمانہ کی بے مہریوں سے بے بس ہو کر غالب نے "اپنی قدیم سرگرانیاں تقریباً بھلا دی تھیں اور رعام مداحیوں پر اتر آئے تھے"۔

غالب کی دلی علم و ادب کا گہوارہ تھی۔ علماء و امراء کے دیوان خانے علمی سرگرمیوں کے خصوصی مرکز تھے۔ امام بخش صہبائی، صدر الدین آزردہ، نواب ضیاء الدین خاں نیر درخشاں، حکیم مومن خاں مومن، مصطفٰی خاں شیفتہ، شاہ نصیر الدین نصیر کی محفلیں ایسی تھیں کہ بقول مولانا حکیم سید عبد الحئی مرحوم

"جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا"

غالب نے لکھا تھا۔

ہند را خوش نفسانند سخنور کہ بود | باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر، صہبائی، و علوی و انگاہ | حسرتی، اشرف، و آزردہ بود اعظم شاں

آزردہ کو مولانا حکیم سید عبد الحئی مرحوم نے "سرمایہ نازش ہندوستان" بتایا ہے۔ مولانا آزاد کے والد کی رائے تھی کہ "ادب عربی کا ذوق ان سے بڑھ کر وقت کے کسی فاضل میں" نہیں دیکھا گیا۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ آزردہ ہی نے غالب کو "طرز بیدل" سے ہٹایا۔ انھوں نے ۱۸۴۲ء میں غالب کو دلی کالج میں فارسی کے مدرس کی جگہ پیش کرائی تھی۔

سرسید اور مولانا آزاد کے والد جب دہلی کے دیوان خانوں کی علمی فضا کو یاد

کرتے تھے تو ان کی آنکھیں پُر نم ہو جاتی تھیں۔ ان کے خاتمے نے غالب کی ادبی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ مکتوبات سے صاف ظاہر ہے کہ غالب جس بحث میں جم کر حصہ لیتے تھے وہ زبان و ادب سے متعلق ہوتی تھی۔ جب زبان سے متعلق کوئی مسئلہ سامنے آتا تو ان کا علم پوری طرح حاضر نظر آتا۔ غالب نے فارسی زبان و ادب کی رفتار پر پوری نظر رکھی۔ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا صحیح مذاق ختم ہو چکا تھا، مرزا مظہر جان جاناں کے خریطۂ جواہر نے دوبارہ پیدا کیا۔ غالب نے ہندوستان کے فارسی شعراء کو اپنے ادبی اعلیٰ معیار پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ امیر خسروؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" ہندوستان کے سخن وروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی اُستاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی وہم طرح سعدی شیرازی ہے"

وہ خود کو بہادر شاہ ظفر کا امیر خسرو سمجھتے تھے ؎

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب ۔۔۔ نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

وہ فیضی، ناصر علی، بیدل اور غنیمت کو کسی شمار میں نہیں لاتے تھے۔ شبلیؒ اور اقبال کی فارسی شاعری غالب کی قائم کی ہوئی روایات کو ایک خراج تحسین ہے۔

غالب اپنے سماجی نظریات اور وسیع المشربی میں مغلیہ دور کی تہذیب کے بہترین ترجمان تھے۔ جن فکری اور قلبی محرکات نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی پرورش کی تھی وہ غالب کی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ ان کے ہندو دوستوں اور تلامذہ کی کثیر تعداد تھی جو ان کو اتنے ہی عزیز تھے جتنے مسلمان شاگرد۔ مرزا ہرگوپال تفتہ، پیارے لال آشوب،

جواہر سنگھ جوہر، منشی ہیرا سنگھ وغیرہ کے نام ان کے خطوط خلوص، محبت اور یگانگی کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ مثنوی سیوم میں جس طرح بنارس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی فضا کو "بہشت خرم فردوس معمور" ٹھہراتے ہیں وہ ان ہی جذبات کی عکاسی کرتا ہے جن کے تحت حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے کہا تھا ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اگر غالب کی پوری زندگی اور ان کی ذہنی اور قلبی کیفیات پر نظر ہو تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ قدیم وجدید کی کشمکش ان کے پیکر میں کچھ عجیب انداز سے رونما ہوئی اور انکی شخصیت کی بنیادی حقیقتوں کو متاثر کیے بغیر گزر گئی۔ گویا قسام ازل نے جب ہندوستان کی تہذیبی اور سیاسی بساط کو الٹنے کا فیصلہ کیا تو غالب کے کان میں کہدیا تھا۔ ؎

چوں عکس پل بسیل، بذوق بلا برقص

جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

اُردو نعت گوئی کے موضوعات

از

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف میں سب سے پہلے لفظ "نعت" کا استعمال غالباً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہاں ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:۔

من رآه بداهة هابه	جس نے یکایک آپ کو دیکھا وہ ہیبت زدہ
ومن خالطه احبه يقول	ہو گیا اور جو آپ سے ملا وہ آپ کا گرویدہ
ناعته لم ار قبله ولا	ہوا۔ آپ کا وصف کرنے والا یہی کہتا
بعده مثله صلى الله عليه	ہے کہ آپ سے پہلے نہ آپ جیسا دیکھا
وسلم (شمائل ترمذی)	اور نہ آپ کے بعد آپ جیسا دیکھوں گا۔

نعت میں دراصل محض پیکرِ نبوت کے صوری محاسن کا بیان یا حضورؐ سے رسمی عقیدت کا اظہار ہی نہیں ہوتا، بلکہ ہر وہ شعر نعت کے دائرے میں آجاتا ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہو یا آپؐ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ خطاب ہو اور جس کا تاثر ہمیں آپؐ کی ذاتِ گرامی سے قریب کر دے۔

حضورؐ کی نعت کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن حکیم ہے جو خود آنحضرتؐ پر بصورتِ وحی کم و بیش ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا۔ اسی لیے ام المومنین حضرت عائشہؓ نے خلقِ محمدی کی

تعریف میں "خلقہ القرآن" کہہ کر ساری کتاب آسمانی کو نعت کے موضوع سے جوڑ دیا تھا۔

قرآن حکیم میں مختلف طریقوں سے آپؐ کی تعریف و توصیف بیان ہوئی ہے جن کے ذریعہ آپؐ کی بشریت، عبدیت، رسالت، اسوۂ حسنہ، نورانیت اور فضیلت وغیرہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	اے محمدؐ! کہو کہ میں تو تم جیسا ایک انسان
يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ	ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ
وَّاحِدٌ (الکہف ۱۱۰)	تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔

کہہ کر کبھی تو حضورؐ کی بشریت کا اظہار کیا۔ اور

رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الانشراح ۴)	ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کیا۔

میں آپؐ کی بزرگی و برتری ثابت کر دی۔ پھر آپؐ کے طریقے کو ہی فلاح کا ضامن قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ	بے شک تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب آیت ۲۱)	علیہ وسلم کے طریقے میں اچھا نمونہ ہے۔

اور

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران آیت ۳۱) کہہ کر صاف صاف بتلا دیا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرنے لگے تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ کہیں یوں کہا گیا کہ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (سورہ النساء ۸۰) دوسری جگہ فرمایا کہ:۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا	بے شک ہم نے آپؐ کو حق کے ساتھ

وَّنَذِيْرًا (البقرہ ۱۱۹) بھیجا خوشخبری اور ڈر سنانے والا۔

کبھی آپؐ کو یٰسین و طٰہٰ کہہ کر مخاطب کیا گیا تو کبھی مزمل و مدثر کہہ کر۔ قرآن میں کہیں النبی الامی تو کہیں رحمۃ اللعٰلمین اور کہیں شاہداً و بشیراً جیسی صفات کا بیان ہے کہیں یہ حکم دیا گیا کہ:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ	تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے درود
عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	بھیجتے ہیں اس نبیؐ پر اے ایمان والو تم
صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا	درود بھیجو۔

(احزاب ۵۶)

پھر اللہ نے اپنی عنایات کی بارش آپؐ پر کی اور حضورؐ پر اپنی حجت تمام کر دی۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۳)

اس کے بعد ایک نظر احادیث پر بھی ڈال لیں۔ بعض احادیث میں آپؐ نے خود اپنے مرتبے کو بیان فرما دیا ہے۔ مثلاً حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے کہ:۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ	حضورؐ نے فرمایا۔" لوگ جب اٹھائے
علیہ وسلم انا اول الناس	جائیں گے تو میں پہلا شخص ہوں گا۔
خروجا اذا بعثوا وانا خطیبھم	اور جب وفد بنا کر پیش ہوں گے تو
اذا وفدوا وانا مبشرھم	میں ان کی ترجمانی کروں گا اور میں
اذا ایسوا لواء الحمد یومئذ بیدی	ان کو بشارت دوں گا، جب وہ
وانا اکرم ولد آدم علی ربی	ناامید ہوں گے اس دن میرے
ولا فخر (الترمذی۔ باب المناقب ص۲۰)	قبضے میں حمد کا پرچم ہوگا اور میں

اپنے پروردگار کے نزدیک اولاد
آدم میں سب سے زیادہ مکرم ہونگا
اور یہ فخر نہیں ہے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے آپؐ کے جو اوصاف بیان کیے ہیں احادیث کے باب المناقب میں درج ہیں۔ حضرت علیؓ کا جو قول اوپر گذر چکا ہے وہ نعتیہ مضمون کا عمدہ نمونہ ہے۔ مناقب کے باب میں اس طرح کے کئی تعریفی کلمات آپؐ کی شان مبارک میں بیان ہوئے ہیں۔ ترمذی نے "شمائل" کے عنوان سے ایک الگ باب قائم کیا ہے۔ جس میں حضورؐ کے سراپا کا بیان ہے اور آپؐ کے تواضع اخلاق، مذاق، عبادات اور بسر اوقات وغیرہ تمام کیفیات و طریقہ ہائے حیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صحابہؓ کرام اور تابعینؒ عظام کی طرف سے تدوین احادیث کے لیے کی جانے والی کاوشیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و وارفتگی اور جذبۂ عشق صادق کا نادر نمونہ ہیں۔ آپؐ سے اسی طرح کے قلبی لگاؤ اور محبت و انسیت کی ترجمانی کے لیے بعض حضرات نے شاعری کا سہارا لیا اور عربی میں "المدائح النبویۃ" کے عنوان سے ایک نئی صنف شاعری کو وجود بخشا، جس کا وافر ذخیرہ عربی شعری سرمایے میں اضافہ کا باعث ہوا ہے۔ شیخ یوسف بن اسمٰعیل النبہانی نے ۱۳۲۰ھ میں "المجموعۃ النبہانیہ فی المدائح النبویۃ" کے نام سے چار جلدوں میں عربی نعتوں کو جمع کیا ہے[1]۔ عربی زبان کے بعد بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

"فارسی زبان کا قدم اس وادیٔ ایمن کی رہ نوردی میں سب سے آگے رہا ہے"[2]

یہاں ان دونوں زبانوں کی نعتیہ شاعری کی تاریخ سے صرف نظر کرکے اردو

نعتیہ شاعری کے موضوعات پر اظہار خیال کرنا مقصود ہے۔ اردو کے نعت گو شعراء نے دوسری اصناف کی طرح اس صنف میں بھی عربی۔ فارسی کے نمونوں کو اپنے پیش نظر رکھا لیکن عام اصناف کی طرح جابجا عرب و ایران کی روایات سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں لکھی ہیں۔ اردو کے نعتیہ اثاثہ کو مختلف موضوعات کے دائرے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) خالص نعت (۲) مولود نامے (۳) نور نامے (۴) معراج نامے (۵) وفات نامے

(۶) اسرائیلیات (۷) ضمنیات وغیرہ۔

(۱) نعت خالص نعت خالص سے مراد وہ نعتیہ کلام ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اوصاف کا بیان ہو، جو محامد و محاسن اور تعریف و توصیف کی حد تک ہی محدود ہو۔ اردو کے ایسے نعتیہ ذخیرہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور کئی کتابیں بھی اس ضمن میں موجود ہیں لیکن واقعات رسولؐ کو نعت کے جن موضوعات کے ذیل میں قلم بند کیا گیا ہے یہاں اسی کا تذکرہ مقصود ہے۔ اس ضمن میں ولادت رسولؐ کو موضوع بنا کر لکھی گئی نعتیں "میلاد نامہ" کے ذیل میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

(۲) میلاد نامے مولود ناموں کی روایت اردو میں بہت قدیم ہے۔ عربی۔ فارسی سے ہوتی ہوئی یہ روایت اردو ادب تک پہنچی۔ ذکر مولود پر سب سے پہلی کتاب ابوالخطاب عمر بن حسن بن وحیہ کلبی اندلیسی نے لکھی تھی۔ ابن خلکان اس کتاب کا نام "التنویر فی مولد السراج المنیر" بتاتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ اُسے التنویر فی مولد البشیر والنذیر کہتے ہیں۔ اربل کے سلطان ابوسعید مظفر نے کتاب کے مصنف کو اس کے صلے میں ایک ہزار اشرفیاں بطور انعام دی تھیں۔ "تاریخ میلاد" کے مصنف نے "انوار ساطعہ" کے حوالے سے "مولود" کی چند اہم کتابوں کے نام گنوائے ہیں، جن میں (۱) حافظ

شمس الدین دمشقی کی "مورد الصادی فی مولد الہادی" (۲) محمد بن عثمان لولوی کی "الدر المنظم فی مولد النبی الاعظم" ابن جوزی کی "عرف التعریف فی مولد الشریف" اور مجد الدین قاموس کی "نفحات العنبریہ فی مولد خیر البریۃ" وغیرہ مشہور ہیں۔

نفس ذکر میلاد النبی کو بعض علمائے اسلام صرف باعث خیر و ثواب ہی نہیں بلکہ مستحب وسنت قرار دیتے ہیں غالباً اسی لیے اردو کے شعری سرمایے میں میلاد ناموں کی کثرت ہے اکثر شعرا نے خیر و برکت اور ثواب حاصل کرنے کے لیے میلاد نامے لکھے اور مجالس میں پڑھے جن کا احاطہ باعث طوالت ہوگا اس لیے صرف مشہور اور پختہ مشق شعرا کی تصانیف کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

اردو شاعری میں "ذکر میلاد النبی" کو سلطان محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کسی نے بھی مستقل طور پر منظوم نہیں کیا۔ محی الدین قادری زورؔ مرحوم، حدیقۃ السلاطین کے حوالے سے نقل کرتے ہیں :۔

"محمد قلی قطب شاہ عید میلاد النبی کی بزم آرائی اور آئین بندی فضائے دلکشائے میدان داد محل میں کیا کرتا تھا..... عید میلاد النبی کی آمد سے بہت قبل ہی صناع، ہنرمند اور استادان صنعت و حرفت دونوں عمارتوں کے سامنے (چاوڑی خانہ اور کوتوال خانہ) اپنے عجیب و غریب کمالات کی پیشکش میں مشغول ہو جاتے اور آخر کار جب روز مولود .....آجاتی تو کوسوں، دماموں، نقاروں، نفیریوں اور قرناؤں کی آوازوں سے میدان داد محل گونج اٹھتا ہے"

قلی قطب شاہ ہر یوم میلاد النبی کے موقع پر ایک نظم اسی موضوع پر لکھا کرتا تھا، اس کے کلیات میں ہمیں عید میلاد پہ چھ نظمیں اور ایک قصیدہ ملتا ہے۔ جن میں شاعر نے

میلاد النبیؐ کی عظمت بیان کی ہے۔

فرشتے سرگ ساتوکوں ستاریاں سوں سنوارتے ہیں | شہ دنیا و دیں کے تئیں عرش کرسی سنوارتے ہیں
مگر مولود ہے شہ کا عرش اوپر طبل کا بجے | مراداں پاؤ نے سارے جگت ہاتاں پسارتے ہیں

دوسری نظم میں شاعر نے "لولاک لما خلقت الافلاک" کی تصریح کی ہے شاعر کہتا ہے تمام دنوں میں اللہ نے اس دن کو فضیلت بخشی۔ یہ گنہ گاروں کی خلاصی کا دن ہے اور بہشتیوں کو اس دن نور کے لباس پہنائے جاتے ہیں۔ تیسری نظم میں اگرچہ ہندی الفاظ کی بہتات ہے لیکن شاعر نے صنائع بدائع کا وافر استعمال صرف اسی ایک نظم میں نہایت فراخدلی سے کیا ہے۔ صنعت تجسیم کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

خوش ہو خوشی ہنستی اہے، ہور عیش متوالا ہوا | عشرت لگیات ناچنے، آلاپ جب گایا نندھ

عیش کا متوالا ہونا، عشرت کا ناچنا اور خوشی کا خوش ہوکر ہنسنا وغیرہ انوکھے اور نئے خیالات ہیں اور یہ تمام الفاظ مسرت و خوشی کے مظہر ہیں۔ اسی موضوع پر قلی قطب شاہ کا قصیدہ بھی کافی طویل ہے۔ شاعر نے بعثت نبویؐ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ (م ۱۶۷۲ء) کے مختصر سے دیوان میں "مولود شریف" پر دو نظمیں ملتی ہیں۔ اول نظم بہاریہ عنصر لیے ہوئے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت چونکہ موسم بہار ہی میں ہوئی تھی اسی مناسبت سے شاعر نے اس نظم میں "جھاڑوں کے بوار نے" غنچوں کے چٹخنے، گلوں کے کھلنے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

جھلک ہو مولود کا بھی جگ میں آیا | جگت سب اس جھلک سے تے جگمگایا
منگن کرتے لگن ہو کر ہر اک جھاڑ | سورج ہور چاند تارے بار لیایا

اسی عہد میں علاقہ بھروچ کے ایک غیر معروف شاعر عبدالملک کے مولود نامے کا

تعارف ندوی مرحوم نے وضاحتی فہرست میں کرایا ہے۔ شاعر اپنی تصنیف کے ماخذ و مراجع احادیث نبوی کو بتاتا ہے، لیکن بالاستیعاب پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ موضوع احادیث کے سوا وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی حال فتاحی کی "مفید الیقین" کا ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بعثت اور معجزات منظوم کیے گئے ہیں۔ شاعر نے ان تمام روایات کو اس میلاد نامے میں شامل کر لیا ہے جن کا استعمال عموماً میلاد ناموں میں مستحسن قرار دیا جاتا ہے مثلاً حضرت آمنہؓ کو ایام حمل میں خوابوں کا دکھائی دینا اور نو ماہ تک متواتر نو پیغمبروں کا بشارت دینا وغیرہ اغلب ہے کہ یہ عقیدت میں غلو اور اسرائیلی اساطیر کا تتبع ہو۔ بہر کیف فتاحی کی "مفید الیقین" عجیب و غریب واقعات سے پُر ہے۔ مولانا شبلیؒ نے سیرت النبیؐ میں ایسی تمام موضوع، ضعیف روایات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے وضع و ضعف پر سے پردہ ہٹا دیا ہے۔

مولود رسولؐ پر دکنی شاعر مختار نے بھی ایک رسالہ ترتیب دیا تھا۔ صحت روایات کے اعتبار سے اگرچہ اس میں بھی ضعف ہے لیکن شعریت سے بھرپور ہے۔ مختار کی یہ مثنوی تقریباً ۲۷۰۰ اشعار پر محیط ہے۔ اسے مجلس میلاد میں ترنم سے پڑھا جا سکتا ہے۔ معجزات کے بیان میں مختار نے چند بیانات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر دیے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے مختار نے یہ کہلوا دیا کہ "میری وجہ سے ابراہیمؑ نے نار نمرود سے خلاصی پائی تھی۔" "نوحؑ طوفان سے محفوظ رہے تھے۔" وغیرہ۔ مختار نے "معجزۂ شق القمر"، "شہادت الحجر"، "انگشت مبارک سے پانی کا نکلنا" وغیرہ کئی روایات کو بھی تفصیلاً نظم کیے ہیں۔

شعرائے قدیم میں گودھرا (گجرات) کے شاعر امین کے "تولد نامہ" میں بھی ولادت سید مولیٰ کا ذکر ہے۔ یہ ڈھائی ہزار اشعار کی مثنوی شاعر کی کہنہ مشقی کا

پتہ دیتی ہے، لیکن جہاں تک مذہبی حیثیت کا تعلق ہے تو بقول ظہیر الدین مدنی "اس میں بہت غلط بیانی پائی جاتی ہے"[۴۸] اور پروفیسر نجیب اشرف نے صاف صاف کہدیا ہے۔

"تولد نامہ اپنے عہد کی اس موضوع کی مثنویوں میں متعدد حیثیت سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں اس میں جو واقعات بیان کیے ہیں وہ بڑی حد تک کرشن جی کی ولادت کے حالات کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ کی ابتدائی زندگی اور شادی سے متعلق بھی عجیب و غریب روایتیں بیان کی ہیں"[۴۹]

دکن کے ایک شاعر غوثی نے "قصص الانبیاء" کے عنوان سے تین دفتروں پر مشتمل ایک طویل مثنوی لکھی ہے، جس میں پیغمبروں کی سیرت اور حالات و کوائف بیان کیے ہیں۔ غوثی نے اس مثنوی کے تیسرے دفتر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، بعثت، معجزات وغیرہ کو نہایت تفصیل سے نظم کیا ہے۔ غوثی واقعات کو مسلسل اشعار میں گوندھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے اتنی طویل مثنوی کے تینوں دفتروں میں باہم ربط دکھائی دیتا ہے اور واقعات یکے بعد دیگرے قاری کے سامنے ابھرتے چلے جاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ منظوم کرنے میں شعرائے قدیم کے گل سرسبد محمد باقر آگاہ قادری بیجاپوری ثم ایلوری صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ "ھشت بہشت" جو منظوم سیرت پاک ہے، تقریباً ۹ ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک حصہ "من موہن" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر مبارک ہوا ہے۔ شاعر نے اسلامی روایات کے ساتھ اسرائیلی اساطیر کا بھی سہارا لیا ہے۔ لیکن ان کے برتنے میں وہ حد درجہ محتاط نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے دیگر

شعرائے کرام کی بہ نسبت ان کے یہاں تاریخی حقائق اور احادیث و نصوص کی وافر مقدار نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعض جگہ سہو و تسامح کی مثالیں بھی ملتی ہیں لیکن شاعر نے عوامی اعتقادات اور غلط مذہبی رجحانات کے پیش نظر ان کو اپنایا ہے۔ مثلاً استقرار حمل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آگاہ نے ایک مدرج بلکہ موضوع حدیث نقل کی ہے کہ "اسی شب فرشتوں نے شیطان کو مع اپنے تخت کے دریا میں ڈال دیا اور چالیس روز تک اس پر عذاب مسلط کیا گیا۔ اس کے ساتھیوں کے استفسار پر اس نے کہا کہ آج کی شب آمنہؓ کے شکم میں محمدؐ کا حمل قرار پایا ہے۔ جو خاتم المرسلین ہوں گے اور اولین و آخرین میں سب سے بہتر بھی ہوں گے" مثنوی میں بعض جگہ تاریخی سقم بھی در آئے ہیں مثلاً۔

نو مہینے ہوئے ہیں پورے جب	آمنہؓ کے اوپر بغیر تعب
بارویں کو ربیع کی اے یار	صبح کوں پیر کے بوقت بہار
جب ہوئے اصحاب فیل سب ویراں	بعد پنجاہ و پنج روز ازاں
چھ سو اوپر ہوئے تھے تیس برس	وقت عیسیٰ سے جب اے پاک نفس
- - - - - - - - - - - -	- - - - - - - - - - - -
جان جاں و جہاں ہوا پیدا	شاہ کون و مکاں ہوا پیدا

یہاں آپؐ کی ولادت ۱۲ ربیع الاول ۶۳۰ء واقعہ فیل کے ۵۵ دن بعد بتائی گئی ہے جبکہ مورخین اسلام آپؐ کی ولادت باسعادت عام الفیل کے ۵۰ دن بعد ۵۷۱ء کو مانتے ہیں اور اسی پر اکثریت کا اتفاق ہے۔ معجزات کے بیان میں باقر آگاہ نے علامہ سیوطیؒ کی "رسائل مولود"، مولانا جامیؒ کی "شواہد النبوۃ" اور عبدالحق دہلوی کی "معارج النبوۃ" وغیرہ سے استنباط کیا ہے۔

دکن ہی کے ایک غیر معروف شاعر سید حیات کی تصنیف "کتاب احوال النبیؐ" میں
بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں ؎

جب آمنہؓ حاملہ ہوئی نور سے   گھر ہوا روشن زیادہ سور سے

. . . .

وقت آیا جب تولد کا قریب   یک تجلی نور کی ہوئی اے حبیب

صبح دم ظاہر ہوا وہ بے نظیر   تھی ربیع الاول کی دوسری روز پیرؓ

آخری مصرع پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے "دوشنبہ" کا ترجمہ
"دوسری روز" کر دیا۔ پھر ردیف اور قافیہ کی مناسبت سے "پیر" بھی لکھ دیا۔ جس کی
وجہ سے اس مصرع کے معنی مبہم ہو گئے ہیں۔ اس کے مطابق تاریخ پیدائش ۲ ربیع الاول
بروز پیر نکلتی ہے جو سراسر غلط ہے۔

ذوقؔ و غالبؔ کے معاصر سید عبدالمفتاح اشرفؔ کے دیوان "اشرف الاشعار"
میں واقعۂ میلادالنبیؐ پر کئی نظمیں ملتی ہیں۔ شاعر ذکرِ میلادالنبیؐ کو شعارِ اہلِ ایمان
گردانتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ادب سے آج ہوتا ہے بیاں مولدِ حضرتؐ   سنو اے دوستو! اب داستانِ مولدِ حضرتؐ

دوشنبہ بارہویں ماہ ربیع الاولیں کی تھی   طلوعِ آفتابِ عز و شانِ مولدِ حضرتؐ

گرے نوشیرواں کے قصر کے چودہ مناسے تب   پڑے بت اوندھے مکہ میں زمانِ مولدِ حضرتؐ

جھکا کعبہ طرف گھر آمنہؓ کا بار کورع ہو کر   قیامت تک رہے باقی نشانِ مولدِ حضرتؐ

اشرفؔ نے تیسرے شعر میں تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب آپؐ کی
ولادت ہوئی تو قیصرِ روم کے قصر کے کنگورے گر گئے تھے اور کعبۃ اللہ میں نصب بت

اوندھے منہ گر گئے تھے۔

امیر مینائی کی "صبح ازل" ولادت باسعادت حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں ایک اچھی مثنوی ہے۔ اگرچہ امیر نے فن نعت گوئی کو مستقلاً اختیار نہیں کیا لیکن انکے کلام میں معتد بہ حصہ نعتیہ مضامین کا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق امیر کی نعتیہ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں کہ :

> " نعت کا جو طرز ہمارے اکثر شعراء نے اختیار کیا ہے وہ بہت ہی قابل اصلاح ہے ... بھلا نعت میں زلف و کمر، خط و خال وغیرہ سے کیا تعلق .... مانا کہ یہ بھی سہی، مگر یہ کیسی غضب کی بات ہے کہ جو مقصد نعت کا ہے اور جو نعت کی جان ہے وہ بالکل غائب۔ گو بعض اوقات منشی صاحب (امیر مینائی) بھی اسی ڈھرے پر چلے ہیں، مگر انھوں نے بہت اعتدال سے کام لیا ہے"۔ [۲۲]

بہرکیف "صبح ازل" میں جو مدس میں لکھی گئی ہے شاعر نے خوشی و شادی کی منظرکشی کی ہے اور ولادت رسول ؐ کے موقع پر شیاطین کے ماتم کدوں کا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔ عقیدت کی ایسی شاعری میں امیر شعری محاسن کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ شاعر نے رسوم میلاد کو ذہن میں رکھکر ہی "صبح ازل" لکھی ہے اس لیے جابجا ان رسوم کا ذکر اس مثنوی میں ہوا ہے۔ مثلاً دوران ذکر مولود قیام کرنا ایک رسم بن گئی ہے۔ جو فخر دو عالم ؐ کی آمد میں تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کے مصداق ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

لو مومنو اب شاہ کی تعظیم کو اٹھو	محفل میں حضور ؐ آتے ہیں تسلیم کو اٹھو
قربان کرو لا کے زر و سیم کو اٹھو	دیدار رخ احمد بے میم کو اٹھو

پھیلی ہے یہ ضو چار طرف رب علی کی
تعظیم محمد کی ہے تعظیم خدا کی

شاعر نے اس مثنوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف "ارہاص" کا بھی ذکر کیا ہے جو ولادت رسول ؐ کے وقت ظہور پذیر ہوئے تھے۔

مولود مسعود کے ذکر میں الطاف حسین حالی کے مسدس کے چند شعر ہی عقیدت و شعریت کا نہایت اعلیٰ وارفع نمونہ نظر آتے ہیں۔ حالی نے ذکر مولود میں اپنی ایجاز پسندی سے اعجاز پیدا کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے مسدس کے یہ گنے چنے اشعار مستقل لکھے گئے بڑے بڑے میلاد ناموں پر بھاری ہیں۔ ان میں نہ خلاف شرع کوئی بات کہی گئی ہے اور نہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ پیرائے میں سادگی لیے ہوئے قرآن و احادیث اور دیگر آسمانی کتب کے حوالوں سے پُر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت　　بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت

ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت　　چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئے پہلوئے آمنہؓ سے ہویدا

دعائے خلیل اور نوید مسیحا [۳۱]

قرآن میں دعائے خلیل کے الفاظ ہیں "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ" (سورۃ البقرہ ۱۲۹) حضرت عیسیٰؑ کی بشارت یوحنا کی انجیل میں بھی درج ہے اور قرآن کی سورہ الصف میں "وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ" (آیت ۶) کے الفاظ میں وارد ہے۔ ایک حدیث میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میں اپنے دادا ابراہیمؑ کی دعا ہوں اور اپنے بھائی عیسیٰؑ کی بشارت ہوں"۔

حالی کے اس مسدس کے بعد "ذکر میلاد النبیؐ" کو موضوع سخن بنانے والوں میں سید وحید الدین سلیم (م، ۱۹۲۰ء) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی مولود بہاریہ شعری محاسن

کا گویا مرقع ہے۔ اس نظم میں طویل بحر اور ہر مصرع میں "مستفعلن" کی آٹھ بار تکرار سے موسیقیت پیدا کی گئی ہے۔ سلیم نے موسم بہار سے تعلق رکھنے والے تمام پھولوں، پودوں اور موسم سے مناسبت رکھنے والی تمام اشیاء کا ذکر نہایت خوبی اور روانی کے ساتھ کیا ہے، اس طرح یہ نظم مصوری، شاعری اور موسیقی کا سنگم دکھائی دیتی ہے۔ نظم کا موضوع اگرچہ وہی ہے لیکن شاعر کے طرز بیان نے اس میں جدت اور نیا آہنگ پیدا کر دیا ہے۔

اے ہم دم شیریں سخن ہے نور حق پر تو فگن
ہر نخل گُلی کی ہے پھبن طور جمال ذوالمنن
بن ٹھن عروسان چمن شیریں ادا شیریں بدن
رنگیں قبا گل پیرہن ہیں کس طرب سے خندہ زن
سرو ایک پا سے ہے کھڑا کس درجہ ہے شرم وحیا
خاموش ہے سر کو جھکا یہ طرز کوئی سمجھے کیا
جب تک چلی باد صبا پتوں سنے یہ کھولا پتا
کہتا ہے یہ صلے علی اے مرحبا گہر زمن
نور قدم پیدا ہوا شاہ امم پیدا ہوا
عرشی حشم پیدا ہوا والا حشم پیدا ہوا
فرخ شیم پیدا ہوا بحر کرم پیدا ہوا
کوہ ہمم پیدا ہوا پیدا ہوا قدسی سخن شِلے

"ولادت رسولؐ" کے واقعہ کو شاد عظیم آبادی نے بھی نظم کیا ہے۔ شاعر نے

البتہ شاعرانہ تخیلات سے زیادہ روایات پر زور دیا ہے۔ جیسا کہ پچھلے شعراء کے میلاد ناموں میں ہم دیکھ چکے ہیں۔

اردو ادب میں شاعری اور درویشی کا ہمیشہ چولی دامن کا تعلق رہا ہے صوفیا اور درویشوں نے عوامی لب ولہجہ میں دین کی باتیں لوگوں تک پہنچائیں۔ اس کے لیے کبھی تو انھوں نے قصہ کہانی کا سہارا لیا کبھی منطقیانہ اور فلسفیانہ طریقوں کو اپنایا اور کبھی عشق کا سہارا لیا کبھی رجز کا لیکن ایسی شاعری سے عورتیں مستفیض نہیں ہو سکتی تھیں اسلیے ان صوفیوں اور درویشوں نے عوامی گیتوں کا بھی سہارا لیا جو بالخصوص عورتوں میں مروج ہیں۔ مثلاً چکی نامہ، چرخی نامہ، جھولنا نامہ وغیرہ۔ یو۔پی کے ایک شاعر نور سہارنپوری کا یہ "جھولنا نامہ" ملاحظہ کیجیے جس میں ذکر "میلاد" ہے۔

جھولتے جب نبی مصطفےٰ جھولنا جھوم کر کہتا صل علیٰ جھولنا
لوری پھولوں سے پھولا پھلا جھولنا جھوم کر کہتا صل علیٰ جھولنا[۱۲]

اور امجد حیدرآبادی کی نظم "نبی جی کی لوری" بھی سنیے۔

آمنہ بی بی کے گلشن میں آئی ہے تازہ بہار پڑھتے ہیں صلی اللہ وسلم آج در و دیوار
نبی جی ! اللہ اللہ اللہ ھو لا الٰہ الا ھو[۱۳]

"عید میلاد النبیؐ" کے عنوان سے حفیظ جالندھری (م ۱۹۸۲ء) کی نظم بڑی پُر اثر ہے۔ شاعر نے پرانی طرز کو اپناتے ہوئے پہلے دورِ جاہلیت کا نقشہ کھینچا ہے، پھر آپؐ کے آنے سے جو انقلاب رونما ہوا اس کی عکاسی کی ہے۔ شاعر نے استعارات و تشبیہات کے سہارے اپنے گلستانِ تخیل میں رنگ بھرا ہے۔ اسی طرح احسان دانش کی "نوائے کارگر" میں بھی "ذکرِ میلاد" کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ عتیق حنفی کی صلصلۃ الجرس" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت

باسعادت کا بیان اس طرح ہوا ہے۔

پردۂ مشرق کے پیچھے ہے فصل ربیع کی صبح آمید ہے پس مطلع صد ادب میں منتظر آمد خورشید

خانۂ زہرا میں داخل ہونے کو ہے خورشید بہار دریا ایک قدم کا کیا ہے، میدان مریخ ہے پار

نام محمدؐ اس کے پہلے کس کو ملا یہ پیارا نام صلی اللہ علیہ وسلم دونوں عالم بھیجیں سلام

ماہرالقادری نے "آتے ہیں" کے عنوان سے لکھی نظم میں "میلادالنبیؐ" کا ذکر کیا ہے۔

جیسا کہ ابھی تک کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ میلاد ناموں میں "وقت صبح" کی عکاسی بھی نہایت ماہرانہ انداز میں کی گئی ہے، ایسی ہی صبح کی عکاسی مراثی میں بھی کی گئی ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق ہے۔ مراثی کی صبح ہولناک ہے اور یہاں فرحت بخش۔ وہاں صبح کی آمد گرمی کی شدت کا احساس دلاتی ہے، یہاں موسم بہار کی نسیم کے جھونکے روح پرور اور کیف آگیں محسوس ہوتے ہیں۔ وہاں آفتاب صبح حدت کی علامت ہے اور یہاں صبح، آفتابِ رحمت لے آتی ہے۔ یہ صبح خوشگوار ہے اور وہ صبح وحشت ناک۔ یہ صبح درود وسلام سے گونجتی ہے اور وہ صبح نعرۂ تکبیر سے۔ یہ صبح معطر و مطہر ہے اور وہ صبح خون آلود۔ یہ صبح گوہر شبنم کی افشانی کرتی ہے اور وہ صبح آنسوؤں کے موتی کی۔ وہ صبح تلواروں کی جھنکار سے شروع ہوتی ہے اور یہ صبح طیوران خوش الحان کی زمزمہ خوانی سے۔ غرضکہ یہ صبح دعوت رحمت ہے اور وہ صبح دعوت کرب وبلا۔ اسطرح شعرائے اردو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سعید کے واقعہ کو پیش کرنے میں عقیدت و محبت کے وہ گلستان کھلا دیے ہیں جنکی خوشبو ایمان افروز بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔

مراجع

[1] عبداللہ عباس ندوی: عربی میں نعتیہ کلام لکھنؤ ۱۹۷۵ء ص ۳۰ [2] ایضاً [3] ڈاکٹر سید محی الدین زور: کلیات قلی قطب شاہ (مقدمہ) ص ۱۷۱ [4] ایضاً ص ۳۵ [5] ایضاً ص ۴۲ [6] عبداللہ قطب شاہ (مرتبہ سید محمد) دیوان عبداللہ قطب شاہ سلسلۂ یوسفیہ شمارہ ۹ ص ۳۱ [7] ظہیر الدین مدنی: "گجرات میں مذہبی مثنویات" مشمولہ "نوائے ادب" بمبئی شمارہ ۲ سنہ ۱۹۵۰ء ص ۱۵ [8] پروفیسر نجیب اشرف ندوی: "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" علی گڑھ سنہ ۱۹۶۲ء ص ۱۲۹ [9] محمد باقر آگاہ: ہشت بہشت (من موہن قلمی) ادارۂ ادبیات حیدرآباد۔ ورق ۵۰ ب ۱۵ الف [10] سید حیات: کتاب احوال النبیؐ (قلمی) ادارۂ ادبیات ورق ۳۴ الف [11] سید عبدالفتاح اشرف: "دیوان اشرف الاشعار"، مطبع گلزار حسینی بمبئی ۱۲۸۵ھ ص ۲۶ [12] مولوی عبدالحق: "چند ہم عصر" علی گڑھ ۱۹۷۱ء ص ۹-۸ [13] امیر مینائی: "صبح ازل" حیدرآباد ۱۳۳۲ھ ص ۱۲ [14] الطاف حسین حالی: "کلیات نظم حالی: لاہور ۱۹۷۰ء جلد دوم ص ۷۳ [15] سید وحید الدین سلیم (مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل) "افکار سلیم" پانی پت ۱۹۳۸ء ص ۵۹ [16] نور سہارنپوری "دیوان نعت" سہارنپور ۱۹۳۹ء ص ۱۷-۱۶ [17] امجد حیدرآبادی (بحوالہ "تحفۂ محمدی") بحوالہ الیاس برنی لاہور ۱۹۴۸ء حصہ دوم ص ۲۲ [18] عتیق حنفی، "صلصلۃ الجرس" ص ۳۶۔

شاہ کلیم اللہ جہان آبادی اور ان کی تفسیر قرآن القرآن بالبیان

از
محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دار المصنفین

چشتیہ سلسلہ کے مشائخ میں شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کا نام بہت ممتاز ہے یہ سلسلہ حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کے بعد دہلی سے تقریباً معدوم ہو چکا تھا، مگر شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کی بدولت نہ صرف یہاں از سر نو احیا ہوا بلکہ دکن، پنجاب، یوپی اور دوسرے مقامات میں بھی اس کی خوب نشر و اشاعت ہوئی۔

نام و نسب اور خاندانی حالات شاہ صاحب کا نام کلیم اللہ اور ان کے پدر بزرگوار کا نام نور اللہ اور جد محترم کا احمد معمار تھا،[1] ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکا خاندان خجند ہوتا ہوا لاہور پہنچا تھا۔[2]

---

[1] مناقب المحبوبین میں شیخ احمد کے والد شیخ حامد کا بھی تذکرہ ہے، مگر مولانا سید سلیمان ندوی کے خیال میں شیخ حامد شیخ احمد کے بھائی تھے، ملاحظہ ہو (مقالات سلیمان ج اول ص ۳۰۰ و ۳۰۱) پروفیسر نذیر احمد کی تازہ تحقیق کے مطابق شیخ احمد کے والد کا نام برخوردار تھا۔ [2] مناقب المحبوبین میں ان کا اصل وطن خجند بتایا گیا ہے (ص ۴۵) شاہ صاحب کے ایک تایا لطف اللہ مہندس نے اپنی ایک کتاب منتخب الحساب کے دیباچہ میں یہ صراحت کی ہے کہ ان کے والد لاہور کے رہنے والے تھے، (مقالات سلیمان (بقیہ حاشیہ ص ۱۲۵ پر)

صاحب مناقب المحبوبین کے بیان کے مطابق اس خاندان کے لوگ شاہجہاں کے دورِ حکومت میں اس کے ایما سے لاہور چھوڑ کر دہلی میں آباد ہو گئے تھے[1] اور معماری کا پیشہ کرتے تھے۔

شاہ صاحب کے دادا شیخ احمد معمار اور ان کے بھائی شیخ حامد اپنے عہد کے بڑے باکمال عمارت گر اور نقشہ نویس تھے، شاہجہاں نے جب لال قلعہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تو انہیں دونوں بھائیوں نے اس کا نقشہ بادشاہ کے روبرو رکھا جس کے موافق اس قلعہ کی تعمیر ہوئی[2] محمد صالح کنبوہ کے بیان کے مطابق یہ تعمیر شاہ صاحب کے دادا احمد معمار کی نگرانی میں ہوئی[3]۔ ان کا دوسرا اہم کارنامہ آگرہ میں ممتاز محل کے روضہ کی تعمیر ہے[4]۔ ان کے علاوہ عہد شاہجہانی کی دوسری عمارتیں بھی انھوں نے بنائی تھیں اور اسی بنا پر وہ معمار شاہجہانی بھی کہلاتے تھے[5]۔ ان تمام تعمیرات میں ان کے ساتھ ان کے بھائی استاد احمد اور ان کے لڑکے بھی شریک تھے۔ تاج محل کی تعمیر ۱۰۵۱ھ میں ختم ہوئی اور دہلی کا لال قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا۔ اس کے دوسرے سال ہی یعنی ۱۰۵۹ھ میں شیخ احمد کا انتقال ہوا[6]۔
۱۰۶۰ھ میں دہلی کی جامع مسجد کی تعمیر کے وقت شیخ احمد موجود نہ تھے اس لیے اس کو بنانے میں ان کے بھائی استاد احمد اور ان کے لڑکوں نے نمایاں حصہ لیا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۴) ج اول ص ۳۱۷) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس خاندان کے لاہور میں سکونت اختیار کرنے کی بیشمار دلیلیں تحریر کی ہیں۔ ملاحظہ ہو مقالات سلیمان ج ا ص ۲۹۷-۳۲۱-۳۲۷ اور ۳۳۰ تا ۳۳۳ [1] مناقب المحبوبین ص ۴۸ [2] تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی جلد ۷ ص ۴۰۰ [3] عمل صالح جلد سوم ص ۴۹۶ (اردو ترجمہ)
[4] مقالات سلیمان جلد اول ص ۳۰۰ بحوالہ دیوان مہندس [5] ایضاً ص ۳۱۱ [6] ایضاً ص ۳۰۰۔

کہا جاتا ہے کہ استاد حامد کا دوسرا شریک استاد ہیرا تھا[1] مسجد میں بیرونی محرابوں کے اوپر کی دیوار میں مسجد کے بنائے جانے کی جو تاریخ طویل فارسی عبارت میں بخط نسخ تحریر ہے وہ شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کے پدر بزرگوار اور شیخ احمد کے فرزند حاجی نور اللہ کی باکمال انگلیوں کا اعجاز ہے۔ اس کتبہ کے آخر میں بسمت شمال "کتبہ نور اللہ احمد" لکھا ہوا ہے[2]

شاہ صاحب کے والد تین بھائی تھے جن کے نام یہ ہیں:۔

(۱) عطاء اللہ رشیدی نادر العصر (۲) لطف اللہ مہندس (۳) نور اللہ معمار۔

یہ تینوں بھائی ہندسہ اور عمارت گری کے فن میں مہارت رکھتے تھے اور نور اللہ کو جو سب سے چھوٹے تھے اس فن میں اس درجہ کمال تھا کہ معمار کا موروثی لقب صرف انھیں کو ملا، انہیں نظم و نثر میں بھی درک تھا۔

غرض پورا خاندان فن عمارت گری میں نمایاں اور ممتاز تھا اور اسی کے ساتھ علم و فن سے بھی بہرہ ور تھا۔[3] شاہ صاحب کے والد ماجد حد درجہ خلیق اور ملنسار بھی تھے۔ ان کی شادی شاہی دربار کے ایک متوسل مولوی احمد علی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی جن کے بطن سے یہ بدر منیر طلوع ہوا۔

ولادت | شاہ کلیم اللہ کی ولادت ۲۴ جمادی الثانی ۱۰۶۰ھ / ۲۴ جون ۱۶۵۰ء کو شاہجہاں آباد (دہلی) میں ہوئی اور اسی لیے وہ شاہجہاں آبادی کہلائے۔

---

[1] مقالات سلیمان جلد اول ص ۱۴۰ بحوالہ دیوان مہندس [2] مقالات سلیمان جلد اول ص ۳۰۶

[3] مزید تفصیل کے لیے علامہ سید سلیمان ندوی کا محققانہ مضمون "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" دیکھئے

مقالات سلیمان ج اول

تعلیم و تربیت شاہ صاحب ایک صاحب کمالات خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور خود ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ دی گئی۔ علاوہ ازیں انھوں نے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے حصول علم کیا[۱]۔ ان کے اساتذہ میں شیخ برہان الدین المعروف بہ شیخ بہلول اور شیخ ابوالرضاء، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے والد بزرگوار کے برادر کلاں تھے۔ اسطرح شاہ کلیم اللہؒ علوم شریعت میں فاضل یگانہ بن گئے۔

حلقۂ درس تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے چند برس مطالعہ میں گزارے اور اس دوران میں انھوں نے بعض درسی کتابوں پر شروح و حواشی لکھے۔ پھر اپنے پدر بزرگوار حاجی نوراللہ کے حکم کی تعمیل میں زینت المساجد دہلی کے دالان میں باقاعدہ درس دینا شروع کیا۔ جس کا سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک جاری رہا اور اس دوران بے شمار تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی۔

تصوف و سلوک درس و تدریس کے زمانہ میں شاہ صاحب کی ملاقات ایک مرد عارف سے ہوئی۔ اس کے اثر سے وہ علمی کا مشغلہ ترک کر کے معرفت و سلوک کی راہ پر گامزن ہو گئے، جس میں بڑی مشقت و ریاضت کی۔ بالآخر دہلی کے ایک بزرگ حضرت محمد صادق خلیفہ میاں پیر محمد سلونی کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔ شیخ محمد صادق نے شاہ کلیم اللہ کی طلب صادق دیکھی تو ان کو مشورہ دیا کہ وہ مزید حصول معرفت کے لیے مدینہ منورہ شیخ یحییٰ مدنی کے پاس جائیں۔

شیخ یحییٰ مدنی شیخ یحییٰ مدنی اپنے زمانے کے مشاہیر صوفیہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ علامہ شیخ کمال الدین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ولادت ۲ بیستم رمضان

---

[۱] تکملہ سیر الاولیاء ص ۹۰۔

سنہ۱۰۱۰ھ کو احمدآباد (گجرات) میں ہوئی۔ نوعمری ہی میں تکمیل علوم کے بعد سجادہ مشیخت پر سرفراز ہوئے، شاہ و گدا سب ان سے عقیدت رکھتے تھے، خود اورنگ زیب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، بعد میں شیخ یحییٰ مدنی ہجرت کرکے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی اور ۲۸ صفر سنہ۱۱۰۱ھ کو اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

سفرحجاز علامہ علی آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق شاہ کلیم اللہ ہندوستان میں علوم سے فراغت کے بعد حجاز تشریف لے گئے تھے[1] مگر دوسرے مآخذ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شیخ محمد صادق کے مشوروں سے مدینہ کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ شیخ یحییٰ مدنی کی ملاقات اور مدینہ کی روانگی کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اپنی والدہ ماجدہ سے اسکی اجازت بھی نہ لے سکے جو اس وقت زندہ تھیں[2]

شاہ صاحب پہلے مکہ معظمہ پہونچے۔ اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے[3] یہاں کی مقدس جگہوں کی زیارت کرنے کے بعد مدینہ منورہ شیخ یحییٰ مدنی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مدینہ طیبہ میں انھوں نے طویل عرصہ تک قیام کیا اور شیخ یحییٰ مدنی کے علاوہ دوسرے بزرگوں سے بھی کسب فیض کیا[4] ان کا نام میر محترم اور شیخ محمد غیاث تھا، اول الذکر سے شاہ صاحب نے نقشبندی طریقہ کی سند و اجازت حاصل کی اور شیخ محمد غیاث سے قادری سلسلہ میں نسبت حاصل کی[5]

مراجعت وطن سرزمین حجاز میں علم و معرفت کے حصول کے بعد شاہ صاحب دہلی واپس ہوئے اور جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان بازار خانم میں سکونت پذیر ہوئے، جو

---

[1] مآثر الکرام دفتر اول ص ۲۴۴ [2] تکملہ سیر الاولیا ص ۹، [3] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۲۴۰ [4] مآثر الکرام جلد اول ص ۲۴۴ [5] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۰-۲۴۱

اس وقت دلی کا سب سے زیادہ بارونق بازار تھا۔ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ جگہ ان کے خاندان کو شاہجہاں نے عطا کی تھی کیونکہ لال قلعہ اور جامع مسجد کے معمار کے لیے وہی موزوں ترین جگہ تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

"دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقف کار (سید مرتضیٰ علی صاحب ہیڈ کلرک دفتر کمانڈر انچیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ استاد حامد اور استاد احمد (جد شاہ کلیم اللہ) دونوں بھائی تھے۔ استاد حامد کے نام سے کوچہ "استاد حامد" دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے اور ان کی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے اور لاہور والے کہلاتے ہیں اور آج کل وہ سادہ کاری کا کام کرتے ہیں"[1]

اپنے اسی مسکن میں انھوں نے پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جسکی شہرت بہت جلد اکناف ملک میں پھیل گئی اور دور دور سے طلبہ تحصیل علم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، یہ تمام طلبہ شاہ صاحب کے یہاں مقیم رہ کر اپنے اپنے اسباق پڑھتے تھے اور ان کو کپڑا اور کھانا حکومت مہیا کرتی تھی[2]

شاہ کلیم اللہ علم ظاہر و علم باطن دونوں کے جامع تھے اس لیے جو طلبہ علم ظاہر کی تحصیل کے لیے آتے تھے ان میں سے بعض علم باطن سے بھی مالا مال ہوتے۔ شاہ صاحب کو درس حدیث سے خاص شغف تھا، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ ایک مرتبہ ان سے ملنے کے لیے آئے تو دیکھا کہ وہ صحیح بخاریؒ کے درس میں مشغول ہیں[3]

دعوت و ارشاد شاہ کلیم اللہ جب دہلی میں مسند علم پر جلوہ افروز ہوئے اس وقت

---

[1] مقالات سلیمان ج اول ص ۳۰۱ [2] انوار العارفین ص ۳۰۴۔ [3] ایضاً۔

اورنگ زیب عالمگیر کی حکومت کا آخری دور تھا اور وہ خود اور اس کے اہل خاندان نیز فوج کا بیشتر حصہ دکن میں بغاوتیں فرو کرنے میں مصروف تھا، اس طرح ملک کے سیاسی حالات کی طرح مذہبی و اخلاقی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ ان حالات میں شاہ کلیم اللہ نے رشد و اصلاح کے کام کی ذمہ داری سنبھالی[1] اور اپنے باکمال خلفاء کو مختلف مقامات کو اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے روانہ فرمایا، جن میں سرفہرست ان کے عزیز ترین مرید شیخ نظام الدین تھے۔ جن کو اس کام کے لیے دکن روانہ فرمایا تھا، یہ شاہی لشکر کے ہمراہ دکن گئے اور کچھ عرصہ دکن میں ان کی نقل و حرکت لشکر ہی کے ساتھ ہوتی رہی، انکی تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں لشکر کے لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ بیجاپور اور برہانپور میں بھی ان کا قیام رہا۔ آخر میں اورنگ آباد جا کر مستقل مقیم ہو گئے اور وہاں خانقاہ نظامیہ قائم کی۔

شاہ صاحب کے تربیتی خطوط شاہ صاحب اپنے خلفاء کو برابر تربیتی ہدایت نامے جاری فرمایا کرتے تھے، جن کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ابتر معاشرتی حالات سے حد درجہ کبیدہ خاطر تھے، اس لیے وہ برابر اپنے خلفاء کو دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی تلقین کرتے۔ چنانچہ اپنے عزیز خلیفہ شیخ نظام الدین کو لکھتے ہیں :

"تم کو اللہ تعالیٰ نے دکن کی ولایت عطا فرمائی ہے، تم یہ کام پورے طور پر انجام دو میں نے اس سے پہلے تم کو لکھا تھا کہ لشکر میں جاؤ، لیکن اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں ہی صرف کر دو"[2]

شاہ صاحب لوگوں کی مادیت پسندی دیکھ کر بہت رنجیدہ رہتے تھے، چنانچہ

---

[1] مقدمہ مکتوبات [2] مکتوبات کلیمی ص ۲۶ مکتوب (۲۱)

لکھتے ہیں :

" بندگان خدا کے دل سے دنیا کی محبت ختم کر دینا چاہیئے[1] ... اے دوست ! دنیا نفس پروری اور تن آسانی کی جگہ نہیں ہے[2]"

اشاعت اسلام شاہ صاحب اشاعت اسلام کے فرض سے بھی غافل نہیں تھے، وہ اپنے مریدوں کو بھی اس کے لیے کمربستہ ہو جانے کی دعوت دیتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ نظام الدین نے ایک شخص کے لیے خلافت کی سفارش کی تو فرمایا :

" جب تک اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کمر ہمت نہ باندھی جائے خلافت سے کیا فائدہ[3] ... دینی و دنیاوی فیض دنیا کو پہونچاؤ، اپنا عیش و آرام لوگوں پر قربان کر دو[4] ... ہر حال میں اعلاء کلمۃ الحق کے لیے کوشش کرتے رہو اور اسلام کی آواز مشرق سے مغرب تک پہنچا دو[5] ... اعلاء کلمۃ الحق میں کوشش کرتے رہو اور اس کام کو معمولی خیال مت کرو، کیونکہ خدا اسی کام سے خوش ہوگا، لوگوں کی اصلاح میں لگے رہو، انبیاء علیہم السلام بھی اسی کام کے لیے مبعوث ہوئے تھے[6]"

ایک مکتوب میں اپنے مرید محمد علی کو لکھتے ہیں :

" اعلاء کلمۃ الحق ہمارے پیروں کا مسلک ہے، تم بھی اس میں کوشش کرتے رہو[7]"

اور اپنے تمام مریدین کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :

" اسلام کی اشاعت میں خوب کوشش کرو[8]"

شاہ صاحب کی رہنمائی اور توجہ اور ان کے خلفاء کی سعی و محنت سے بہت سے

---

[1] مکتوبات کلیمی ص ۱۹ مکتوب (۱۳) [2] ایضاً ص ۵۵ مکتوب (۴۲) [3] ایضاً ص ۳۹ مکتوب (۳۹) [4] ایضاً ص ۶۰ مکتوب (۵۸) [5] ایضاً ص ۴۲ مکتوب (۵۰) [6] ایضاً [7] ایضاً ص ۸۰ مکتوب (۱۱۵) [8] ایضاً ص ۵ مکتوب (۷۷)

غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ شیخ نظام الدین کی تبلیغ و تلقین سے دکن میں کئی غیر مسلم خاندان مسلمان ہوئے[1] اس کی اطلاع جب شاہ صاحب کو ہوئی تو بہت مسرور ہوئے اور شیخ نظام الدین کو تحریر فرمایا:

"بہر حال مقصد دنیا والوں کو فیض محمدی پہنچانا ہے۔ یہ کام جس طرح بھی ہو سکے سرانجام دینا چاہیے[2]"

نومسلموں میں بعض اسلام کے اظہار و اعلان میں تامل کرتے تھے، اس کی اطلاع جب شاہ صاحب کو ہوئی تو شیخ نظام الدین کو لکھا:

"میرے بھائی اس بات کی کوشش کرو کہ آہستہ آہستہ یہ بات ہو جائے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کو مخفی نہ رکھا جائے، ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد لوگ ان سے وہ معاملہ کر بیٹھیں جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے[3]"

غرض شاہ صاحب نے اس پُر آشوب دور میں دعوت و اصلاح کے فریضہ کو دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ انجام دیا اور یہ سلسلہ ان کے بعد انکے تلامذہ مریدین نے بھی جاری رکھا۔

طریقۂ تربیت شاہ کلیم اللہ نے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کا بھی بہتر انتظام کیا تھا، وہ ان کے اعمال و اشغال اور اخلاق و اطوار کی مکمل نگرانی کرتے تھے اور دہلی میں رہنے کے باوجود ان تمام خلفاء سے باخبر رہتے تھے جو بیرون دہلی دعوتی اور تبلیغی کام پر مامور تھے ان کی معمولی کوتاہیوں پر ان کو متنبہ فرماتے تھے۔ سب کو تاکید کر رکھی تھی کہ وہ ان کو اپنے حالات سے مطلع کرتے رہیں۔ چنانچہ ان کے تمام مریدین اس کی پابندی کرتے تھے۔ اور ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ وقت کی پابندی پر خاص طور پر

---

[1] حیات کلیم ص ۸۰ [2] مکتوب (۴۸) [3] ایضاً ص ۱۴ مکتوب (۲۱)۔

زور دیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ:

"جو شخص وقت کا پابند نہیں وہ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہے"[1]

وہ اپنے مریدوں کو تساہل اور تن آسانی سے بھی باز رکھتے تھے ارشاد فرماتے ہیں:

"تم اپنے کام میں اور زیادہ سرگرم ہو جاؤ یہاں تک کہ جو شخص تمہارے پاس پہونچے وہ بھی تمہارا کام کرنے لگے"[2]

وہ اپنے خلفاء کو اپنے سلسلہ کی اشاعت کی بھی تلقین کرتے تھے تاکہ یہ سلسلہ رشد و اصلاح آیندہ بھی جاری رہے۔

اتباع شریعت کی تاکید

شاہ صاحب برابر اپنے تمام مریدین و خلفاء کو اتباع شریعت کی تلقین فرماتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ شریعت کو نظر انداز کر کے کسی شخص کو روحانی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی، ایک مکتوب میں اپنے خلیفہ شیخ نظام الدین کو تحریر فرماتے ہیں:

"سب داخل سلسلہ لوگوں کو تاکید کرنی چاہیے کہ ظاہر کو شریعت سے آراستہ اور باطن کو عشق مولیٰ سے پیراستہ رکھیں"[3]

ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں:

"اے بھائی اگر کسی فقیر کا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو دیکھو کہ وہ شریعت کا کس حد تک پابند ہے، فقیر کی شناخت کا معیار شریعت ہی ہے، اسی کسوٹی پر کھرے کھوٹے کو پہچانا جا سکتا ہے"[4]

شاہ صاحب شریعت پر عمل نہ کرنے والے اصحاب طریقت کو گمراہ بتاتے ہیں:

---

[1] مکتوبات کلیمی (۲۲) [2] ایضاً مکتوب (۶۴) [3] ایضاً مکتوب (۱۳) و (۷۴)، [4] ایضاً مکتوب

"جو شخص شریعت میں راسخ نہیں وہ ناقص ہے، اس کے بغیر اس کی طریقت و حقیقت کا اثاثہ بے قیمت ہے، مرد کامل وہ ہے جو شریعت، طریقت اور حقیقت تینوں کا جامع ہو[1]"

شاہ صاحب نے گمراہ صوفیہ کی سخت مذمت بھی کی ہے۔

وفات | شاہ صاحب کو اخیر عمر میں نقرس اور وجع المفاصل کے امراض لاحق ہو گئے تھے[2]۔ بالآخر اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا اور اپنی مسکونہ حویلی ہی میں مدفون ہوئے[3]۔ ان کی تاریخ وفات ۲۴ ربیع الاول ہے، البتہ سن وفات میں اختلاف ہے، صاحب نزہۃ الخواطر نے ۱۱۴۱ھ میں ان کی وفات بتائی ہے[4]۔ اس کی تائید ان کے ایک مرید کی اس تاریخ وفات سے بھی وفات ہوتی ہے :-

کلیم اللہ عارف صاف بودہ ۔۔۔ باقلیم بقا شوقش ربودہ

بپرسیدم چو تاریخ وفاتش ۔۔۔ خرد گفتا کہ ذات پاک بودہ[5]

اس کے برخلاف آزاد بلگرامی نے شاہ صاحب کا سال وفات ۱۱۴۳ھ بتایا ہے۔ جو ان کے مزار پر کندہ بھی ہے۔

فضل و کمال خویش بود ۔۔۔ مرہم قلب ریش بود

سال وفاتش گفتہ ہاتف ۔۔۔ قطب زمانہ خویش بود[6]

اولاد | شاہ کلیم اللہ کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، بچوں کے نام خواجہ محمد[1]، حامد سعید[2]، محمد فضل اللہ[3]، اور محمد احسان اللہ[4] تھے اور بچیوں کے نام یہ تھے، بی بی رابعہ[1]، بی بی فخر النساء[2] اور زینب بی بی مصری کے نام سے مشہور تھیں۔ ان میں خواجہ محمد شاہ صاحب

---

[1] مکتوبات کلیمی ص ۶۵ مکتوب (۱۲۵) [2] مآثر الکرام ج اول ص ۹۳ [4] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۹

[5] شجرۃ الانوار قلمی بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۴۲۱ [6] مآثر الکرام ج اول ص ۹۳۔

کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے اور بقیہ اولاد انکے بعد بھی زندہ رہیں۔

اخلاق و عادات شاہ کلیم اللہ ایک متواضع خلیق سادگی پسند، متحمل مزاج اور حلیم الطبع بزرگ تھے، وہ دشمنوں اور مخالفوں سے بھی کبھی ناراض نہیں ہوئے ان سے انتقام لینا تو در کنار، ہمیشہ ان کے لیے دعا گو رہتے اکثر انکی زبان پر یہ اشعار جاری رہتے[1]

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد	ہر کہ مارا یار نبود ایزد او را یار باد
ہم کو تکلیف پہنچانے والے کو بہت راحت نصیب ہو	اور جو کوئی ہمارا دوست نہ بنے خدا اسکا دوست بنے
ہر کہ خارے بر نہد در راہ ما از دشمنی	ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد
جو شخص دشمنی کی نیت سے ہماری راہ میں کانٹے بچھائے	اس کے باغ عمر کا ہر پھول بے خار کھلے

شاہ کلیم اللہ اپنے مریدوں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے کہ وہ لوگوں کی جفا اور درشتی کو برداشت کریں، ان کا کہنا تھا کہ ہمارا کام دلوں کو جوڑنا ہے، اس راہ میں جتنی بھی مشکلات پیش آئیں ان کو خندہ پیشانی سے انگیز کرنا چاہیے، دکن میں ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے انکی مذمت کی جس سے ان کے شاگرد عزیز شیخ نظام الدین کو دکھ ہوا اور انھوں نے اس کی اطلاع شاہ صاحب کو بھی دی، تو اس کے جواب میں انکو لکھا۔

"کوئی شخص ہم کو برائی سے یاد کرتا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہم تو اس سے برے کہے جانے کے مستحق ہیں یہ تو اس کا لطف و کرم ہے کہ اس نے ہمیں کم برا بھلا کہا۔ ہم نے اس کو معاف کیا تم بھی اسے معاف کر دو۔"[2]

استغنا و بے نیازی شاہ کلیم اللہ بڑے غیور اور بارعب بھی تھے، اپنے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر دے رکھا تھا، اسی معمولی رقم پر گزر اوقات کرتے، جس کی بنا پر وہ

---

[1] بحوالہ مکتوبات ص۵۲ [2] ایضاً۔

مقروض بھی ہو جاتے تھے، مگر کسی کے آگے دست سوال دراز کرنا گوارا نہیں تھا۔ وہ امراء اور سلاطین کے ہدیے اور تحفے بھی قبول نہیں کرتے تھے، فرخ سیر نے شاہ صاحب کی کئی مرتبہ مالی مدد کرنی چاہی مگر انھوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا، اس نے انکی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو کہلا بھیجا کہ یہ بات ہمارے لیے اذیت کا موجب ہوگی، شاہ صاحب جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے جب مسجد جاتے تو وہاں بادشاہ بھی ہوتا تھا مگر اجازت کے بغیر بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔[۱]

تصنیفات | شاہ کلیم اللہ نے متعدد مفید اور اہم کتابیں یادگار چھوڑیں جن کی تعداد بتیس ۳۲ بتائی گئی ہے[۲] لیکن ان میں سے اکثر معدوم ہیں، تاہم جن کتابوں کا سراغ ملتا ہے وہ بھی ان کی عظمت و جلالت اور علمی تبحر کا ثبوت ہیں، ذیل میں ان کا مختصر تعارف درج ہے۔

۱۔ عشرۂ کاملہ:۔ اس کتاب کا موضوع تصوف ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں تصوف کے دس مسائل کی تشریح کی گئی ہے، یہ کتاب بھی عربی میں ہے اور چھپ چکی ہے۔

۲۔ سواء السبیل:۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہے اور یہ بھی عربی زبان میں ہے، اس کا ایک عمدہ نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔ حیات کلیم کے مرتب نے اس کے بعض اقتباسات کا اردو ترجمہ کیا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب علمی انداز میں لکھی گئی ہے اور اس میں عقائد اور تصوف کے دقیق علمی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے۔

---

[۱] بحوالہ تکملہ سیر الاولیاء [۲] مناقب فریدی ص ۴۴۳۔

۳۔ کشکول :۔ شاہ کلیم اللہ کی اس فارسی تصنیف کو ان کی سب سے مشہور و مقبول کتاب خیال کیا جاتا ہے جو تصوف کے اسرار و رموز پر مشتمل ہے یہ سلسلہ میں بعض احباب کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ متاخرین صوفیہ اپنے مریدین کو خرقہ خلافت کے ساتھ یہ کتاب بھی دیتے تھے اور خود شاہ صاحب بھی اس کے مفید ہونے کی بنا پر اپنے خاص مریدوں کو اس کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے تھے، یہ کتاب طبع ہو چکی ہے اور اس کا سلیس اردو ترجمہ بھی حیات کلیم کے مولف نے کیا ہے جو انکی کتاب میں شامل ہے[۱]

۴۔ مرقع :۔ یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے اور اس کی حیثیت کشکول کے ضمیمہ کی سی ہے، خرقۂ خلافت دیتے وقت کشکول کی طرح اسے بھی اپنے خلفا کو دینا صوفیائے متاخرین کا معمول تھا۔ یہ کتاب بھی طبع ہو چکی ہے اور اس کا بھی اردو ترجمہ حیات کلیم میں موجود ہے[۲]

۵۔ تسنیم :۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہے اور یہ بھی صوفیہ کے حلقہ میں بہت مقبول تھی، قاضی محمد عاقل والہانہ انداز میں اس کا درس دیا کرتے تھے ان کے ایک مرید مولانا عبداللہ نے اس کی شرح بھی لکھی تھی[۳] مگر اب یہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔

۶۔ رسالہ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیۃ :۔ یہ رسالہ علم ہیئت میں ہے جس کا مذاق شاہ صاحب کے خاندان میں عام تھا، اس کتاب کا ایک نادر نسخہ نذیریہ پبلک لائبریری دہلی میں موجود ہے[۴]

---

۱ حیات کلیم ص ۱۱۳ تا ۱۸۰ ۲ ایضاً ص ۱۹۵ تا ۲۲۶ ۳ بحوالہ تکملہ سیر الاولیاء ۴ تاریخ مشائخ چشت

۷۔ **شرح القانون** :۔ یہ ابن سینا کی کتاب القانون کی شرح ہے اور اس کا واحد نسخہ رام پور کے کتب خانہ حامدیہ میں ہے[1]

۸۔ **مکتوبات** :۔ ان تصنیفات کے علاوہ شاہ کلیم اللہ کے اکیسو بتیس ۱۳۲ مکتوبات ہیں جو فارسی میں ہیں اور ان کا مجموعہ "مکتوبات کلیمی" کے نام سے ۱۳۱۵ھ میں دہلی سے شائع ہوا ہے، اس مجموعہ میں سو سے زیادہ خطوط شیخ نظام الدین کے نام ہیں جو ان کو دکن بھیجے گئے تھے اور باقی دوسرے مریدوں کے نام ہیں اس سے شاہ صاحب کے عہد کے سیاسی و معاشرتی حالات کے علاوہ ان کی علمی اور دعوتی سرگرمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے

۹۔ **ملفوظات** :۔ شاہ صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ بھی تھا جس کو حیات کلیم کے مرتب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے[2]۔ ان کا اسلوب اور انداز بھی مکتوبات جیسا ہے۔

تذکروں میں مزید کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں، جیسے الہامات کلیمی، التکسیر[11]، رد روافض[12] وغیرہ۔ علم منطق میں بھی ان کا ایک رسالہ[13] تھا[3]۔ جو اب نایاب ہے اردوئے معلیٰ میں حکیم سید احمد حسنی مودودی کے نام اسد اللہ خاں غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب شعر بھی کہتے تھے اور ان کا مجموعہ کلام بھی تھا جو غدر کی تباہیوں کی نذر ہو گیا۔

۱۴۔ قران القرآن بالبیان :۔ یہ شاہ صاحب کی سب سے اہم تصنیف ہے جو عربی زبان میں قرآن مجید کی مختصر تفسیر ہے، یہ جلالین کی ہم پایہ خیال کی جاتی ہے، مگر جلالین میں شافعی مسلک کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور یہ تفسیر حنفی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، اس کے دو قلمی نسخے حیدرآباد کے کتب خانوں میں موجود ہیں پہلا کتب خانہ

---

[1] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۱ [2] حیات کلیم ص ۹۷ تا ۱۰۶ [3] مناقب المحبوبین ص ۴۶۔

آصفیہ میں اور دوسرا عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں ہے۔ اس کا ایک مکمل مخطوطہ کتب خانہ فاضلیہ گڑھی افغانان میں بھی بتایا جاتا ہے،

شاہ کلیم اللہ صاحب نے یہ تفسیر ۱۱۲۵ھ میں تالیف کی تھی دراصل قدیم اہم تفسیروں کی ایک جامع تلخیص ہے، چنانچہ وہ اس کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"یہ علمائے ملت حنفیہ بیضاری کی تفسیروں سے ماخوذ ہے، میں نے اس کا نام قرآن القرآن بالبیان" رکھا ہے، میں کلیم اللہ جہان آبادی مذہباً حنفی اور مشرباً صوفی ہوں، تصنیف ۱۱۲۵ھ میں مکمل ہوئی ہے[1]

غالباً یہ تفسیر الگ سے نہیں شایع ہوئی ہے البتہ ۱۲۹۰ھ میں میرٹھ کے مطبع احباب سے شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمۂ قرآن پاک کے حواشی پر طبع ہوئی ہے، جس کے ساتھ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی کہی ہوئی یہ تاریخ بھی درج ہے۔

کار فرمائے مطبع احباب	شیخ عرفان حق جوان دبیر
اور مختار ہاشمی مطبع	کون ہاشم علی با تدبیر
چھاپا ہو کرکے جمع دونوں نے	ایسا مصحف نہیں ہے جسکی نظیر
بیچ میں ترجمہ ہے اور اوپر	ایک تفسیر کی نئی تحریر
وہ تو فیض شہ رفیع الدین	بحر مواج فیض خیز کثیر
اور یہ فیض شہ کلیم اللہ	تھے طریقت میں جو کہ بدر منیر
چھپ چکا جبکہ سب یہ حرز جاں	ہاتف غیب نے پئے تشہیر
کرکے آواز کو بلند کہا	چھپا قرآن بمعنی و تفسیر
	۱۲۹۰ھ

مولانا قاسم صاحبؒ نے یہ تاریخ بھی نکالی تھی:

---

[1] ورق ۲ الف

کیا خوب واہ کیا خوب ۱۲۹۰ھ ختم المصاحف ۱۲۹۰ھ

کیا خوب چھاپا کیا خوب ۱۲۹۰ھ (بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص۴۹۱ و ۴۹۲)

ماخذ | اس تفسیر میں جن اہم قدیم تفسیروں سے مدد لی گئی ہے، شاہ صاحب کی وضاحت کے مطابق ان کے نام یہ ہیں۔ بیضاوی، مدارک، جلالین اور تفسیر حسینی۔

مجموعی حیثیت سے یہ اچھی اور بہتر تفسیر ہے، مفسر حنفی تھے اس لیے اس کے اثر سے خالی نہیں ہے، اس کی ترتیب جلالین کے انداز پر کی گئی ہے، لیکن اختصار کا یہ حال ہے کہ بعض جگہ صرف دو تین جملے اشارتاً لکھے گئے ہیں، سبب نزول کی وضاحت قدرے تفصیل سے کی گئی ہے، مسائل میں احادیث سے بھی استنباط کیا گیا ہے، البتہ الفاظ و لغات کی بحثیں کم ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ تفسیر ہماری نظر سے نہیں گزری ورنہ اس کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی جاتی۔

قرآنیات پر دارالمصنفین کی کتابیں

ارض القرآن حصہ دوم :۔ (از مولانا سید سلیمان ندوی)

اس حصے میں قرآن مجید میں مذکور اقوام، مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسمٰعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳۰ روپے۔

مقالات سلیمان حصہ سوم :۔

اس حصے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ قیمت ۴۵ روپے۔

"منیجر"

بہرائچ کے بعض صوفیہ کرام

از جناب معین احمد علوی

(۲)

۴۔ حضرت مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی

خوش قسمتی سے شاہ نعیم اللہ صاحبؒ کے خاندانی کتب خانہ سے مولانا شاہ محمد اسلم صاحب مرحوم اور مکرمی اعزاز الحسن صاحب کی عنایات سے راقم الحروف کو مولانا کی ایک خود نوشت سوانح عمری استفادہ کرنے کو مل گئی جو اپنے برادر گرامی قدر بخش اللہ کے بار بار اصرار پر تحریر فرمائی تھی، اس مضمون میں اسی رسالہ کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

پیدائش | مولانا شاہ نعیم اللہ کی پیدائش موضع بھدوانی پرگنہ فخرپور علاقہ گنڈارہ تحصیل قیصر گنج ضلع بہرائچ میں ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں ہوئی۔ وہ نسباً علوی، مذہباً حنفی، مشرباً مجددی اور وطناً بہرائچی تھے۔ نسبی شجرہ اس طرح ہے۔

نعیم اللہ بن[1] غلام قطب[2] الدین عرف ملک کالے، بن ملک[3] غلام محمد، بن[4] ملک آدم، بن[5] ملک مبارک بن ملک[6] جلال، بن نصیر[7] الدین، بن ملک شیبت[8]، بن[9] ملک احمد[10] بن ملک حسام[11] الدین۔

ملک حسام الدین، ملک علی اور ملک موجی تینوں بھائی تھے۔ موضع بھدوانی میں انکے مزارات آج بھی زیارت گاہ خلائق ہیں[1]۔ یہ تینوں بھائی قصبہ کول (علی گڑھ)

---

[1] مراۃ الاسرار

سے آکر موضع بھدروانی میں آباد ہوئے۔ یہ لوگ خواجہ ابوالقاسم و خواجہ بڈی کی اولاد سے ہیں جو چتوڑ میں شہید ہوئے۔ ان لوگوں کا تعلق حضرت خواجہ عماد مخلصؒ کی اولاد سے ہے۔ جو سید سالار مسعود غازیؒ کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور قصبہ کنتور میں شہید ہوئے۔ اس کے بعد ان کی اولاد نے قصبہ کول میں سکونت اختیار کرلی۔

موضع بھدروانی میں سکونت کا سبب یہ حضرات ایک تقریب کے سلسلے میں قصبہ کول سے بہرائچ کے حدود میں آئے۔ ایک دن سیر کرتے اور شکار کھیلتے موضع بھدروانی پہونچے۔ ناگاہ ان کو ایک خرگوش دکھائی دیا۔ ان لوگوں نے اس پر شکاری کتے چھوڑ دیے۔ تھوڑی دور تک تو بھاگ دوڑ رہی اس کے بعد ایک جگہ خرگوش مڑ کر کتوں پر حملہ آور ہوگیا۔ ان شکاریوں نے اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ اس مقام کی خاک مردم خیز اور جرأت آموز معلوم ہوتی ہے اس لیے یہاں وطن بنانا چاہیے۔ اس زمانہ میں یہاں بھڑ قوم کی آبادی و عملداری تھی۔ ان لوگوں نے مزاحمت کی اور جنگیں لڑیں۔ کافی لوگ شہید ہوئے۔ بالآخر ان ہی بزرگوں کی فتح ہوئی اور وہیں آباد ہوئے۔ اس موضع کے پورب جانب پاکر (پکریا) کے درخت کے قریب شہیدوں کی جو قبریں اور گنج شہیداں ہے وہ ان ہی شہداء کے مزارات ہیں۔

ملک حسام الدین اور ان کے اکثر ساتھی نیک اطوار متقی و پرہیزگار تھے۔ ملک اور خواجہ کا خطاب اس زمانہ کے دستور کے مطابق بادشاہ اپنے اچھے ارکان اور منتظمین کو دیتے تھے۔ ان بزرگوں میں بھی اچھی صلاحیتیں تھیں اسلیے ملک کہلائے۔

تعلیم و تربیت شاہ نعیم اللہ کے والد زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن انسانی فضائل حیا و شرم، غیرت و محبت سے آراستہ تھے۔ باقی خاندان بھی علم کی وراثت سے مالامال

تھا۔ ان کے چچا ملک بدیع الزماں بڑے ذہین اور عربی کی اچھی قابلیت رکھتے تھے اور فارسی میں قاضی محمد شفیع بہرائچی کے شاگردوں میں تھے۔ دادا نے مفتی محمد تائب لکھنوی سے علم حاصل کیا تھا۔ مخدوم احمدی و مخدوم شیخ پیارے کی اولاد میں خلیفہ حسن بہرائچی جو علوم ظاہری و باطنی میں پایہ کے بزرگ تھے ان کے اولاد پسری نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنی لڑکی ان سے منسوب کرکے اپنا قائم مقام کیا اسی لیے یہ لوگ بہرائچ آکر سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

شاہ نعیم اللہ کی والدہ ماجدہ بھی سیدہ تھیں ان کا گھرانا بھی علم کی دولت سے مالا مال تھا۔ وہ نسباً مخدوم سید بڈھن سے تعلق رکھتی تھیں۔

مولانا نعیم اللہ کی شادی دختر قاضی عطاء اللہ بن شیخ بیچا بن شیخ بدلی بن احمد بن قاضی غلام مصطفےٰ بن قاضی دانیال برادر قاضی جمال الدین عرف چندن کے ساتھ ہوئی اور ان کی وفات کے بعد دوسری شادی دختر سید ابو علی بن سید محمد رضا بن سید عنایت بن سید جعفر بن مظفر بن سید بدلی بن سید راجی کے ساتھ ہوئی۔ جن کا مکان شہر کاشغر محلہ ملا درد میں تھا اور سادات بنی فاطمہ میں سے تھے مولانا نعیم اللہ کی پیدائش ۱۱۵۳ھ میں ہوئی اور بسم اللہ کی رسم سات سال کی عمر میں میاں جیو شیخ محمد روشن بہرائچی کی خدمت میں ادا ہوئی۔ اس کے بعد ان کی پھوپھی نے ان کو اپنی فرزندی میں لے کر اپنے صاحبزادہ شیخ عطاء اللہ بن شیخ بیچا کے سپرد کیا لیکن جلد ہی ان کی وفات ہوگئی بقیہ تعلیم سرائے کے مدرسہ میں ہوئی۔ ایک سال کے عرصہ میں قرآن شریف ختم کیا۔ فارسی و عربی تعلیم کی طرف بھی توجہ رہی، انکے چچا مولوی بدیع الزماں صاحب کے ملفوظات ان کے طلب علم کے شوق کو بڑھاوا

دیتے ہیں۔

۱۱۱۷ھ میں جبکہ شاہ نعیم اللہ کی عمر سولہ سال کی تھی وہ حاجی فتح علی کے ساتھ لکھنؤ گئے اور معالی خاں کی سرائے میں تکیہ شاہ ابراہیم بن حضرت شاہ معصوم میں میاں علی رضا صاحب کی خدمت میں پڑھنے لگے۔ جب وہ حج کو چلے گئے تو وقت کے مشہور فاضل مولوی محمد خلیل (شاہ بدر علی صاحب کے والد) کی خدمت میں صرف ونحو پڑھی۔ ان کے وصال کے بعد شاہجہاں پور میں مولوی امام بخش صاحب سے اور اس کے بعد بریلی میں مولوی شہاب الدین سے مسجد میرزائی میں تحصیل علم کی۔ کچھ عرصہ بعد دہلی کے مدرسہ دارانگر میں مولوی برکت علی الہ آبادی کے مدرسہ میں مولوی سالم علی سے اسباق شروع کیے۔ اسی دوران ان کے والد صاحب کا آدمی طلبی کا حکم لے کر پہونچا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ والد صاحب میری تلاش میں مرادآباد تک آئے ہیں وہیں مجھے بلایا ہے۔ مجبوراً مرادآباد مکان ملک فیض اللہ پر ہوتا ہوا معہ والد صاحب کے وطن آیا اور چند سال قیام کیا۔ لیکن طلب علم کے شوق نے چین نہ لینے دیا اور تکمیل علم کی لگن لگی رہی۔ باوجود بار بار اجازت مانگنے کے کوئی بھی راضی نہ ہوا۔ آخر ۱۱۲۰ھ میں بغیر والدین سے رخصت ہوئے پوشیدہ طور سے لکھنؤ روانہ ہو گیا اور تکیہ شاہ محمد عاقل سبز پوش چشتی کاکوروی میں شاہ بدر علی کے یہاں قیام کر کے ملا نظام الدین لکھنوی کے شاگرد مولوی محمد ولی بن قاضی غلام مصطفیٰ بن ملا اسعد بن قطب الدین شہید سے کتب درسیہ کی تکمیل کی۔ علم فرائض و خلاصۃ الحساب مولوی مفتی عبدالرب لکھنوی سے پڑھا۔ کتب احادیث دہلی میں شیخ احمد شاگرد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے، قرأت جزری وغیرہ قاری یوسف

خسلانی سے پڑھی۔ یہاں تک کہ سنہ ۱۱۸۶ھ میں خدا طلبی کی لگن پیدا ہوئی اور قسمت
سے حضرت شاہ محمد جمیل قدس سرہٗ (خلیفہ اجل حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ)
لکھنؤ تشریف لائے اور ان کے ارشاد کا شہرہ بلند ہوا۔ میں نے بھی ذوق وشوق
میں حاضر ہوکر توجہ کی درخواست کی۔ بحمد اللہ ایک ہی توجہ میں دل ذاکر ہوگیا
اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے جذب وشوق سے مالامال ہوگیا۔ ذکر قلبی وغیرہ
میں نے ان ہی سے سیکھا اور انھیں کی رہنمائی میں حضرت میرزا مظہر جان جاناں
کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چار ماہ قیام کیا۔ جب میرزا صاحب پانی پت جانے لگے
تو مجھے بھی وطن جانے کا حکم دیا۔ وطن آکر دو سال قیام کیا۔ لیکن حضرت میرزا
صاحب کے فراق نے بے چین کر دیا۔ آخر سنہ ۱۱۸۹ھ میں بغیر کسی کو اطلاع دیے دہلی
روانہ ہوگیا۔ ۱۹ رمضان کو دہلی حاضر ہوکر مکمل چار سال دن ورات انکی خدمت
میں حاضر رہ کر خرقہ اور اجازت طریقہ نقشبندیہ وقادریہ وچشتیہ وسہروردیہ
سے مشرف ہوکر وطن آیا۔

اس چار سالہ قیام میں کامل یکسوئی کے ساتھ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر تکمیل سلوک
کی۔ یکسوئی کا یہ عالم تھا کہ اس چار سالہ قیام میں وطن سے جتنے خطوط آتے تھے
سب کو بغیر پڑھے یکجا رکھتے جاتے تھے کہیں ان کے پڑھنے سے جمعیت خاطر میں
فرق نہ آجائے۔ چار سال بعد پھر وطن سے طلبی ہوئی۔ میرزا صاحب نے گھر جانے
کا حکم دیا اور چلتے وقت ازراہ توجہ وشفقت باطنی تاسف اور حسرت سے
فرمایا کہ:

"یہ چار سالہ صحبت دوسروں کی بارہ سال کی محنت کے برابر ہے، انشاء اللہ

اس فیض سے ایک عالم منور ہوگا۔ تمہارا لکھنؤ کا قیام زیادہ بہتر ہوگا۔ شادی کے لیے فرمایا کہ اتباع سنت نبوی ہے۔ وہ بھی ظہور میں آئی۔ میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔"

اس کے بعد ۱۲۰۵ھ ہجری میں پیرو مرشد کے مزار کی تعمیر کے سلسلے میں دہلی چلا گیا اور آج جبکہ ۱۲۰۸ھ ہجری ہے اور عمر کی چھپن منزلیں طے کر چکا ہوں۔ چار بار دہلی کا سفر کیا اور بار ہا افغانوں کے ملک کی سیر کی اور دو بار پانی پت جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار مکمل چالیس روز حضرت مولوی ثناء اللہ پانی پتی کی خدمت میں بسر کیے۔ ان کی توجہ اور فیض صحبت سے ظاہری اور باطنی علوم کی تحقیقات و تدقیقات تامّہ سے استفادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ فیض ہمارے سب کے سروں پر قائم رکھے انکا ایسا حضرت پیرو مرشد کے خلفا میں کوئی نہیں ہے۔

دہلی سے واپس آکر کچھ دنوں بہرائچ میں قیام کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے[1]۔ وہاں قندہاری بازار کے متصل بنگالی ٹولہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہاں آپ نے مکان و مسجد بنوائی تھی۔ سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ یہ محلہ غدر کے بعد بالکل کھود ڈالا گیا۔ اب صرف مسجد باقی ہے۔ جو مراد علی لین واقع امین آباد برلنگٹن ہوٹل کے قریب واقع ہے۔

بہرائچ میں آپ کے ذریعہ علوم دین نے بڑا رواج پایا۔ اب تک آپ کے خاندان کی بڑی عزت اور احترام ہے۔ معمولات مظہریہ کے دیباچہ میں ہے کہ آپ باوجود ظاہری بے سروسامانی کے توکل بہت غالب تھا۔ اور طالبان خدا کو ذاکر و شاغل بنانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خطرۂ قلب پر بہت جلد متنبہ فرما کر اصلاح فرماتے۔

---

[1] معمولات مظہریہ ص۳۔

اکثر طالبوں نے شہرت حاصل کی۔ آپ کے خلفاء میں بزرگ تر حضرت مولوی محمد احسن صاحب اٹک کے رہنے والے بہت مشہور ہوئے۔ ان کی ذات سے علاقہ بنگال میں سلسلۂ مجددیہ کی اشاعت بہت ہوئی اور مولوی مراد اللہ صاحب تھانیسری جنھوں نے اپنے پیر کی محبت میں بہرائچ میں قیام اختیار کیا۔ مزار آپ کا لکھنؤ میں ہے۔ مولانا شاہ بشارت اللہ صاحب آپ کے بھانجے اور داماد بھی بہت مشہور ہوئے۔ ان کی ذات سے بہرائچ کے قرب وجوار میں منہیات شرع سے لوگوں نے خوب دوری حاصل کی اور تائب ہوکر برائیوں سے الگ ہوئے۔

حضرت شاہ غلام علیؒ خلیفۂ حضرت مظہر جان جاناں دہلوی اپنی کتاب مقامات مظہری میں ص۱۱۱ پر شاہ نعیم اللہ بہرائچی کے متعلق لکھتے ہیں:

"آپ کی صحبت میں دلوں کو جمعیت اور حضور حاصل ہوتا تھا۔ آپ کمال استقامت اور پیروی سنت نبویؐ میں نہایت کامل اور اخلاق حسنہ سے آراستہ تھے۔ گوشۂ صبر وقناعت کے ساتھ یادِ الٰہی میں وقت بسر کرتے۔"

"ظاہری وباطنی امراض کے علاج میں ممتاز تھے" (ص۱۰۱)

تاریخ آئینہ اودھ میں ہے کہ آپ مہمان نوازی میں بھی بے مثل تھے (ص۱۳۵)

تصانیف میں آپ کی دو کتابیں بشارات مظہریہ اور معمولات مظہریہ بہت مشہور ہوئیں۔ معمولات مظہریہ تو متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ بشارات مظہریہ کو آپ نے اپنے چار سالہ دہلی کے قیام میں تالیف کیا تھا۔ تکمیل کے بعد اس کو میرزا صاحب علیہ الرحمۃ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے اس پر اصلاحیں بھی دیں۔ لیکن جب شاہ نعیم اللہ خرقۂ اجازت وخلافت حاصل کر کے (۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء) اپنے وطن بہرائچ لوٹنے لگے تو

اس فیض سے ایک عالم منور ہوگا۔ تمھارا لکھنؤ کا قیام زیادہ بہتر ہوگا۔ شادی کے لیے فرمایا
کہ اتباع سنت نبوی ہے۔ وہ بھی ظہور میں آئی۔ میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔"

اس کے بعد ۱۲۰۵ھ ہجری میں پیر و مرشد کے مزار کی تعمیر کے سلسلے میں دہلی چلا گیا اور آج جبکہ ۱۳۰۸ھ ہجری ہے اور عمر کی چھپن منزلیں طے کر چکا ہوں۔ چار بار دہلی کا سفر کیا اور ۴ بار افغانوں کے ملک کی سیر کی اور دو بار پانی پت جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار مکمل چالیس روز حضرت مولوی ثناء اللہ پانی پتی کی خدمت میں بسر کیے۔ ان کی توجہ اور فیض صحبت سے ظاہری اور باطنی علوم کی تحقیقات و تدقیقات تازہ سے استفادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ فیض ہمارے سب کے سروں پر قائم رکھے انکا ایسا حضرت پیر و مرشد کے خلفا میں کوئی نہیں ہے۔

دہلی سے واپس آکر کچھ دنوں بہرائچ میں قیام کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے[1]۔ وہاں قندھاری بازار کے متصل بنگالی ٹولہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہاں آپ نے مکان و مسجد بنوائی تھی۔ سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ یہ محلہ غدر کے بعد بالکل کھود ڈالا گیا۔ اب صرف مسجد باقی ہے۔ جو مراد علی لین واقع ایبٹ آباد و برلنگٹن ہوٹل کے قریب واقع ہے۔

بہرائچ میں آپ کے ذریعہ علوم دین نے بڑا رواج پایا۔ اب تک آپ کے خاندان کی بڑی عزت اور احترام ہے۔ معمولات مظہریہ کے دیباچہ میں ہے کہ آپ باوجود ظاہری بے سر و سامانی کے توکل بہت غالب تھا۔ اور طالبان خدا کو ذاکر و شاغل بنانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خطرۂ قلب پر بہت جلد متنبہ فرما کر اصلاح فرماتے۔

---

[1] معمولات مظہریہ صفحہ ۳۔

اکثر طالبوں نے شہرت حاصل کی۔ آپ کے خلفاء میں بزرگ تر حضرت مولوی محمد احسن صاحب اٹک کے رہنے والے بہت مشہور ہوئے۔ ان کی ذات سے علاقہ بنگال میں سلسلۂ مجددیہ کی اشاعت بہت ہوئی اور مولوی مراد اللہ صاحب تھانیسری جنھوں نے اپنے پیر کی محبت میں بہرائچ میں قیام اختیار کیا۔ مزار آپ کا لکھنؤ میں ہے۔ مولانا شاہ بشارت اللہ صاحب آپ کے بھانجے اور داماد بھی بہت مشہور ہوئے۔ ان کی ذات سے بہرائچ کے قرب و جوار میں منہیات شرع سے لوگوں نے خوب دوری حاصل کی اور تائب ہو کر برائیوں سے الگ ہوئے۔

حضرت شاہ غلام علیؒ خلیفۂ حضرت مظہر جان جاناں دہلوی اپنی کتاب مقاماتِ مظہری میں ص۱۱۰ پر شاہ نعیم اللہ بہرائچیؒ کے متعلق لکھتے ہیں :

"آپ کی صحبت میں دلوں کو جمعیت اور حضور حاصل ہوتا تھا۔ آپ کمال استقامت اور پیروی سنت نبویؐ میں نہایت کامل اور اخلاق حسنہ سے آراستہ تھے۔ گوشۂ صبر و قناعت کے ساتھ پامالی میں وقت بسر کرتے"

"ظاہری و باطنی امراض کے علاج میں ممتاز تھے" (ص۱۱۰)

تاریخ آئینہ اودھ میں ہے کہ آپ مہمان نوازی میں بھی بے مثل تھے (ص۱۲۵)

تصانیف میں آپ کی دو کتابیں بشارات مظہریہ اور معمولات مظہریہ بہت مشہور ہوئیں۔ معمولات مظہریہ تو متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ بشارات مظہریہ کو آپ نے اپنے چار سالہ دہلی کے قیام میں تالیف کیا تھا۔ تکمیل کے بعد اس کو میرزا صاحب علیہ الرحمتہ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے اس پر اصلاحیں بھی دیں۔ لیکن جب شاہ نعیم اللہ خرقۂ اجازت و خلافت حاصل کر کے (۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء) اپنے وطن بہرائچ لوٹنے لگے تو

میرزا صاحب نے انہیں اس کی اشاعت سے منع کر دیا۔ عقیدت مند مرید نے شایع تو نہیں کیا لیکن تبرک اور پاس ادب کی نیت سے اپنے پاس محفوظ رکھا ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹-۹۰ء میں پھر اپنے احباب طریقت اور پیر بھائیوں کے اصرار پر باقی ماندہ اجزا کو مرتب کر کے استخارہ مسنون کیا۔ کتاب کی تکمیل کی۔ کتاب کے مخطوطہ کے آخر میں ۱۰ محرم ۱۲۰۷ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۷۹۲ء درج ہے۔ ایک عرصہ سے اس کتاب کا مخطوطہ غائب تھا۔ اب معارف ۱۹۷۸ء میں عبدالرزاق قریشی مرحوم (انجمن اسلام بمبئی) نے تفصیلی مقالہ لکھ کر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس کتاب سے میرزا صاحبؒ کی زندگی کے بعض ایسے حالات معلوم ہوتے ہیں کہ جن کا ذکر کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔"

"اس کا انداز بیان صاف اور سادہ ہے۔ کتاب سلسلۂ مظہریات کی اہم کڑی ہے اور میرزا مظہرؒ کا کوئی سوانح نگار اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔"

اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے جس میں ۲۰۹ اوراق ہیں ورق ۲۱۰ سے میرزا صاحب کے نامور مرید قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ کی ایک تصنیف السیف المسلول کے چند اوراق ہیں اس طرح اس کتاب کے کل اوراق کی تعداد ۲۱۲ ہے۔ مخطوطہ کی کتابت ۱۰ محرم ۱۲۰۷ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۷۹۲ء کی ہے۔ اس کتاب کے متن کا فوٹو حضرت مولانا ابوالحسن زید صاحب خانقاہ ابوالخیر دہلی نے منگوایا ہے۔

دو مطبوعہ رسالے انفاس الابرار اور انوار الضمائر بھی مطبوعہ ہیں ان میں

خاندان نقشبندیہ مجددیہ کے خصوصیات میں یہ عرصہ ہوا نولکشور پریس نے مجموعہ کے طریقہ پر چھاپے تھے اب نایاب ہیں۔

غیر مطبوعہ تصانیف میں۔ میر زاہد اور ملا جلال پر آپ کا حاشیہ موجود ہے۔ ایک خود نوشت سوانح عمری۔ ایک مثنوی اپنے پیر کے حالات میں ہے جو تقریباً ایک جز کی ہے، خانقاہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ آپ نے بڑا اچھا کتب خانہ جمع کیا تھا جو زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوا۔

آپ کے دو عقد ہوئے۔ جس سے صرف ایک صاحبزادی یادگار رہیں۔ جن کا عقد آپ کے حقیقی بھانجے شاہ بشارت اللہ کے ساتھ ہوا۔ جن سے شاہ ابوالحسن پیدا ہوئے۔

وصال آپ کا ۵ صفر ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء یوم جمعہ نماز عصر کے سجدہ میں ہوا۔ مزار مبارک مولوی باغ گورنمنٹ کالج کے سامنے عین لب سڑک ہے بابرکت جگہ ہے۔ معمولات منظریہ میں ذیل کا قطعہ تاریخ وفات درج ہے۔

مولوی صاحب نعیم اللہ در وقت نماز — بہر سجدہ سر نہادہ کرد رحلت زین جہان
سال تاریخش چو انور باد ل غمگین بجست — ہاتف گفتا ز سر شد سوئے حق راہ روان
۱۲۱۸ھ

بزم صوفیہ

یعنی عہد تیموری سے پہلے کے صوفیہ کرام حضرت شیخ ابوالحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، قاضی حمید الدین ناگوریؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، ابو علی قلندر پانی پتیؒ، خواجہ فرید الدین عراقیؒ، خواجہ گیسو درازؒ وغیرہ کے مستند حالات اور تعلیمات۔ قیمت ۱۵ روپیے

از سید صباح الدین عبدالرحمن

"منیجر"

اخبار علمیہ

ماریشس، بحر ہند کا خوبصورت جزیرہ ہے، اس کے سرسبز درختوں، خوشنما پھولوں، سرخ زمین اور صاف و شفاف ساحلوں کی مانند اس کے باشندوں کی تہذیب اور زبان میں بھی بڑی رنگارنگی ہے، بحری جائے وقوع کی اہمیت کی وجہ سے یہ عرب، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز حوصلہ مندوں کی آماجگاہ رہا، ہندوستانی یہاں مزدور اور تاجر کی حیثیت سے آئے اور اب غالب تعداد انہی کی ہے، ایک ملین کی آبادی میں ۵۱٪ ہندو اور ۱۷٪ مسلمان ہیں مقامی کریسے اول (CREOLE) ۲۵٪ چینی ۳٪ اور فرنکو ماریشین ایک فیصد ہیں، مسلمانوں میں زیادہ تعداد بہاری مسلمانوں کی ہے جن کو کلکتیا، بھی کہا جاتا ہے، کچھ تجارت پیشہ مسلمانوں کا تعلق سورت اور کچھ سے ہے، رنگ و نسل کے فرق کی طرح ان کی زبانیں بھی متعدد ہیں۔ مقامی کریسے اول کے علاوہ ہندی، اردو، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں رائج ہیں، ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات تقریباً ایک درجن زبانوں میں ہوتی ہیں اور تیس سے زیادہ اخبارات و رسائل شایع ہوتے ہیں، شرح خواندگی ۹۰٪ ہے، پرائمری اسکولوں میں ۴۰٪ سے زیادہ طلبہ ہندی پڑھتے ہیں، چارسو مکاتب میں اردو اور عربی کی تعلیم دی جاتی ہے، دسمبر میں یہاں عالمی اردو کانفرنس ہوئی، اس سے پہلے ہندی، تامل، تیلگو اور مراٹھی کی کانفرنسیں بھی ہو چکی ہیں، اردو کانفرنس میں ہند و پاکستان کے علاوہ جنوبی افریقہ، سعودی عرب، روس، فرانس اور کناڈا وغیرہ کے نمائندے بھی شریک ہوئے،

رسالہ 'نیشن اینڈ دی ورلڈ' کے مدیر جناب سید حامد نے کانفرنس کی مفصل اور پُر از معلومات روداد تحریر کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستانی وفد بیس ارکان پر مشتمل تھا، افتتاح کے موقع پر ماریشس کے گورنر جنرل سر ویرا سامی رنگاڈو اور وزیر اعظم شری انورود جگناتھ کے علاوہ وزرا و عمائد کی بڑی تعداد موجود تھی، کانفرنس کے آٹھ سیشن ہوئے، ان میں اردو کے سماجی و تہذیبی پس منظر موجودہ اردو ادب' اردو اور فنون لطیفہ اور عالمی سطح پر مطالعات اردو اور دوسرے مسائل زیر بحث آئے، اقوام متحدہ کی زبانوں میں اردو کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور پانچ علمی مرکزوں کناڈا، ماریشس، سعودی عرب، پاکستان اور ہندوستان پر مشتمل ایک وسیع نٹ ورک کی تجویز بھی منظور ہوئی۔

گذشتہ ماہ نومبر میں اندلس کے شہر قرطبہ میں علامہ اقبال کی یاد میں ایک بین الاقوامی اجتماع ہوا، اس کی دلچسپ روداد پاکستان کے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے قلم سے ہفت روزہ ایشیا، لاہور میں شایع ہو رہی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ 'اسلام اور مغرب' نامی تنظیم کے صدر اور قرطبہ کے ایک ثقافتی مرکز کے ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر فرانسس لامان نے اسلام اور مغرب کو باہم قریب ہونے اور سمجھنے کی غرض سے اس کانگریس کے انعقاد میں سرگرم حصہ لیا، ۲۳ ملکوں کے نمائندوں میں مصر، ترکی، مراکش، تیونس، اٹلی، روس، تاجکستان، ایران، جاپان، جرمنی اور برطانیہ وغیرہ کے ممتاز اقبال شناس بھی شامل تھے، پاکستان کے وفد میں ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر منور مرزا وغیرہ بھی شامل تھے، یہ سب سے بڑا وفد تھا، ہندوستان سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور سید مظفر حسین برنی شریک ہوئے، عام طور سے علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بحث کی گئی، مقالات جلد ہی کتابی شکل میں طبع ہونگے۔

عالمی ادارہ صحت نے 'سب کے لیے نباتات اور صحت' کے موضوع پر مسلسل اجتماعات کا

ایک منصوبہ بنایا ہے، اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف علاقوں کا طبی معیار بلند کیا جائے، گذشتہ سال کے وسط میں جاپان کے شہر کوبے میں اس سلسلے کے پہلے اجتماع میں پاکستان کے جناب حکیم محمد سعید نے ایک مشیر کی حیثیت سے شرکت کی، انجمن ترقی طب پاکستان کے ترجمان 'اخبار الطب' نے اس کانفرنس کی تفصیل اور حکیم صاحب کا پُر مغز مقالہ شائع کیا ہے اس میں طب اسلامی کی تاریخ، ابن طبری، ابن سینا اور زکریا رازی کے طبی امتیازات کے علاوہ بابچی، مازو، بن ککٹری، اسرول، اسطوخودوس، اڈوسہ اور آملہ وغیرہ جیسے نباتات کی اہمیت وافادیت کا بھی ذکر ہے، طب اسلامی کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا ہے اس نظام طب میں متعدد مشرقی اقوام کے افکار و تجربات اور تاریخی و معاشرتی ورثہ کی آمیزش سے جو خوبصورت امتزاج بخشا ہے وہ اور کسی نظام طب میں نظر نہیں آتا، عالمی ادارہ صحت کے زیر سایہ سرزمین جاپان پر طب جدید کے تفوق و برتری کے شور میں طب اسلامی کے جسم ناتواں کو شادابی اور تروتازگی بخشنا حکیم صاحب کی مسیحائی کا ثبوت ہے

یورپ کی مشرق نوازی اور علوم اسلامیہ سے خصوصی اعتنا کے اسباب جو بھی ہوں، اس کی کاوشوں کی محنت و جدت بہرحال داد کے لائق ہے۔ ہمبرگ یونیورسٹی کا شعبہ مطالعات مشرق ایک فعال ادارہ ہے، یہ ۱۹۰۸ء میں قائم ہوا تھا، اس میں ترکی، ایرانی، عربی اور اسلامی مطالعات کے علاوہ اسلامی فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ کے لیے بھی ایک شعبہ مخصوص کیا گیا ہے، حال ہی میں ان کے لیے ایک کمپیوٹری فہرست کتابیات مرتب کی گئی ہے اور پیرس۔سربون یونیورسٹی کے مرکز تاریخ برائے اسلامی فنون لطیفہ و آثار قدیمہ کے تعاون سے

ایک وسیع دستاویزی نمائش کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے، تاکہ عالم اسلام کا ایک مصورآ کائیو "مشرق، مغرب" کے نام سے تیار کیا جائے جس میں قدیم و جدید کتابوں، ذاتی ذخیروں اور دوسرے ذرایع کی مدد سے عمارتوں کی تصویریں دستکاری کے مرقعے وغیرہ شامل ہوں، اس شعبہ نے حال ہی میں بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل جرمن زبان میں ایک مجلہ بھی شایع کیا ہے۔

یورپ میں اگر ایک طرف علم و ہنر کا غلغلہ ہے تو دوسری طرف یہ افسوسناک خبر بھی ہے کہ لندن کی رائل کامن ویلتھ سوسائٹی نے مالی مشکلات کی وجہ سے اپنی ۱۲۰ سالہ قدیم و مشہور لائبریری کو بند کرنے اور اس کی کتابوں کو نیلام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ برطانیہ میں اسے "لائبریری کلچر" کے ناقابل تلافی نقصان سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اس کتب خانہ میں ۵ لاکھ سے زیادہ تاریخی، نایاب اور بیش قیمت کتابوں، مخطوطات نقشوں اور رسائل کے ذخیرہ کے علاوہ تقریباً ستر ہزار نہایت قیمتی تصاویر کا خزانہ بھی ہے، بعض فوٹوگراف ۱۸۵۰ء سے پہلے کے ہیں، تشویشناک بات یہ ہے کہ نیلام کے بعد یہ قیمتی ذخیرہ بکھر کر طلبہ اور محققین کی دسترس سے دور ہو جائے گا۔ مسٹر ڈبلو، جے ویسٹ جنکی تازہ تصنیف (THE STRANGE RISE OF SEMI LITERATE ENGLAND: THE DISSOLUTION OF LIBRARIES) نے علمی حلقوں میں ہلچل مچا رکھی ہے، انھوں نے اس کتبخانہ کے ضیاع کو بدترین حادثہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ صرف بیس برس پہلے تک اس کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ع۔ ص۔

معارف کی ڈاک

نابھا سے ایک خط

۹۲-۱-۲۱ - محلہ دیوان - نابھا - پنجاب

مکرم - معظم - محترم - آداب -

" ادب ادب ہے ادب کا نہیں کوئی مذہب - خدا کے فضل سے یہ کفر ہے نہ یہ اسلام" میں نے دوردرشن سے منسٹر انفارمیشن کا اعلان سنا کہ انھوں نے ۲۵ لاکھ روپیہ اردو والوں کو دیا ہے - یہ اردو والے کون ہیں - یہ انھوں نے نہیں بتایا -

آپ نے پچھلے دنوں ڈپٹی انفارمیشن کی ایک کتاب اردو میں ریلیز ہوئی دیکھی ہوگی اردو کی ہر تقریب میں وہ موجود ہوتی ہیں - ان سے کوئی فائدہ حاصل کرنا مشکل نہیں - سوال یہ ہے کہ کیا یہ روپیہ اردو کی بقا کے لیے خرچ ہوگا - یا مشاعروں پر ضایع ہوگا - حضرت اتنے روپوں میں کتنے اردو کے سکول قائم ہو سکتے ہیں کتنی ایسی کتابیں جو نہایت مفید ہیں - اردو اور فارسی کی چھپ سکتی ہیں" فارسی کے ہندو انشا پرداز" لکھنے کا میرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جانیں کہ ہندو فارسی داں تھے - اب آپ " پنجاب میں عربی" پڑھیں گے - نئی باتیں دوں گا - عربی میں بھی پنجاب پیچھے نہیں تھا - چھپنے کی فکر نہیں - ہر ماہ میرے مضامین چھپنے بھی نہیں چاہئیں -

نیاز مند

رام لعل نابھوی

ادبیات

غزل

حضرت عروج زیدی (مرحوم)

"عطائے اذیت" خوشی آپ کی — ستم ہے ستم، دوستی آپ کی
مری بزم ہے واقعی آپ کی — کمی ہے تو شاید کمی آپ کی
نہیں اس میں موجوں کی ہلچل نہیں — طرب کار ہے زندگی آپ کی
وہاں تک شکایت ہی کیوں جائیے — جہاں سے نہ ہو واپسی آپ کی
مری بے خودی خود نما بن گئی — تماشا نگر ہے گلی آپ کی
جہاں سنگ باری بہ ہر گام ہے — وہاں بھی ہے شیشہ گری آپ کی

نہ کیوں معتبر ہو کلام عروج
قلم کا سفر، رہبری آپ کی[۱]

۱؎ الشعراء تلامیذ الرحمٰن۔

مطبوعات جدیدہ

فرہنگ زفان گویا جلد اول (فارسی) تالیف بدر ابراہیم، تصحیح و ترتیب از جناب پروفیسر نذیر احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، بہترین کتابت و طباعت، صفحات ۵۵۲ قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

زفان گویا و جہان پویا ایک قدیم فارسی فرہنگ ہے۔ جس کو نویں صدی ہجری کے اوائل کی تالیف بتایا جاتا ہے، اس کے مولف بدر ابراہیم کا تعلق شیراز ہند جونپور کے ایک ایسے علمی خاندان سے تھا جو فارسی فرہنگ نگاری کے لیے مشہور ہے چنانچہ شرف نامہ مولفہ ابراہیم قوام بھی اسی خاندان کی علمی یادگار ہے، زیر نظر فرہنگ کے مخطوطہ کا علم پہلے خدا بخش لائبریری کے ذخیرہ سے ہوا، بعد میں تاشقند یونی ورسٹی کے کتبخانہ میں بھی اس کے ایک اور قلمی نسخہ کا سراغ ملا۔ اب پروفیسر نذیر احمد نے ان دونوں نسخوں کی مدد سے اس کا متن مرتب کرکے تصحیح و تعلیق اور تحشیہ کے بعد شایع کیا ہے، فاضل مرتب نے اپنے عالمانہ مقدمہ میں زفان گویا کے اصل نام اسکے مولف اور اس کے خاندان، تاریخ تالیف اور فرہنگ کے مآخذ و مندرجات کے بارہ میں مفید اور ضروری معلومات بھی جمع کر دیے ہیں، اسی ضمن میں بعض دوسرے محققین حافظ شیرانی وغیرہ کی چند غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے، اور فرہنگ کی خوبیاں دکھانے کے ساتھ اس کے نقائص کی نشاندہی بھی کی ہے، فارسی لفظوں کی تشریح میں مولف نے سینکڑوں ایسے ہندوستانی الفاظ بھی نقل کیے تھے جو خاص طور پر دیار پورب میں بولے جاتے تھے وہ اب بھی رائج ہیں، فاضل مرتب نے ان سب لفظوں کی نشاندہی کرکے

مولف کے جو مپوری ہونے کی ایک بڑی داخلی شہادت فراہم کردی ہے، آخر میں الفاظ واسماء واماکن کا اشاریہ بھی درج ہے، مقدمہ فارسی کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی ہے اس بیش قیمت مخطوطہ کی اشاعت پر خدا بخش اورینٹل لائبریری مبارکباد کی مستحق ہے۔

معیار از جناب قاضی عبدالودود، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۰۰، قیمت ۵۰ روپیے، ناشر: خدابخش لائبریری پٹنہ، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی اردو شاخ پٹنہ کی جانب سے جناب قاضی عبدالودود نے ایک تحقیقی وادبی رسالہ معیار اس مقصد سے نکالا تھا کہ وہ ادب میں اجتہادی شان کا حامل ہو اور کسی طرز خاص کا پابند نہ ہو، افسوس کہ معیار نے حیات مستعار کم پائی اور صرف چھ اشاعتوں کے بعد وہ بند ہوگیا، لیکن اس مختصر عرصہ میں بھی اس نے اپنے بلند پایہ اور متنوع ادبی وتحقیقی مضامین کی وجہ سے اصحاب علم اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کرلیا تھا معیار کا بڑا حصہ خود قاضی صاحب کی تحریروں سے مزین ہوتا تھا، مقالات کے علاوہ معروضات، تعارف، مطبوعات جدیدہ، اخبار ادب، استفسارات وغیرہ مختلف عنوانوں کے تحت ان کی جو تحریریں رسالہ میں درج ہوتی تھیں ان سے ان کے بلند درجہ ومعیار کا اندازہ ہوتا ہے، معروضات کے ذیل میں اردو زبان کے متعلق انھوں نے جو اظہار خیال کیا ہے وہ اب بھی معنویت سے خالی نہیں ہے اور ادب کے طالب علموں کے مطالعہ کے لائق ہے مئی ۱۹۳۶ء کا ایک اداریہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں گاندھی جی کی لسانی پالیسی سے متعلق مستقبل میں یہ شبہات ظاہر کیے گئے تھے کہ "گاندھی جی کے راج میں اردو بولنے والوں کے لیے مزید سہولتوں کا حاصل ہونا تو درکنار، اسکی وہ حیثیت

باقی نہ رہے گی جو آج ہے، ہندی کو ملک کی زبان قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو دفتروں اور عدالتوں سے خارج کی جائے گی ..." ان کا یہ طنزیہ فقرہ آج بھی پُر لطف ہے "کیا آپ ایسے شخص کو قائل کر سکتے ہیں جو عالم بالا سے براہ راست تعلقات رکھتا ہے اور جس کا ہر قول و فعل دیوتاؤں کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے؟" رسالہ معیار کے تمام شماروں کو از سر نو یکجا کرکے اور عکسی صورت میں شایع کرکے ادارہ خدابخش لائبریری نے قابل تحسین خدمت انجام دی ہے، جناب عابد رضا بیدار کا مقدمہ دلچسپ اور قاضی صاحب کے طرز نگارش کا عمدہ جائزہ ہے۔ آخر میں ایک تجزیاتی اشاریہ اور معیار کے اور مضمون نگاروں کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

قافلہ اہل دل مرتبہ از جناب مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم، متوسط تقطیع

کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۲، قیمت ۲۵ روپیے

پتہ: الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ اجل اور مجددیہ رموز و معارف کے وارث شاہ عبداللہ غلام علیؒ دہلوی نقشبندی کی ذات بابرکات سے ہندوستان میں اصلاح نفوس اور تزکیہ باطن کا غیر معمولی کام انجام پایا، ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں سے بھی تشنگان رشد و ہدایت ان کی جانب کھنچے چلے آتے تھے، ان کے متعلق مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ کا یہ قول مشہور ہے کہ 'عشق کی دو دوکانیں دیکھیں ایک تو شاہ غلام علی صاحب اور دوسری شاہ آفاق کی کہ ان دوکانوں میں عشق کا سودا بکا کرتا تھا، شاہ غلام علیؒ کے ایک ممتاز مسترشد اور خلیفہ شاہ رؤف احمد رافتؒ مجددی رامپوری نے درالمعارف کے نام سے اپنے مرشد کے بعض ملفوظات و مکتوبات جمع کیے تھے۔

جو فارسی زبان میں تھے عرصہ ہوا مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم نے ان کا اردو ترجمہ کرکے ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں بالاقساط شایع کیا تھا، جو اب کتابی صورت میں طبع ہوا ہے، مولانا فریدی مرحوم خود صاحب دل بزرگ تھے، اس لیے رشد و ہدایت کے ان انمول مضامین کے ترجمہ میں بھی لطف و لذت اور سرور و سرمستی کی پوری کیفیت موجود ہے جس کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، فاضل مترجم نے شاہ صاحب کے چند نامور خلفاء شاہ ابو سعید مجددی، ملا خدا بردی ترکستانی، شاہ سعد اللہ، شاہ رؤف احمد، مولانا بشارت اللہ بہرائچی، مولانا خالد شہرزوری کردی اور مولانا اخوند جان فخر ہزاروی وغیرہ کے مختصر حالات بھی دے دیے ہیں۔

تذکرہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ و شاہ ابوالرضا دہلویؒ

مرتبہ از مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم مع ضمیمہ "اہل قبور کی زندوں سے ہم کلامی" از جناب مولانا محمد منظور نعمانی، چھوٹی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۲، قیمت ۱۴ روپیے، پتہ: الفرقان بکڈپو نظیر آباد (۳۱ نیا گاؤں مغربی)، لکھنؤ۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یگانۂ روزگار اور نابغہ عصر شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم فاروقی اور عم بزرگوار شاہ ابوالرضا دہلوی کا بڑا دخل تھا، یہ دونوں بزرگ علم و عمل، اتباع شریعت، صلاح و تقویٰ اور توکل و استغنا میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، ان دونوں کے حالات و سوانح جستہ جستہ انفاس العارفین، نزہۃ الخواطر، حیات ولی، مزارات اولیائے دہلی، انفاس رحیمیہ اور ارشاد رحیمیہ میں موجود تھے، مولانا نسیم احمد مرحوم نے مذکورہ بالا کتب کی مدد سے ان حضرات کے حالات اور مکتوبات و ملفوظات کے بکھرے ہوئے موتیوں کو سلیقہ سے ایک لڑی میں

پردہ دیا ہے، یہ مجموعہ مطالعہ کے لائق ہے، شاہ عبدالرحیم کی نسبت سے اہل قبور سے ہمکلامی کے بعض واقعات ملتے ہیں، ان کے تعلق سے پیدا ہونے والے شبہات کے شافی و کافی جواب کیلئے مولانا منظور نعمانی نے ایک عمدہ تحریر سپرد قلم کی تھی جس کو ضمیمہ کے طور پر اس کتاب میں شامل کردیا گیا ہے جس سے اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

ایثار آخرت مترجم جناب مولانا عبدالجبار مئوی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، صفحات ۲۲۲، قیمت درج نہیں، پتہ: المجمع العلمی، پوسٹ بکس ۱۰ مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱۔

کئی برس پہلے امام عبداللہ بن مبارکؒ کی کتاب الزہد والرقائق کو محدث شہیر جناب مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے اپنے فاضلانہ حواشی و تعلیقات اور مفید مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شایع کیا تھا، مولانا عبدالجبار مئوی نے اس گنج گراں مایہ کا اردو ترجمہ کیا ہے، اصل کتاب میں امام مروزی اور نعیم بن حماد کی روایات ہیں، مگر زیر نظر ترجمہ میں صرف امام مروزی کی روایات ہی آسکی ہیں اور بعض جگہ ٹھیٹ اور لفظی ترجمہ کی وجہ سے روانی میں فرق آگیا ہے، شلاً "نبیؐ کی ہنسی صرف مسکراہٹ ہوتی اور کسی سے مسکراہٹ کے وقت نہ منھ پھیرتے مگر دونوں ساتھ ہی" حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نئی قمیص میں نے پہنی تو میں لگی دیکھنے اس کی طرف" اسی طرح زبان میں بھی کئی جگہ ناہمواری ہے، مثلاً "جب دونوں لشکر لڑتا ہے" "خدا کی خوشنودی چاہنے کو لڑتا ہے" "آپ شعر نہیں بناتے ہیں" "تمہاری نفس ہمیشہ حیران رہتی ہے" بعض جگہ مفہوم واضح نہیں ہے جیسے "میں نے اپنے جیسے نہیں دیکھا، جماعتیں جماعتوں تک نہیں چلیں رہتی ہیں" ایک جگہ آیت کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ کی جگہ مِنْ طَیِّبَاتِ لکھ دیا گیا ہے، خود کتاب کے نام ایثار آخرت کی ترکیب نامانوس ہے۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۴۹ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۹۳ء عدد ۳

مضامین

مقالات

استفسار و جواب

معارف کی ڈاک

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

آزادی سے پہلے سمجھا جاتا تھا کہ قومی حکومت کے قیام کے بعد ملک کے دوسرے فرقوں اور گروہوں کی طرح مسلمانوں کو بھی ترقی کے یکساں مواقع ملیں گے۔ اور وہ ملک کے دوسرے لوگوں کے دوش بدوش قومی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں برابر کے شریک و دخیل ہوں گے۔ اور آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر بے خوف و خطر زندگی بسر کریں گے۔ ان کا دین و عقیدہ اور قومی و مذہبی تشخص باقی رہے گا۔ ان کی عبادت گاہیں اور ان کے پرسنل لا محفوظ رہیں گے۔ لیکن نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی یہ توقعات بر نہ آئیں اور مسلمان ہر لحاظ سے کمتر اور پس ماندہ بلکہ دوسرے درجہ کے شہری ہو گئے۔ گویا ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ نہ ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور دین و ایمان سلامت ہے اور نہ ان کی عبادت گاہیں اور پرسنل لا محفوظ ہیں۔ بلکہ ان سب کے لیے روز بروز مزید خطرات بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور مسلمانوں کی پریشانی اور بے بسی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مسلسل جو ظلم، زیادتی اور ناانصافی ہو رہی ہے، وہ کسی بھی جمہوری اور سیکولر حکومت کے لیے نہایت شرمناک اور اس کے دامن پر ایک بہت بدنما داغ ہے۔ چنانچہ اب اس پہلو سے دنیا میں ہندوستان کی رسوائی اور بدنامی بھی ہو رہی ہے۔ جس کا اعتراف بعض قومی اور سیاسی رہنما بھی کرنے لگے ہیں لیکن اس کو نظر انداز کر کے اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ اس ظلم و زیادتی میں جہاں دوسروں کا ہاتھ ہے وہاں مسلمان بھی اس کے ذمہ دار ہیں جو خود اپنے اوپر ظلم و زیادتی کر رہے ہیں اور قانون قدرت یہ ہے کہ جو قوم اپنے اوپر خود ظلم و جور کرتی ہے اس کی تمام آسائشیں اور راحتیں اس سے چھین لی جاتی ہیں اور کوئی اس کو تباہی و بربادی سے بچا نہیں سکتا۔ خدائے ذوالجلال کا

زبردست اور طاقت ور ہاتھ اسے پاش پاش کر ڈالتا ہے اور وہ داستانِ پارینہ بن کر رہ جاتی ہے: وَظَلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ أَحَادِيثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ۔ (سبا: ۱۹)

اور باتوں سے قطع نظر اس موقع پر ہم مسلمانوں کی صرف ایک محرومی و بدنصیبی اور اپنے اوپر ظلم و زیادتی کی مثال دینا چاہتے ہیں۔ ہماری مراد تعلیم سے ہے۔ جس کے اعتبار سے وہ نہایت پسماندہ ہو گئے ہیں۔ ان کے بڑے طبقہ کو اپنی قوم تو درکنار خود اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے جس کے نتیجہ میں وہ قومی حیثیت سے ذلت و خواری اور پستی و ناکامی کی آخری حد پر پہونچ گئے ہیں۔ اور ادنیٰ و معمولی درجہ کے شہری ہو گئے ہیں۔ تعلیم سے غفلت و بے پروائی نے یہ بُرا دن بھی دکھایا کہ ملک کی مشترکہ اور قومی زندگی میں مسلمانوں کا عمل دخل بالکل ختم ہو گیا ہے۔ اور اسی باعث سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب افسوسناک اور عبرتناک حد تک گھٹ گیا ہے۔ کیا اس کے بعد بھی قوم و ملت کی ہمہ جہت کامیابی اور سربلندی کا کوئی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور کیا علم و بصیرت کے بجائے جہالت و بے بصیرتی کو اپنے معاشرہ میں فروغ دے کر مسلمان اپنے اوپر ظلم نہیں کر رہے ہیں؟

اس عام بے حسی اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد کی حیرت انگیز کمی سے کچھ دردمند اور حساس لوگ بہت فکرمند ہوئے اور تڑپ اٹھے۔ ان کی کوششوں کے نتیجہ میں تعلیمی حیثیت سے پس ماندہ اقلیتوں کے لیے حکومت بڑے حیص بیص کے بعد کوچنگ سنٹر یا تربیتی مراکز کھولنے پر آمادہ ہوئی اور منسٹری آف ویلفیر نے بعض انجمنوں کو اس کے لیے مالی امداد بھی دی۔ لیکن جب اس کے نتائج اطمینان بخش نہیں نکلے تو ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے جدید وسائل و ذرائع سے آراستہ ایک اقامتی کوچنگ سنٹر تعلیم آباد (سنگم وہار) دہلی میں کھولا جس میں ضروری سہولتوں کے علاوہ رہائش و تربیت کا معقول انتظام بھی ہے

جناب سید حامد سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، ہمدرد نگر، نئی دہلی کے قلم سے ہمدرد کوچنگ اینڈ ٹریننگ سینٹر کی ضروری تفصیل اخباروں میں شائع ہو چکی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ دوراندیشانہ اقدام حکیم عبدالحمید صاحب بالقابہ صدر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ جن کی مسیحائی ان شاءاللہ قوم میں زندگی کی نئی روح پھونک دیگی۔ البتہ ذہین طلبہ کی طرف سے اس کا عملی خیرمقدم ہونا چاہیے اور انھیں اس سنہرے موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن سابق ناظم دارالمصنفین کو کلکتہ اور اہل کلکتہ سے بڑا تعلق تھا۔ ان کے عم محترم جناب صلاح الدین مرحوم تو یہیں کے ہو گئے تھے جن کی یادگار انجمن مفیدالاسلام اب تک قائم ہے۔ ایران سوسائٹی کے ارباب حل وعقد خصوصاً خواجہ محمد یوسف چیف جسٹس کلکتہ ہائی کورٹ اور محمد مجید صاحب سے صباح الدین مرحوم کے بڑے مخلصانہ وعزیزانہ تعلقات تھے۔ سوسائٹی کی کوئی تقریب ان کی شرکت کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی ۹ر فروری ۱۹۹۲ء کو ایران سوسائٹی میں مرحوم پر ایک یادگار پروگرام ہوا۔ جس میں کلکتہ کے اصحاب علم ودانش کے علاوہ جناب سید شہاب الدین دسنوی مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنا کلیدی خطبہ پیش کیا۔ اس موقع پر خواجہ محمد یوسف نے بڑے والہانہ اور جذباتی انداز میں مرحوم کو اپنا خراج عقیدت پیش کرکے ان سے اپنے گہرے تعلق کا ثبوت دیا۔ پروگرام مختصر ضرور رہا لیکن اس کو منعقد کرکے کلکتہ کے لوگوں نے صباح الدین صاحب سے اپنے تعلق کا حق ادا کر دیا۔

اس سال ۲۶ جنوری کو صدر جمہوریۂ ہند کی طرف سے حکیم عبدالحمید صاحب مالک ہمدرد دواخانہ کو پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کی ۱۲۵ ویں سلور جبلی کے موقع پر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے سینیر ایڈووکیٹ محمد یعقوب صدیقی صاحب کو سرٹیفکیٹ آف آنر اور تمغہ دیا گیا ہم ان دونوں حضرات کو مبارکباد دیتے ہیں۔ دونوں کا مخلصانہ تعلق دارالمصنفین سے بہت قدیم ہے۔

مقالات

صحیح بخاری کی روایت "زنائے قردہ"

از ڈاکٹر عبدالرحمٰن مومن

امام المحدثین ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاریؒ (متوفی ۲۵۶ ہجری) کی الجامع الصحیح متفقہ طور پر علم حدیث کی مستند ترین کتاب ہے۔ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ حدیثوں میں سے دس ہزار احادیث کا انتخاب کیا۔ ان کے ابواب باندھے اور ان کی بنیاد پر صحیح بخاری ترتیب دی۔ اسے بجا طور پر اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا گیا ہے۔ گذشتہ ہزار برس سے زائد کے عرصہ میں صحیح بخاری عالم اسلام کی ممتاز دینی درسگاہوں میں شامل نصاب رہی ہے۔ اس کتاب کی غیر معمولی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ امام بخاریؒ کی زندگی ہی میں کم و بیش ایک لاکھ افراد نے ان سے بلا واسطہ صحیح بخاری کی سماعت کی۔

اس غیر معمولی امتیاز اور مقبولیت کے باوجود یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ صحیح بخاری تسامحات اور فروگذاشتوں سے یکسر خالی ہے۔ بخاری کے جملہ رواۃ کی تعداد ۴۳۰ سے زائد ہے، ان میں سے ۸۰ راوی ایسے ہیں جن کے بارہ میں محدثین اور علم جرح و تعدیل کے ماہرین نے کلام کیا ہے۔ ان میں سے بعض راوی جہمیہ، مرجیہ اور قدریہ عقائد رکھتے تھے۔ بعض متروک الحدیث رواۃ مثلاً اسمٰعیل بن ابان، ایوب بن عائذ، عطا بن ابی میمونہ، زہیر محمد التیمی اور عطاء بن السائب وغیرہ پر خود امام بخاری نے کتاب الضعفاء میں جرح کی ہے اور انھیں مطعون و مجروح قرار دیا ہے۔ دوسری طرف امام صاحب نے ان ہی

راویوں کی روایتیں صحیح بخاری میں شامل کی ہیں۔ ان امور کی تفصیل حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری کے مقدمہ ہدی الساری میں دی ہے۔

بعض جگہ صحیح بخاری کی دو روایات میں باہم تعارض پایا جاتا ہے۔ چنانچہ کتاب الصلوٰۃ کے باب ۲۸۹ هل تنبش قبور مشركى الجاهلية ويتخذ مكانها مساجد میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو آپ بنی عمرو بن عوف نامی قبیلہ کے یہاں اترے اور ان کے یہاں آپ چوبیس راتیں ٹھہرے۔ دوسری جگہ باب مقدم النبیؐ میں ان ہی حضرت انسؓ سے چودہ دن قیام کرنے کی روایت نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اعتراف کیا ہے کہ مذکورہ روایتوں میں باہمی تعارض پایا جاتا ہے اور اس بنا پر دونوں روایتیں ساقط الاعتبار ہیں[1]۔ صحیح بخاری میں بعض جگہ متن روایت میں تسامح واقع ہوا ہے۔ چنانچہ کتاب الجنائز کے باب ۳۱۱ حد المرأة على غير زوجها میں حضرت زینب بنت ابی سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب شام سے ابو سفیانؓ کی وفات کی خبر آئی تو ام حبیبہؓ نے تیسرے دن زرد خوشبو منگائی اور اپنے رخسار اور ہاتھوں پر ملی۔ مورخین کا بیان ہے کہ ابو سفیانؓ کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا تھا جب کہ اس روایت میں شام کا ذکر ہے حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ اس روایت میں راوی کو وہم ہوا ہے[2]

محدثین اور اہل فن نے حدیث کی صحت کو جانچنے کے دو معیار بتائے ہیں ایک اسناد اور دوسرے درایت۔ محدثین نے صرف روایت کے تسلسل اور سند کی صحت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ متن حدیث کا اصول درایت کی روشنی میں جائزہ لیا۔ محدثین کہتے ہیں کہ

---

[1] حافظ ابن حجر: فتح الباری جلد ۷ ص ۱۹۰ [2] فتح الباری جلد ۳ ص ۳۸۸۔

جو حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ہو ضروری نہیں کہ اس کا متن بھی صفت صحت سے متصف ہو۔ چنانچہ ماہرین فن نے متعدد حدیثوں کو جن کی اسناد درست ہیں لیکن جو روایت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں، ضعیف یا موضوع قرار دیا ہے۔ حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث[1] میں اور علامہ جلال الدین سیوطی نے تدریب الراوی[2] میں ایسی کئی احادیث کی مثالیں دی ہیں۔ محدثین نے درایت کے اصول وضع کیے ہیں۔ اگر کوئی روایت ان اصولوں سے کلی طور پر متعارض ہو تو سند اعتبار سے گری ہوئی مانی جاتی ہے۔ ابن جوزی نے فتح المغیث میں ان اصولوں کی تصریح کی ہے۔ حسب ذیل صورتوں میں روایت قابل اعتماد نہیں رہتی:

۱۔ جب وہ عقل و فہم کے منافی و معارض ہو۔

۲۔ کسی اصول مسلمہ سے معارض ہو۔

۳۔ محسوسات و مشاہدات سے معارض ہو۔

۴۔ سنت نبویؐ سے معارض ہو۔

۵۔ حدیث متواتر سے معارض ہو۔

۶۔ اجماع قطعی و یقینی سے معارض ہو۔

۷۔ معمولی فروگذاشت پر بڑی اور سخت عذاب کی دھمکی پر مشتمل ہو۔

۸۔ رکیک المعنی ہو اور اس میں شائبۂ لغویت پایا جاتا ہو۔

۹۔ صرف ایک آدمی روایت کرے حالانکہ اس میں کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ

---

[1] حاکم: معرفۃ علوم الحدیث ص ۵۰ [2] جلال الدین سیوطی: تدریب الراوی ص ۸۰، ۲۴ نیز صبحی صالح: علوم الحدیث ومصطلحہ (الفصل الرابع نیز الفصل الخامس)

اگر وقوع میں آیا ہوتا تو بہت سے لوگوں کو اس سے واقف اور آگاہ ہونا چاہیے تھا[1]

اصول درایت کی روشنی میں صحیح بخاری کی بعض روایتوں پر محدثین نے جرح کی ہے۔
مثلاً صحیح بخاری کی کتاب الاستیذان باب بدء السلام میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنی صورت پر بنایا کہ ان کے قامت کی درازی ساٹھ گز (ستون ذراعًا) تھی ... پھر ان کے بعد سے اب تک مخلوق کا قد گھٹتا چلا آتا ہے۔ اس حدیث سے متعلق حافظ عقیلی کتاب الضعفاء میں (ابو الزناد کے تذکرہ میں جو اس حدیث کا راوی ہے) لکھتے ہیں کہ ابن قاسم کہتے ہیں میں نے حضرت مالک ابن انسؒ سے اس روایت کے بارہ میں دریافت کیا تو آپ نے اس روایت کا نہایت سختی سے انکار فرمایا اور منع کر دیا کہ کوئی اس کو بیان نہ کرے[2]۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اس روایت کے بارہ میں لکھتے ہیں ویشکل علیٰ ھذا ما یوجد الآن من آثار الامم السالفة کدیار ثمود فان مساکنھم تدل علیٰ ان قاماتھم لم تکن مفرط الطول (اس روایت پر یہ اشکال ہوتا ہے کہ اب جو گذشتہ قوموں کے آثار موجود ہیں جیسے ثمود کی بستیاں ہیں کہ ان کے مساکن یہ تبلاتے ہیں کہ ان کے ڈیل ڈول زیادہ لانبے نہ تھے) اور پھر ابن حجر لکھتے ہیں لم یظھر لی إلی الآن ما یزیل ھذا الاشکال[3] (اب تک مجھے کوئی ایسی چیز معلوم نہ ہو سکی جو اس اعتراض کو رفع کر سکے)

---

[1] دائرہ معارف اسلامیہ (طبع پنجاب یونیورسٹی لاہور) جلد ۷ ص ۳۰۹ (بحوالہ فتح المغیث ص ۱۱۳)

[2] مولانا عبدالرشید نعمانی، لغات القرآن (طبع لاہور) جلد ۳ ص ۱۷۷ (بحوالہ ذہبی: میزان الاعتدال جلد ۲ ص ۳۴)[3] ابن حجر عسقلانی: فتح الباری جلد ۶ ص ۲۶۰۔

زیر نظر مضمون میں صحیح بخاری کی ایک روایت کا مذکورۃ الصدر اصول درایت کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ صحیح بخاری کی کتاب بنیان الکعبہ کے باب القسامۃ فی الجاہلیۃ میں امام بخاریؒ اپنے استاد نُعیم بن حماد سے روایت کرتے ہیں:

حدثنا نعیم بن حماد قال	نعیم بن حماد نے ہم سے کہا، وہ ہشیم
حدثنا ھشیم عن حصین عن	سے، وہ حصین سے، وہ عمرو بن میمون
عمرو بن میمون قال رأیت	سے روایت کرتے ہیں کہ جاہلیت کے
فی الجاھلیۃ قردۃ اجتمع علیھا	زمانہ میں میں نے دیکھا کہ ایک بندریا
قردۃ قد زنت فرجموھا	پر بندر اکٹھے ہوگئے تھے۔ بندریا نے
فرجمتھا معھم	زنا کیا تھا اور بندر اس کو سنگسار کر رہے
	تھے۔ میں نے بھی ان کے ساتھ بندریا
	کو سنگسار کیا۔

اس روایت میں نہ صرف اصول درایت کے لحاظ سے اشکال ہے بلکہ جرح و تعدیل کے اصولوں کے اعتبار سے بھی اس میں علت اور شذوذ پایا جاتا ہے۔ امام بخاریؒ نے یہ روایت اپنے استاد نعیم بن حماد خزاعی مروزی سے کی ہے۔ حافظ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں انھیں منکر الحدیث کہا ہے[۱]۔ نسائی ان کو ضعیف کہتے ہیں۔ ذہبی کہتے ہیں کہ آپ علم کا خزانہ تھے، لیکن قابل حجت نہیں تھے۔ خطیب، دارقطنی، ابو صالح بن محمد الاسدی اور ابو سعید بن یونس نے انھیں غیر ثقہ کہا ہے اور لکھا ہے کہ ان کی روایتوں میں جھوٹ کی آمیزش بھی ہوتی تھی۔ وہ حدیث گڑھتے بھی تھے[۲]۔ اس روایت کے دوسرے راوی

---

[۱] شمس الدین ذہبی: تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ طبقہ ۸ [۲] ابوبکر احمد بن علی الخطیب: تاریخ بغداد جلد ۱۳ ص ۳۰۶-۳۱۴۔

ہشیم بن ابی خازم الواسطی کے بارہ میں حافظ ذہبی کہتے ہیں کہ تدلیس کرنے کے بڑے عادی تھے۔ ایک ایسی جماعت سے احادیث بیان کرتے ہیں جن سے ان کو سماع حاصل نہیں ہے[1] بعض محدثین نے اصول درایت کی روشنی میں صحیح بخاری کی اس روایت میں کلام کیا ہے چنانچہ حافظ ابن عبدالبر نے الانتقار میں اس روایت پر نکیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

فیھا اضافۃ الزنا الی غیر	اس روایت میں غیر مکلف کی طرف
مکلف واقامۃ الحد علی	زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر
البھائم وھذا منکر عند	حد قائم کرنا ہے جو اہل علم کے نزدیک
اھل العلم[2]	ناقابل قبول ہے۔

علامہ ابن الاثیر نے اسد الغابہ میں یہی بات کہی ہے۔ امام ابو عبداللہ حمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں اس روایت کو الحاقی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اصل بخاری میں نہیں ہے[3] امام نجم الدین نسفی نے کتاب النجاح میں، جو صحیح بخاری کی شرح ہے، اس روایت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ دوسری طرف حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس روایت کی حمایت کی ہے۔ اور امام حمیدی کے قول پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کی رائے علما و محدثین کے اس قول کے منافی ہے کہ صحیح بخاری کی تمام روایتیں صحیح اور مستند ہیں۔ علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں ابن حجر کے اس دعویٰ پر گرفت کی ہے کہ جو کچھ امام بخاری نے اپنی صحیح میں لکھا ہے وہ سب صحیح ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ نسفی نے اس روایت کا ذکر نہیں کیا ہے[4]

---

[1] ذہبی: تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ طبقہ ۶ [2] ابن حجر: فتح الباری جلد ۷ ص ۱۶۰ [3] ایضاً ص ۱۶۱ [4] بدرالدین عینی: عمدۃ القاری جلد ۸ ص ۵۱۔

نیز نظر روایت دو بنیادی وجوہ کی بناء پر محل نظر ہے۔ اول یہ کہ شرعی لحاظ سے صرف انسان کو مکلف قرار دیا گیا ہے۔ اس تکلیف شرعی کی اساس اس حقیقت پر ہے کہ جانوروں کے برخلاف انسان کو عقل و شعور سے بہرہ مند کیا گیا ہے۔ لہذا حدود اور تعزیرات کا تعلق صرف انسانوں سے ہے جانوروں سے نہیں۔ یہ ایک مسلم شرعی اصول ہے جس پر تمام علماء و فقہاء اور محدثین کا اتفاق ہے۔ دوسرے یہ کہ زنا کا معاملہ عصمت وعفت کے شرعی و اخلاقی حدود اور زناشوئی کے تعلق سے جڑا ہوا ہے۔ چونکہ عصمت وعفت اور زناشوئی کے ضوابط جانوروں میں نہیں پائے جاتے اس لیے ان کی طرف زنا کی نسبت کرنا عقل و فہم اور مشاہدات و تجربات کے منافی ہے۔ اب ہم ان امور کا قدرے تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔

انسانوں اور جانوروں میں جو چیز مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ جانوروں کے برخلاف انسان کو عقل و ہوش سے نوازا گیا ہے اور اسے نیک و بد کی تمیز عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ (سورۃ البلد آیت ۹)	کیا ہم نے نہیں بنائیں اس کے لیے دو آنکھیں اور ایک زبان اور دو ہونٹ اور ہم نے اسے دونوں راستے بتلا دیے۔

قرآن کریم میں لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ، لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ، لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ، لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ کی تکرار متعدد سورتوں اور آیتوں میں نظر آتی ہے۔ کافروں کے بارہ میں ایک جگہ کہا گیا:

أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ — یہ لوگ مثل چوپایوں کے ہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر بے راہ ہیں۔
(الاعراف آیت ۱۷۹)

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی اساس اس بات پر ہے کہ باری تعالیٰ نے اسے علم عطا فرمایا (عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ) اسے عقل و شعور سے بہرہ مند فرمایا اور زبان کو اس کے اظہار کا ذریعہ بنایا (خَلَقَ الْإِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا

(الاحزاب آیت ۷۲)

ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑ پر پیش کیا تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور آدمی نے اسکو اٹھالیا۔ اس میں شک نہیں کہ انسان بڑا بے ترس اور نادان ہے

مفسرین کے نزدیک اس آیت میں امانت سے تکلیف شرعی مراد ہے۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ امانت کے دو معنی ہیں توحید اور دوسرے عقل۔ دوسرے معنی صحیح ہیں۔ قیل العقل و ھو صحیح ...... و بہ فضل علی کثیر من خلقہ[۱]۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں انسان کے مکلف ہونے کی عمدہ بحث کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ آدمی کو مکلف کرنا اس کی نوع کا مقتضا ہے۔ حیوانات کے افعال جبلی ہیں جبکہ انسان کی حرکات و سکنات اور افعال میں اس کی عقل اور اکتساب کو دخل ہے[۲]

---

[۱] راغب اصفہانی: المفردات فی غریب القرآن ص ۲۱۔۲۲۔ [۲] شاہ ولی اللہ دہلوی؛ حجۃ اللہ البالغہ، باب سر التکلیف ص ۱۹۔۲۰۔

انسان کو اگرچہ احکام شرعیہ کا پابند بنایا گیا ہے لیکن فرضیت احکام کے لیے یہ شرط ہے کہ انسان عاقل و بالغ اور ذی ہوش ہو جو احکام کا مکلف ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو چنانچہ نابالغ اور دیوانہ وغیرہ مکلف نہیں ہیں۔ اسی طرح عاقل کی بیع صحیح اور دیوانے کی بیع شرعی لحاظ سے باطل ہے۔

جہاں تک رجم کی سزا کا تعلق ہے اس بات پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ رجم کی سزا صرف اس زنا کار کے لیے ہے جس میں احصان کی شرائط پائی جاتی ہوں۔ امام ابو حنیفہ اور امام مالک کے نزدیک محصن اسے کہا جائے گا جو مسلمان، آزاد اور عاقل و بالغ ہو اور کسی مسلمان، آزاد اور عاقل و بالغ عورت کے ساتھ نکاح صحیح کے ذریعہ تعلقات زناشوئی کر چکا ہو۔ شرعی نقطہ نظر سے زنا سے مراد ایسی عورت کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرنا ہے جو نکاح صحیح کے ذریعہ مرد کی زوجیت میں نہ ہو۔ اگر زانی یا زانیہ کنوارے ہیں تو فقہائے حنیفہ کے نزدیک صرف سو دُرے لگائے جائیں گے۔ اگر زانی یا زانیہ شادی شدہ ہیں تو تمام فقہاء کے نزدیک ان پر رجم یا سنگساری کی حد جاری کی جائے گی[۱]۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حدود و تعزیرات اور تکلیف شرعی لازم و ملزوم ہیں۔ چونکہ تکلیف شرعی کا اطلاق صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب عصمت و عفت اور نکاح کے شرعی و اخلاقی حدود و احکام کی خلاف ورزی ہو۔ مشاہدات و تجربات کی روشنی میں یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ برخلاف انسانی سماج کے جانوروں میں عفت و عصمت اور نکاح سے متعلق حدود و ضوابط نہیں پائے جاتے۔

---

[۱] ابو بکر احمد الجصاص: احکام القرآن (طبع لاہور) عبد الرحمٰن الجزیری: الفقہ علی المذاہب الاربعہ جزء پنجم باب دوم، نیز دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۰، ص ۲۱۰، ص ۴۹۹۔

گذشتہ ربع صدی میں دو نئے علوم منظر عام پر آئے ہیں جنھیں ایتھولوجی (ETH OLOGY) کہا جاتا ہے۔ ان علوم کی اساس دشت وصحرا یا قدرتی ماحول میں جانوروں کی زندگی اور ان کی حرکات وسکنات کے مشاہدہ پر ہے۔ ان علوم کے ذریعہ جانوروں کی زندگی کے بہت سے دلچسپ پہلو سامنے آئے ہیں۔ سردست ہم جانوروں بالخصوص بندروں کی جنسی زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ بندروں سے متعلق سب سے اہم بات یہ ہے کہ انسانوں کی طرح وہ اجتماعی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بندروں کی ٹولیاں جن میں ۱۰ سے ۵۰ تک بندر ہوتے ہیں جنگلوں میں اکثر نظر آتی ہیں۔ جہانتک جنسی تعلقات کا معاملہ ہے بندروں میں جوڑے نہیں ہوتے۔ ایک بندریا کئی بندروں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتی ہے۔ اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر ان علوم کے ماہرین لکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایک بندریا چار منٹ کے دوران تین بندروں کے ساتھ مجامعت کرتی ہے۔ جین گڈال جنھوں نے افریقہ کے جنگلوں میں بندروں کی حرکات وسکنات اور ان کی سماجی زندگی کا مشاہدہ ومطالعہ کرنے میں کئی برس گزارے ہیں، بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ دو منٹ سے بھی کم وقفہ سے سات بندروں نے ایک بندریا کے ساتھ یکے بعد دیگرے مجامعت کی۔[۱] جب ایک بندر مادہ کے ساتھ مصروف مجامعت ہوتا ہے تو دوسرے بندر اس میں مخل نہیں ہوتے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ بندروں کی جنسی زندگی آزاد وبے قید معاشرت کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ ایک بندر کئی مادہ بندروں کو حاملہ کرتا ہے۔

بندروں کی جنسی زندگی سے متعلق دوسری اہم بات یہ ہے کہ انسانوں کے برخلاف

I. Devore: Primate Behaviour (New York, 1965) P. 451 ۱ے

وہ سال بھر جنسی ملاپ کے لیے تیار نہیں رہتے۔ مادہ بندر مہینہ میں صرف ۵ سے سات دنوں کے لیے مباشرت پر آمادہ رہتی ہے۔ انسانوں کی طرح اسے بھی تیس دن کی ماہواری آتی ہے۔ ان ایام کے دوران ۵۔۶ دنوں کے وقفہ میں وہ جنسی ملاپ کی طرف مائل ہوتی ہے۔ بندروں میں جنسی ملاپ کی پہل مادہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے سر کو زور سے ہلاتی ہے، اپنی دم کو زمین پر مارتی ہے اور نر بندروں کو اپنی طرف رجھاتی ہے۔ پانچ سات دنوں کی یہ معیاد جس میں جنسی خواہش عروج پر ہوتی ہے۔ Estrus کہلاتی ہے۔ اس دوران زیادہ جسامت والے نر بندروں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ مادہ بندر جب جنسی ہیجان کی اس کیفیت میں نہیں ہوتی تو نر بندر بھی اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ انسانی سماج میں باپ بیٹی، ماں بیٹے اور بھائی بہن کے بیچ رشتۂ مناکحت حرام اور ناجائز سمجھا جاتا ہے لیکن جانوروں میں اس قسم کی کوئی تفریق یا امتیاز نہیں پایا جاتا۔

مادہ بندر کی زندگی میں مباشرت اور جنسی ملاپ کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ ایک مادہ بندر عموماً اپنی زندگی کا چوتھائی حصہ حالت حمل میں گذارتی ہے۔ حمل کی معیاد چھ ماہ ہوتی ہے۔ بچہ کی پیدائش کے بعد وہ اسے ایک سال تک دودھ پلاتی ہے۔ یعنی آدھی سے زیادہ زندگی بچوں کو دودھ پلانے اور ان کی نگہداشت میں صرف ہوتی ہے۔ اس دوران وہ مجامعت اور جنسی ملاپ کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ بندروں کے سماج میں بنیادی اکائی ماں اور بچہ کی ہوتی ہے۔[۱]

---

[۱] ملاحظہ ہو درج ذیل کتابیں (1) Jay S. Rosenblatt: Advances in the study of Behaviour (New York Academic Press, 1979) Vol. 9, P.P. 145-146.

(بقیہ ص ۱۷۶ پر)

جانوروں کی جنسی زندگی کے مشاہدات کی بنیاد پر جو تحقیقات ہمارے سامنے آئی ہیں ان کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی طرف زنا کی نسبت کرنا نہ صرف خلاف واقعہ و مشاہدہ ہے بلکہ عقل و فہم سے بعید بھی ہے ۔ لہذا صحیح بخاری کی زیر نظر روایت عقل و فہم اور مشاہدات سے معارض ہے ۔ اس امر کے پیش نظر یہ نتیجہ اخذ کرنا قرین صواب ہوگا کہ یہ روایت الحاقی ہے جیسا کہ امام حمیدی اور علامہ نسفی کا قول ہے ۔ اگر بالفرض ایسا نہیں ہے تو بھی اس روایت کے قابل قبول ہونے میں شرعی اور عقلی اشکالات ہیں جیسا کہ علامہ ابن عبد البر ، علامہ عینی ، حافظ ابن اثیر اور علامہ قسطلانی کی تحریرات سے ظاہر ہے ۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اس روایت کے راوی نعیم بن حماد کو اشتباہ ہوا ہو ۔ مزید برآں اس روایت کو بیان کرنے میں وہ منفرد ہیں ۔

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان اشرف المخلوقات ہے (لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ .... وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا) انسان کے اس تفوق اور شرف کی بنیاد اس امر پر ہے کہ باری تعالیٰ نے اسے عقل و فہم اور ہوش و شعور سے بہرہ مند فرمایا ہے ۔ گذشتہ بیس پچیس برسوں میں انسانوں اور جانوروں کی زندگی اور ان کے افعال کے تقابلی مطالعہ میں کافی پیش رفت ہوئی ہے ۔ اس تقابلی مطالعہ سے انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی مزید توثیق ہوتی ہے ۔ ہم اس سے متعلق تحقیقات و شواہد کا مختصراً جائزہ دیتے ہیں ۔

(بقیہ ص ۱۶۵) (ب) M. L. Roonwal and S. M. Mohnot: Primates of South Asia (Cambridge, Mass: Harvard University Press, 1977) P. 11

(ج) Allan M. Schrier: Behavioral Primatology (New York: John Wiley, 1977) P. 166

(د) I. Devore: Primate Behaviour (New York, 1965)

انسان کو عقل و شعور اور فہم و تدبر با لخصوص ادراک ذات Self - consciousness سے نوازا گیا ہے۔ جس کی مثال جانوروں میں نہیں پائی جاتی۔ انسان میں قدرت کی ودیعت کردہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اس کے فہم و شعور کو جلا دینے میں اس کی لسانی صلاحیت بڑی ممد و معاون رہی ہے۔ زبان کو سیکھنے اور اسے نسل در نسل منتقل کرنے کی فطری استعداد صرف انسان میں ہے۔ جانور اس عطیۂ خداوندی سے محروم ہیں۔ ادراک ذات کے ملکہ کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ جانوروں کے برخلاف صرف انسانی زندگی کی فنا پذیری اور موت کی آگہی اور ہمیشگی شعور رکھتا ہے۔ یہ آگہی اسکی زندگی اور قول و فعل پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔

جانوروں کے دماغ کے مقابلہ میں انسانی دماغ نہ صرف جسامت میں بڑا ہے بلکہ کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ دماغ کے وہ حصے جنہیں Frontal lobes اور Pre-Frontal lobes کہا جاتا ہے انسانی فطرت کے ممتاز خصائص کا منبع ہیں۔ ان حصوں میں انسان کی وہ صلاحیت پوشیدہ ہے جس کے ذریعہ وہ مستقبل کے بارہ میں سوچتا ہے اور منصوبے بناتا ہے۔ انسانی دماغ میں بولنے اور سننے کے مراکز ایک دوسرے کے قریب واقع ہوتے ہیں۔

جانوروں کے برخلاف صرف انسان اپنی انگشت شہادت کو پوری طرح انگوٹھے کے ساتھ ملا سکتا ہے۔ تشریح الابدان (Anatomy) کے لحاظ سے یہ ایک امتیازی صفت ہے جس کے ذریعہ انسان مختلف قسم کے ہتھیار اور آلات و اوزار بناتا ہے۔ بعض پرندے اور جانور کبھی کبھار معمولی قسم کی چیزوں سے آلات کا کام لیتے ہیں۔ مثلاً چمپانزی بندروں کا من بھاتا کھاجا سفید چیونٹیاں ہیں جو درختوں کے کھوکھلے

تنوں میں گھر بنا کر رہتی ہیں۔ بندر اپنا ہاتھ تنے کے اندر ڈال کر چیونٹیوں کو نکال لیتے ہیں اور رغبت کے ساتھ کھاتے ہیں۔ بعض دفعہ یہ چیونٹیاں کھوکھلے تنوں کے اندرونی حصہ میں گھر بناتی ہیں جہاں بندروں کے ہاتھ پہنچ نہیں پاتے۔ کئی دفعہ کوشش کرنے کے بعد جب اس کا ہاتھ اندر نہیں پہنچ پاتا تو بندر درخت کی ایک شاخ کو توڑتا ہے۔ پتیاں علیحدہ کرتا ہے اور اسے تنے کے اندر ڈال کر دو چار منٹ دم سادھے کھڑا رہتا ہے۔ جب چیونٹیاں شاخ سے چپک جاتی ہیں تو بندر اسے ایک جھٹکے کے ساتھ باہر کھینچ لیتا ہے اور اس سے چپکی ہوئی چیونٹیوں کو چٹ کر جاتا ہے۔ اسی طرح مصری گدھ شتر مرغ کے انڈوں کے بڑے رسیا ہوتے ہیں۔ لیکن ان انڈوں کے خول بڑے سخت ہوتے ہیں۔ جو آسانی سے نہیں ٹوٹتے۔ جب شتر مرغ اپنے انڈوں کو چھوڑ کر کہیں چلا جاتا ہے تو گدھ اپنی چونچ میں چھوٹا سا پتھر پکڑتا ہے اور انڈے کے کچھ اوپر اڑتے ہوئے پتھر کو اس پر پھینک دیتا ہے۔ پتھر کی ضرب سے انڈا ٹوٹ جاتا ہے اور گدھ نیچے آکر چٹ پٹ انڈے کی زردی کو کھا جاتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جانوروں میں معمولی اشیاء سے آلات کا کام لینے کا فعل جبلی ہوتا ہے اس میں بہتری یا درجہ بدرجہ ترقی کا امکان نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف انسان میں یہ صلاحیت حیرت انگیز حد تک ترقی یافتہ ہے۔ انسان نہ صرف مختلف قسم کے اوزار و آلات بناتا رہتا ہے بلکہ اسے نسل در نسل منتقل کرتا رہتا ہے بالفاظ دیگر آلات بنانے کی صلاحیت اور فن میں عہد بہ عہد ترقی ہوتی رہتی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسانی تہذیب کا ارتقا بڑی حد تک اوزار و آلات بنانے کی امتیازی صلاحیت اور اس کی ترقی پذیری سے عبارت ہے۔

اپنی بقا اور افزائش نسل کے لیے تمام ذی حیات کو اپنے قدرتی ماحول سے

ہم آہنگ کرنا ضروری ہے۔ یہ عمل جبلی اور تخلیقی ہے۔ جانوروں کے برخلاف انسان نہ صرف اپنے گردوپیش کے ماحول سے مطابقت پیدا کرتا ہے بلکہ اس ماحول میں تغیرات بھی لاتا ہے۔ مختلف انواع کے جانور صرف مخصوص قسم کے جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا نیز مخصوص قسم کی غذا پر ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ قطبین کے برف پوش علاقوں میں رہنے والے جانور افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا میں زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کے برخلاف انسان ہر قسم کے جغرافیائی ماحول اور ہر قسم کی غذا پر زندہ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ قطب شمالی اور سائبیریا کے علاقوں میں جہاں درجۂ حرارت منفی ۴۰ درجہ سیلیس سے بھی کم ہوتا ہے اسکیمو، کرغیز اور ٹنگی جیسے قبائل صدیوں سے رہتے چلے آئے ہیں۔ اسی طرح صحرائے افریقہ میں جہاں درجۂ حرارت مثبت ۵۰ درجہ سیلسیس سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ ہوٹن ٹاٹ اور شمین جیسی قومیں آج بھی آباد ہیں۔ ایسے شدید موسموں والے علاقوں میں انسان نے اپنی عقل و فہم اور لسانی صلاحیت سے کام لیتے ہوئے آگ سے اپنی حفاظت، جانوروں سے اپنی غذا اور اسباب برداری نیز آلات و اوزار سے اپنی بقا کا سامان بہم پہنچایا۔

جانوروں اور انسانوں میں حیاتیاتی عوامل یکساں طور پر کارفرما ہیں۔ بھوک پیاس اور جذبۂ شہوانی کی تکمیل کا مادہ انسانوں اور جانوروں میں مشترک ہے لیکن اس کے باوجود دونوں میں بڑا فرق ہے۔ جانوروں میں ان حیاتیاتی عوامل کی کارفرمائی جبلی اور لازمی طور پر ہوتی ہے۔ دوسری طرف انسان ان احتیاجات کو نہ صرف مختلف طور طریقہ پر پورا کرتا ہے بلکہ ان پر قابو پانے اور بسا اوقات ان کو ماننے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ روزہ اور فاقہ کے ذریعہ وہ بھوک اور پیاس کی فطری خواہش کو زیر کرتا ہے اسی طرح رہبانیت اور سنیاس کے ذریعہ وہ جنسی خواہش

کو مارنے کی کوشش کرتا ہے۔

انسانی سماج میں حرمت محرمات (Incest taboo)[1] کا اصول عمومی طور سے مروج ہے۔ جس کے تحت ماں بیٹے، باپ بیٹی اور بھائی بہن کے بیچ رشتۂ مناکحت حرام اور ناجائز سمجھا جاتا ہے۔ جانوروں میں اس قسم کا کوئی ضابطہ یا اصول نہیں پایا جاتا۔[2]

انسان کے ان امتیازی اوصاف کو، جو اسے جانوروں سے ممیز و ممتاز کرتے ہیں، حیاتیات و بشریات کے ماہرین نوعی خصائص Species - specific کہتے ہیں۔[3]

عصر حاضر کی یہ تحقیقات انسان سے متعلق اسلامی تصور کی تائید و توثیق کرتی ہیں اور دبے لفظوں میں یا زبان حال سے کہتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں:

تَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ

---

[1] George P. Murdock: Social Structure (New York: Macmillan, 1949) pp. 12-13, 260-64

[2] اگرچہ حرمت محرمات کا اصول عالمی و آفاقی نوعیت کا حامل ہے لیکن اس میں چند استثنائی صورتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ مشرقی افریقہ میں آزندے قبیلہ کے اعلیٰ طبقہ کے افراد کو اپنی بیٹیوں سے شادی کرنے کی اجازت تھی۔ وسطی امریکہ کے اِنکا قبیلہ میں بھائی بہن کی شادی کا رواج تھا۔ انڈونیشیا کے بالی جزیرہ میں جڑواں بھائی بہن کی شادی جائز سمجھی جاتی ہے۔ افریقہ کے تھونگا قبیلہ میں یہ عقیدہ تھا کہ شکار پر جانے سے پہلے مشاق شکاری اپنی بیٹیوں کے ساتھ صحبت کیا کرتے تھے۔ مصر کے فراعنہ میں بھی بہنوں اور بیٹیوں سے نکاح کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ ریمیس دوم نے جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کا فرعون ہے، اپنی بنت عنات کو اپنے حرم میں داخل کیا۔ اس کی ایک اور بیٹی نفرتیری اس کی منکوحہ تھی۔ ملاحظہ ہو راقم السطور کا رسالہ "قصہ فرعون و موسیٰ جدید تحقیقات کی روشنی میں" (زیر طبع)

[3] ملاحظہ ہو درج ذیل مصادر: Jacob Bronowski: The Ascent of Man (London: BBC, 1973) John Roslansky: The Uniqueness of Man (Amsterdam: North-Holland, 1969) W. H. Thorpe: Animal Nature and Human Nature (London: Methuen, 1974). John Eccles: The Human Mystery (London: Routledge and Kegan Paul, 1984)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

از

مولانا یوسف متالا

خاندان شیخ عبدالحق کے اجداد بخارا کے رہنے والے تھے ان کے اجداد میں سب سے پہلے آغا محمد ترک تیرھویں صدی عیسوی یعنی سلطان علاءالدین خلجی کے دورِ حکومت میں سنہ ۱۲۹۶ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ سلطان نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی اور اعلیٰ عہدوں سے نوازا۔ ان دنوں گجرات کی مہم کی تیاری ہو رہی تھی۔ چنانچہ سلطان نے آغا محمد ترک کو اپنے امراء کی جماعت کے ساتھ گجرات روانہ کر دیا۔ آغا محمد گجرات کی فتح کے بعد وہیں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کے ایک سو ایک بیٹے تھے۔ جن کے ساتھ وہ نہایت شان و شوکت سے دن گذارتے تھے۔ ایک ہولناک حادثہ میں سو لڑکے انتقال کر گئے۔ صرف ایک لڑکا ملک معزالدین بچا۔ جس سے اس خاندان کا سلسلہ چلا۔ آغا محمد اس صدمہ سے نڈھال ہو کر پھر دہلی واپس آ گئے اور شیخ صلاح الدین سہروردی کی خانقاہ میں معتکف ہو گئے۔ ۷۳۹ھ (۱۳۳۸ء) کو سلطان بن محمد تغلق کے زمانے میں آغا محمد ترک نے داعی اجل کو لبیک کہا اور دہلی ہی میں عیدگاہ شمسی کے عقب میں سپردِ خاک کیے گئے۔

ملک معزالدین کو جن سے اس خاندان کا سلسلہ جاری ہوا خدا تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ شیخ عبدالحق تحریر فرماتے ہیں کہ:

"حق تعالیٰ نے ملک معز الدین کو یہ مرتبہ دیا کہ گویا سو آدمیوں کی استعداد اور فضائل ان کو عنایت فرمایا"[1]

ان کے بعد ان کے بیٹے ملک موسیٰ نے بڑی عزت و شہرت حاصل کی۔ ان کے کئی بیٹے تھے ان میں شیخ فیروز نے خاندان کو زیادہ عزت بخشی۔ یہ شیخ فیروز ۸۶۰ھ/۱۴۵۵ء میں بہرائچ کے کسی معرکہ میں شہید ہو گئے اس وقت ان کی بیوی حاملہ تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ان سے شیخ سعد اللہ یعنی شیخ عبدالحق کے دادا پیدا ہوئے جو اپنے زمانے کے کامل شیخ ہوئے۔ وہ شاہ جلال گجراتی کے مریدوں میں سے تھے ۹۲۵ھ/۱۵۱۹ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اپنے پیچھے دو لڑکے چھوڑے شیخ رزق اللہ اور شیخ سیف الدین۔ والد کے انتقال کے وقت شیخ سیف الدین کی عمر آٹھ سال تھی۔ وفات سے قبل والد ماجد نے آپ کے لیے دعا فرمائی تھی جس کا تذکرہ خود انھوں نے کیا ہے اور شیخ عبدالحق نے اخبار الاخیار میں اس کو تحریر فرمایا ہے:

"نماز تہجد کے بعد مجھے قبلہ رو کھڑا کیا اور کہا الٰہی تو جانتا ہے کہ میں دوسرے لڑکے کی تربیت سے فارغ ہو چکا لیکن اس لڑکے کو یتیم و بے کس چھوڑ رہا ہوں۔ اسکو تیرے سپرد کرتا ہوں تو ہی اسکی تربیت اور حفاظت فرما"

چنانچہ یہ لخت جگر بعد میں دہلی کا نہایت ہی با وقعت اور با عزت انسان بنا اور اسی کے گھر میں وہ آفتاب علم طلوع ہوا جس نے ساری فضائے علم کو منور کیا یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی جن کا تذکرہ ہم بیان کر رہے ہیں۔

تعلیم | شیخ عبدالحق محدث دہلوی محرم ۹۵۸ھ میں پیدا ہوئے۔ قرآن پاک سے

---

[1] اخبار الاخیار۔

لے کر مصباح و کافیہ تک خود ان کے والد شیخ سیف الدین نے تعلیم دی پھر کسی دوسرے استاد کے پاس بارہ سال کی عمر میں شرح شمسیہ اور شرح عقائد پڑھی اور پندرہ سال کی عمر میں مختصر و مطول کا درس لیا اور تقریباً اٹھارہ سال کی عمر میں بقدر کفایت تمام علوم نقلی و عقلی سے فارغ ہوگئے۔ اس کے بعد کلام پاک حفظ کیا۔ بیس برس کی عمر میں درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ ۳۸ سال کی عمر میں حجاز کا شوق دامنگیر ہوا۔ اسی ارادہ سے ۹۹۶ھ/۱۵۸۷ء کے شروع میں حجاز کی طرف روانہ ہوئے۔ محمد غوثی نے گلزار ابرار میں لکھا ہے کہ شیخ ۹۹۵ھ کے شروع میں مالوہ ہوتے ہوئے گجرات پہونچے۔ یہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ جہاز کا موسم گذر چکا ہے۔ چنانچہ آپ سال بھر وہیں رہے۔

احمدآباد میں اس زمانہ میں مرزا عزیز کوکہ مالوہ کے حاکم تھے اور اکبر کے رضاعی بھائی تھے۔ شیخ عبدالحق نے ان کے پاس بھی قیام فرمایا۔ وہاں سے مانڈو تشریف لے گئے اور مانڈو سے روانہ ہوکر شیخ محدث احمدآباد پہونچے۔ وہاں ان دنوں مرزا نظام الدین احمد مصنف طبقات اکبری صوبہ کے بخشی تھے۔ انھوں نے نہایت گرمجوشی سے شیخ کا استقبال کیا اور اصرار کرکے آیندہ موسم حج تک اپنے پاس ٹھہرایا۔

احمدآباد میں شیخ عبدالحق دہلوی، شیخ وجیہ الدین علوی کی خدمت بابرکت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ خود شیخ عبدالحق اخبارالاخیار میں لکھتے ہیں کہ،

"محرر سطور جب سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے ارادے سے احمدآباد (گجرات) پہونچا تو اس وقت وہاں مشائخ متاخرین میں شیخ وجیہ الدین علوی جو جامع کمالات و برکات سن رسیدہ بزرگ تھے۔ درس و تدریس میں مشغول تھے۔ کتابوں کی تصنیف

وترغیب اور ارشاد طالبان حق میں ان کو انہماک تھا۔ ان کی ملاقات کی سعادت حاصل کی اور سلسلۂ قادریہ کے کچھ اذکار و اشغال ان سے حاصل کیے"۔

شیخ محدث دہلوی دہلی سے بلا کسی زاد راہ کے احمد آباد پہونچے تھے۔ احمد آباد میں مرزا نظام الدین بخشی نے جو ان کے دیرینہ دوست تھے ان کو اپنے یہاں ٹھہرایا اور جب جہاز روانہ ہونے کا وقت آیا تو زاد راہ فراہم کی اور جہاز کا بندوبست کیا۔

رسالہ صلوٰۃ الاسرار میں شیخ محدث نے لکھا ہے کہ ان کا شریک سفر ایک قادری درویش تھا۔ صبح کو جب جہاز کا لنگر اٹھایا جاتا تھا۔ یہ درویش جہاز کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کا نام زور زور سے لیا کرتا۔ شیخ کو ان کی آواز بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔

مکہ مکرمہ میں محدث دہلوی ماہ رمضان سے کافی عرصہ قبل مکہ معظمہ پہونچ گئے تھے۔ چنانچہ رمضان سنہ ۹۹۶ھ تک انھوں نے وہاں کے محدثین سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس لیا۔ پھر شیخ علی متقی کے شاگرد و مرید شیخ عبدالوہاب متقی کے علمی و عملی کمالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد انکے دامن سایۂ فگن سے وابستہ ہو گئے۔

رمضان المبارک میں شیخ عبدالوہاب متقی کے زیر نگرانی حرم شریف میں سنت اعتکاف بجا لائے بعد رمضان انھی کے پاس مشکوٰۃ کی تعلیم کی اور جب حج کا موسم آیا تو شیخ عبدالوہاب ہی کی معیت میں تمام مناسک حج ادا کیے۔ حج سے فراغت کے بعد جب محدث دہلوی نے مدینۂ منورہ کا ارادہ فرمایا تو شیخ عبدالوہاب نے کہا کہ ہوا نہایت سرد ہے اور تم کمزور جسم کے آدمی ہو اگر اسی وقت چلے گئے اور کوئی بات ہو گئی تو واپسی کو جلدی چاہنے لگو گے۔ اس لیے چند روز تحمل کرو۔

مدینہ منورہ میں | شیخ عبدالحق مدینہ منورہ کی حاضری کے لیے بہت بیتاب تھے مگر شیخ کے مشورہ کی خلاف ورزی کیسے کرتے۔ مجبوراً دو تین ماہ صبر کیا۔ جب ربیع الاول آیا تو بے تابی شوق بڑھی اور شیخ سے پھر اجازت چاہی۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر زائد صبر کی طاقت نہیں ہے تو مبارک ہو۔ اجازت پاکر ۲۳ ربیع الاول کو مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے اور ۵ یا ۶ ربیع الآخر کو مدینہ منورہ پہونچے اور سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں حاضری کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ جمعہ کی رات آئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں اپنا قصیدہ پیش کیا۔ جب اس شعر پر پہونچے ؎

خرابم در غم ہجر جمالت یا رسول اللہ　　جمال خود نما رحمے بجان زار شیدا کن

تو اس کی تکرار کرتے کرتے زار زار رونے لگے۔ شیخ خود فرماتے ہیں کہ غالب گمان یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند فرمایا کیونکہ رجب ۹۹۸ھ کی ماہ تاریخ کو رات جبل احد کے قریب ایک مسجد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور میں آپ سے بغلگیر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبسم فرمایا۔

شیخ محدث رجب تک مدینہ منورہ میں مقیم رہے پھر مکہ معظمہ آکر شیخ عبدالوہاب سے مشکوٰۃ کا درس پورا کیا۔ جب اس سے فارغ ہوئے تو شیخ عبدالوہاب نے فرمایا کہ:

"الحمد للہ اس علم پر پورا عبور حاصل ہو گیا بلکہ اس قدر ہو گیا ہے کہ اس علم کی خدمت کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اب چند دن دوسرے کام میں مصروف ہونا چاہیے اور خلوت و ذکر اللہ کی کچھ لذت بھی چکھنی چاہیے۔ (زاد المتقین)

شیخ عبدالوہاب نے آپ کو تصوف کی کچھ کتابیں پڑھائیں ان میں قواعد الطریقہ فی الجمع بین الشریعۃ والحقیقۃ اور منہج السالک الی اشرف المسالک

قابل ذکر ہیں مثلاً الذکر کتاب عربی میں ہے جس کا شیخ محدث نے فارسی میں ترجمہ کیا ہے
پھر شیخ عبدالوہاب نے شیخ محدث دہلوی کو حرم شریف کے ایک حجرے میں جو باب جیاد کے مقابل اور حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان واقع تھا بٹھا دیا۔ شیخ عبدالوہاب نے اس زمانہ میں انکی طرف خاص توجہ فرمائی ان کا یہ دستور تھا کہ ہر جمعہ کو حرم شریف میں حاضر ہوا کرتے تھے جب یہاں آتے تو شیخ عبدالحق سے بھی ملتے اور ان کی عبادت وریاضت کی نگرانی فرماتے۔ جب اس خلوت کدہ سے باہر آنے کی اجازت ملی تو شیخ محدث نے صحیح مسلم کی قرأت کی اجازت چاہی۔ جب اس سے بھی فارغ ہو گئے تو حکم ہوا "اب ہندوستان کا ارادہ کرو" چنانچہ باوجود نہ چاہنے کے شیخ محدث دہلوی کو ہندوستان کا رخ کرنا پڑا۔

خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں رسالہ وصیت میں شیخ عبدالحق فرماتے ہیں کہ جب ہندوستان واپس آیا تو خواجہ محمد باقی باللہ نقشبندی کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ عرصہ تک طریقہ خواجگان کی مشق کی اور ذکر، مراقبہ، رابطہ حضور، اور یادداشت کی تعلیم حاصل کی۔
محمد صادق ہمدانی نے کلمات الصادقین میں لکھا ہے کہ شیخ محدث نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے روحانی ارشاد پر حضرت خواجہ باقی باللہ کے دست حق پر بعیت کی تھی۔ اگر سولہویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے شروع کی مذہبی اور روحانی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی ذات گرامی احیائے سنت اور اماتت بدعت کی تمام تحریکوں کا منبع ومرجع تھی۔ ان کے ملفوظات ومکتوبات کا ایک ایک حرف انکی مجددانہ مساعی، بلندی فکر ونظر کا شاہد ہے۔ شیخ عبدالحق نے جب احیائے علوم کا بیڑا اٹھایا تو حضرت باقی باللہ

کا آفتاب رشد و ہدایت نصف النہار پر تھا۔ ناممکن تھا کہ وہ ان سے کسب فیض نہ کرتے ذیل میں ان کا مختصر حال سپرد قلم کیا جاتا ہے۔

خواجہ باقی باللہ خواجہ صاحب سنہ ۹۷۱ھ میں کابل میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد قاضی عبدالسلام علم و فضل میں ممتاز تھے۔ فقہ و حدیث میں کمال رکھتے تھے انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص توجہ کی۔ خواجہ محمد باقی نے ملا صادق حلوائی سے علم حاصل کیا۔ ایک مرتبہ دوران درس ایک مجذوب نے خواجہ صاحب کو مخاطب کرکے کہا ؎

در کنز و ہدایہ نتواں دید خدا را آئینۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

اس شعر کا سننا تھا کہ خواجہ صاحب کا دل علوم ظاہری سے گھبرا گیا اور مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ عرصہ تک صحرا نوردی کرتے رہے۔ مختلف بزرگوں کی خدمت میں رہ کر فیض حاصل کیا اور بالآخر ایک روحانی اشارے پر ہندوستان کا رخ کر دیا اور یہاں آکر نقشبندیہ سلسلہ کے فیض کو عوام و خواص تک پہونچایا۔

شیخ عبدالحق نے خواجہ باقی باللہ کے دامن تربیت سے وابستہ ہو کر بہت کچھ حاصل کیا۔ کتاب المکاتیب والرسائل میں خواجہ صاحب کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔

مہدوی تحریک شیخ عبدالحق جب پیدا ہوئے ہیں تو مہدوی تحریک عروج پر تھی۔ مہدوی تحریک کے بانی سید محمد جونپوری ۱۴ جمادی الاول سنہ ۸۴۷ھ مطابق ۱۴۴۳ء کو جونپور میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ دل و دماغ کی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اس لیے معاصرین نے ان کو اسد العلماء کا خطاب دیا تھا۔ درس و تدریس میں خاص مہارت تھی ان کے

معتقدین میں شاہ وگدا سب ہی شریک ہوتے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں سید محمد جونپوری معتقدین کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر حجاز چلے گئے۔ وہاں عرصہ تک ارشاد و تلقین اور درس و تدریس میں مصروف رہے۔ مہدوی تذکروں میں لکھا ہے کہ ۸۹۵ھ میں جب کہ ان کی عمر باون سال تھی۔ انھوں نے مکہ میں مہدویت کا اعلان کیا۔ اس کے بعد وہ گجرات کی طرف متوجہ ہوگئے اور احمدآباد میں مہدوی تحریک کا مرکز قائم کیا۔ وہاں علماء نے ان کی شدید مخالفت کی لیکن جتنی وہ مخالفت کرتے تھے اتنی ہی انکی تحریک ترقی کرتی تھی۔

مولانا ابوالکلام آزاد تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ:

"عشق کی صداقت اور قلب کی پاکی نے ان کی دعوت و تذکیر میں ایسی تاثیر بخشی تھی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہزاروں آدمی حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے اور متعدد سلاطین وقت نے ان سے بیعت کی۔ ان لوگوں کے طور طریق کچھ عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے اور صحابۂ کرام کے خصائص کی یادتازہ کرتے تھے۔ عشق الٰہی کی ایک جاں سپار جماعت تھی جس نے اپنے خون کے رشتوں اور وطن و زمین کی فانی الفتوں کو ایمان و محبت کے رشتہ پر قربان کر دیا تھا اور سب کو چھوڑ چھاڑ کر راہ حق میں ایک دوسرے کے رفیق و غمگسار بن گئے تھے۔ امیر و فقیر۔ اعلیٰ و ادنیٰ سب ایک ہی حال اور ایک ہی ڈھنگ میں رہتے اور بجز خلق اللہ کی ہدایت و خدمت اور احکام شرع کے اجراء و قیام کے اور کسی کام سے واسطہ نہ رکھتے تھے۔"

سید محمد مہدی کا مقصد اگرچہ احیائے سنت اور اماتت بدعت تھا لیکن انکی تحریک زیادہ عرصہ تک نہ چل سکی۔ مہدویت کا تصور اسلام کے ایک بنیادی اصول

ختم نبوت سے انکار کیا اور شیخ علی متقی۔ شیخ عبدالوہاب متقی اور دیگر علمائے اسلام نے ان کی پُرزور تردید کی اور آخر کار یہ فتنہ نیست و نابود ہو گیا۔

شیخ عبدالحق اور علم حدیث | شیخ عبدالحق محدث دہلوی حجاز سے واپس آئے تو اپنے ساتھ علوم کا خزینہ بھی ساتھ لے آئے اور پھر اشاعت علوم میں مشغول ہو گئے۔ بالخصوص علم حدیث کی اشاعت و تدریس میں ایسے منہمک ہو گئے کہ پورے ملک ہندوستان میں ایک سلسلۂ تعلیم عام ہو گیا انھوں نے فن حدیث میں کئی کتابیں لکھیں۔ عربی میں مشکوٰۃ کی شرح لمعات مشہور ہے۔ فارسی میں اشعۃ اللمعات ہے جو لمعات سے زیادہ مفصل ہے[1]

ایک غلط فہمی | نواب صدیق حسن خاں نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ شیخ عبدالحق ہی سب سے پہلے علم حدیث کو یہاں لائے اور اس کی نشر و اشاعت کی۔ یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حجاز مقدس میں جن مشائخ سے آپ نے علوم ظاہرہ و باطنہ حاصل کیے اور جن سے مشکوٰۃ پر عبور حاصل کیا۔ ان میں شیخ عبدالوہاب متقی بھی تھے جو گجرات سے حجاز جا کر مقیم ہوئے تھے۔ گجرات کے شہر پٹن نہروالہ، احمد آباد، بھڑوچ اور سورت میں ان کے سفر حجاز سے بہت پہلے حدیث کا چرچا عام ہو چکا تھا۔ چنانچہ سید عبدالقادر حضرمی لکھتے ہیں:

وفیھا (ای فی سنۃ ۹۷٤) فی رجب ختم صحیح البخاری عند الاَمیر الصالح الغفان الحبشی بقرأۃ العلامۃ القاضی جمال الدین المھائمی وعمل الغفان ختمۃ ضیافۃ	رجب ۹۷۴ھ میں امیر الغفان کی حویلی میں علامہ جلال الدین مہائمی کی قرأت سے ختم بخاری کی تقریب ہوئی۔ اس موقع پر الغفان نے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو شرح

ضمیمہ ۱

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے سفر حرمین سے پہلے گجرات میں بخاری شریف کا درس جاری تھا کیونکہ محدث دہلوی کا سفر حجاز ۹۹۶ھ کے بعد ہے۔

تصانیف | شیخ نے حدیث کے علاوہ سب سے زیادہ توجہ سیرۃ النبیؐ کی تاریخ پر دی۔ چنانچہ آپ نے مدارج النبوۃ کے عنوان سے سیرۃ النبیؐ پر ایک مبسوط کتاب ترتیب دی۔ مدینۃ النبیؐ کی تاریخ میں جذب القلوب فی دیار المحبوب بھی مشہور ہے جس کا اردو ترجمہ تاریخ مدینہ منورہ کے نام سے شایع ہوا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی دوسری علمی دلچسپی قادریہ سلسلہ کے بانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی سے تھی۔ انھوں نے ان کی تصانیف کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ غنیۃ الطالبین کا ترجمہ کیا۔ فتوح الغیب کی شرح لکھی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کی سوانح عمری بہجۃ الاسرار کا خلاصہ زبدۃ الآثار کے عنوان سے مرتب کیا۔

شیخ کی ایک اور تصنیف زاد المتقین الی طریق الیقین ہے جن میں ان شیوخ و اساتذہ کے حالات لکھے ہیں جن سے سفر حجاز میں فیض حاصل کیا۔

ایک رسالہ نورانیہ سلطانیہ ہے جس میں جہانگیر کے لیے سلطنت اور قواعد حکمرانی کو ترتیب دیا ہے۔ اُن کی سب سے زیادہ کامیاب تالیف اخبار الاخیار ہے جس میں ہندوستان کے اولیاؑ اور بزرگوں کے حالات تاریخی ترتیب سے لکھے ہیں۔

ان تصانیف کے علاوہ سو سے زائد اور تصانیف ہیں، وہ شاعر بھی تھے اور حقی تخلص تھا۔ مجموعۂ کلام حسن الاشعار کے نام سے مرتب ہوا ہے۔[2]

وصال | ۲۱ ربیع الاول ۱۰۵۲ھ کو یہ آفتاب علم جس نے چورانوے (۹۴) سال تک فضائے ہند کو منور رکھا غروب ہو گیا۔ وصیت کے مطابق حوض شمسی کے کنارے ان کو سپرد خاک کیا گیا۔

---

[1] النور السافر ص ۱۰۵ رود کوثر۔

اُردو نعت گوئی کے موضوعات

از

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

(۲)

نورانیت | حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت نور کو موضوع سخن بنا کر عربی، فارسی اور اردو میں کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ شعراء نے مختلف پیرائے میں نور کی کیفیت بیان کی ہے۔ نعتیہ شاعری میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کے لیے اس موضوع میں ایسی ہی وسعت ہے اور ایسا ہی پھیلاؤ ہے جیسا کہ نور یا تجلی میں ہوتا ہے۔ نعت گو شعرا نے اس میدان میں اپنی مشاقی کے جوہر کامیابی سے دکھائے ہیں۔ دور جاہلیت کا مشہور شاعر ابو کبیر ہذلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانی صفت کا بیان اس طرح کرتا ہے ؎

وَإِذَا نَظَرْتُ إِلَى أَسِرَّةِ وَجْهِهِ ۔۔۔ بَرَقَتْ كَبَرْقِ الْعَارِضِ الْمُتَهَلِّلِ [1]

(ترجمہ) جب میں نے آپ کے روئے تاباں پر نگاہ ڈالی تو اس کی شان رخشندگی ایسی تھی جیسے کہ کسی کالا ابر میں بجلی کوندرہی ہو۔

حضرت حسان بن ثابت الانصاری کا یہ شعر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت نور کا غماز ہے ؎

متى يبدُ في الداجي البهيم جبينه ۔۔۔ يلح مثل مصباح الدجى المتوقد [2]

(ترجمہ: [illegible] جب آپ کی جبین مبارک نظر آتی تو ایک چمک ہوتی جیسے تاریک رات میں کوئی روشن شمع ہو)

فخر الدین نظامی اپنی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ مجسم کو مشعل سے تشبیہ دیتے ہیں۔

محمد جم آد بنیاد نور · دو سے جگ ستے دسے پرسا د نور
مشالا سی کا جو دیسے گہیر · جلے جگ اس تیں اسے دیہہ دھیر

میرانجی شمس العشاق (م ۱۴۹۸ء) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کی تخلیق کو مقدم مانتے ہیں

وہ نبی اول نور · بس عالم یہ معمور
نورانی احمد نام · یہ اچھا ذوق آرام

باجن (م ۱۵۰۶ء) نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو اس دنیا کے لیے منبعِ نور سے تعبیر کیا ہے۔

باجن تیرا باولا تجہ کارن پتیئے دیکے · نبی محمد مصطفیٰؐ میں نور جگ میں جھلکے

(باجن شیخ بہاؤ الدین: خزائن رحمت اللہ قلمی ورق ۲۹)

نبیؐ کی ولادت سے ایک جہان روشن ہوگیا اور کفر کا اندھیرا ختم ہوا۔ اس خیال کو سلطان محمد قلی قطب شاہ (م ۱۶۱۱ء) نے مختلف پیرایوں میں بیان کیا ہے، ایک شعر ملاحظہ ہو:

تجہ کو ابت کی جوت تے عالم دینپارا ہوا · تج دین تے اسلام سے مومن جگت سارا ہوا

(کلیات محمد قلی قطب شاہ ص ۱۱۰۹)

غواصی کی "مینا ستونتی" اور "طوطی نامہ" میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سراپا نور ہونے کی توضیح کی گئی ہے۔ ابن نشاطی نے اپنی مشہور مثنوی "پھول بن" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے مجسم نور ہونے کی وضاحت کی ہے۔

نیشنل میوزیم دہلی میں حسینی کی ایک تصنیف بعنوان "نور نامہ" محفوظ ہے۔ اغلب ہے کہ یہ دکن کے معروف بزرگ شاہ حسین حسینی کی ہوگی۔ اس میں شاعر نے سیرت نبوی کے ساتھ آپؐ کے وصف نور کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ فتاحی کی مفید الیقین میں "تخلیق نور احمدی" کی وضاحت یوں کی گئی ہے۔

خدا نے جو یک جھاڑ پیدا کیا	اوسے چار شاخاں ہویدا کیا
بڑا خالق ہے او سو رب المتین	رکھیا جھاڑ کا نا (نام) تو شجر الیقین
بنراں اجلے موتی کے پردے بہتر	رکھیا نور اور کوئی پیدا اش کر
دیا مور کا شکل اس نور کوں	ہوا فلک او جھاڑ اس سور سوں

فتاحی کے اشعار میں بعض جگہ غیر ضروری "حروف جار" کا استعمال اس نظم میں سقم پیدا کر دیتا ہے۔

مختار کے "مولود نامے" میں بھی "آفرینش نور محمدؐ" کے متعلق عجیب عجیب روایات بیان کی گئی ہیں۔

اسی دور کے ایک غیر معروف شاعر عنایت کا 'نور نامہ' ہمارے پیش نظر ہے۔ اس نے دعویٰ کیا ہے کہ پہلے یہ نور نامہ فارسی نثر میں تھا۔ جس کا اس نے دکنی زبان میں ترجمہ کر دیا۔ اس کی اہمیت بڑھانے کے لیے اس نے ورق نمبر ۵ الف پر امام غزالیؒ کے متعلق یہ روایت درج کی ہے کہ انھوں نے سلطان محمود شاہ کو یہ 'نور نامہ' تحفتاً پیش کیا تھا جس کی وجہ سے وہ عرب و عجم میں فتح یاب ہوا۔ لیکن اس کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے فتاحی کی مفید الیقین کے کئی اشعار اپنے نور نامہ میں سرقہ

کس لیے ہیں۔ نور نامہ "مفید الیقین" کے ۱۷ سال بعد یعنی ۱۶۹۹ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ اس میں فتاحی کی مفید الیقین کے کئی اشعار جوں کے توں شامل کر لیے گئے۔ عنایت کے 'نور نامہ' میں ہندو اسطور کا رنگ کلی طور پر جھلکتا ہے۔ ایک جگہ یہ روایت نقل کی ہے کہ "تخلیق نور محمد" مکمل ہوتے ہی اللہ رب العزت نے تمام ارواح سے اس سراپا نور کو دیکھنے کے لیے کہا۔ روحوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی جسم کے جس حصہ کو دیکھا دنیا میں آکر اسی اعتبار سے انھیں بزرگی ملی یعنی اگر روح نے گردن دیکھی تو دنیا میں وہ آدمی تاجر ہوا۔ بازو دیکھے تو سپاہی وغیرہ۔ ہندوؤں کی مقدس کتاب "رگ وید" میں بھی برہمن، چھتری، ویش اور شودروں کی پیدائش کے متعلق ایسا ہی خیال پیش کیا گیا ہے۔

ایک اور شاعر احمد کا نور نامہ (۱۱۳۶ھ/۱۷۲۳ء) ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں نظر سے گذرا، جس میں شاعر نے حتی الوسع اس بات کی کوشش کی کہ روایات صحیحہ منظوم کرے اور اس میں بڑی حد تک وہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے متعلق غوثی بیجاپوری نے اپنی تصنیف "قصص الانبیاء" میں کئی روایتیں منظوم کی ہیں۔ غوثی نے یہ روایات خالصتاً دینی و علمی حیثیت سے پیش کی ہیں جس کی وجہ سے ان میں شعریت کا فقدان ہے اور بلحاظ تاثر اشعار کمزور ہیں۔ تخلیقِ نور محمدؐ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے:

ہزار ایک سال لک پھرتا تھا او نور — ادب سوں تھا طوافِ حق میں معمور

اول کرتا ذکر تھا احدیت کا — جو بے چون بے شبہ کی او صفت کا

ہوا تب حکم اس محبوب کے نور — ہے معشوق اور مرغوب کے نور

تجھے میں قسم کرتا ہوں آنا چار
یو فرما قسم کیتا چار غفار

کیا قسم اول سوں عرش پیدا
قلم قسم دوم سنے ہو ہویدا

کرا قسم سیوم سنے او جنت
بہشت او پر محمد کی ہے منت[۶]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے چوتھے حصہ کو اللہ تعالیٰ نے پھر چار حصص میں منقسم کیا۔ پہلا حصہ خود محمدؐ کا، دوسرے حصہ سے عقل و فہم تیسرے سے شرم و حیا اور چوتھے سے معرفت پیدا کی جو مومنوں کے سروں کے اندر رکھی گئی ہے۔

عقیدت و عقیدے کی شاعری میں شعریت بڑی حد تک مفقود ہوتی ہے۔ یہی عقیدت اگر علمی مسائل کے خول میں رکھ کر شعری پیکر اور شعریت کی چاشنی میں ڈھالی جائے تو شاعر کے کمالِ فن کا عمدہ نمونہ قرار پاتی ہے۔ دکنی شاعر باقر آگاہ (م ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء) اس سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے "ہشت بہشت" کے پہلے رسالے "من دیپک" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصافِ نور، قرآن و احادیث کی روشنی میں بیان کیے ہیں۔ شاعر نے اپنے رسالے کا نام موضوع کی مناسبت سے رکھا ہے دیپک ہندی لفظ نور کا مظہر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت "سراج منیر" کا عکاس ہے۔ رسالے میں آگاہ اسی تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

جب نہیں تھا کچھ ہستی سے نشاں
تھے کنج عدم میں سب پنہاں

نا ارض اتھی ہور نا افلاک
نا انس نا جن تھی نا املاک

حق کیتا تب احمد کا نور
اس وقت ہوا ہے اوس کا ظہور

کوئی بولا شہ کو اسے مرسل
کیا کیتا پیدا حق اول

فرمائے محمد میرا نور
ہے سب کے اول اوس کو ظہور

نورناموں میں غلوے عقیدت کے اتنے حجابات حائل ہوگئے ہیں کہ اصل نور نظر نہیں آتا۔ کبھی تو غلط روایات کا غلبہ اس قدر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پُر عظمت شخصیت نعوذ باللہ کسی اسطور کا مافوق الفطری کردار نظر آتی ہے۔ یا سماوی خلقت کی مبیر العقول ہستی۔ تاہم اس راہ میں بھی سنبھل کر قدم رکھنے والے کئی اردو شعراء ہیں جن میں امیرؔ مینائی، بیان میرٹھی اور محسنؔ کاکوروی کے نام قابل ذکر ہیں گو بعض جگہ لغزشیں ان سے بھی ہوئی ہیں لیکن ایسا صرف عقیدت کی وجہ ہی سے ہوا ہے۔

" نورمحمدیؐ" کو اپنی مثنوی " نور تجلی" کا موضوع بنا کر امیر احمد مینائی (م ۱۳۱۸ھ/ ۱۹۰۰ء) نے تین روایتیں نقل کی ہیں۔ پہلی روایت تو روح البیان میں منقول ایک حدیث کا منظوم ترجمہ ہے۔ مگر باقی دونوں روایات پر اسرائیلی اسطور اور تصوف کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ اکثر نورناموں میں جو بات خصوصیت کے ساتھ برتی گئی ہے وہ یہ کہ پیدائش نور محمدیؐ کے بیان میں "لولاک لما خلقت الافلاک" کا بار بار ذکر ہوا ہے۔ درآنحالیکہ اس میں نور سے متعلق کوئی وضاحت نہیں ہے دوسری روایت میں تقسیم نور کا ذکر ہے۔ جسے ہم غوثی کے یہاں دیکھ چکے ہیں۔ تیسری روایت البتہ خالص متصوفانہ لب و لہجہ لیے ہوئے ہے۔ اس میں شاعر نے "حجابات" کے رموز و اسرار بیان کیے ہیں۔ نور محمدؐ کو اللہ تعالیٰ نے بارہ حجابات کے اندر رکھا تھا ہر حجاب کا ایک نام بھی شاعر نے بتایا ہے۔ مثلاً حجاب عظمت، حجاب قدرت، حجاب ہدایت اور نبوت وغیرہ۔ ان حجابات میں نور محمدی ہزاروں برس رہا۔ جب تمام پردے ہٹ گئے تو وہ نور شفاعت، رحمت، نصیحت، صبر و شکر، جود و سخا، امانت، یقین، حلم، قناعت اور محبت وغیرہ کے بحور میں غوطہ زن رہا۔ اسکے بعد

سات سو مقامات کو طے کرنے کے بعد جب نور "مقام محبت" پر پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ذات سے آگاہ کر دیا اور ذکر و شغل کی تاکید کی۔ اذکار و اشغال میں نور محمدی کا استغراق دیکھ کر ہی اللہ تعالیٰ نے پانچوں نمازیں آپؐ پر اور آپؐ کی امت پر فرض کر دیں۔

مثنوی "نور تجلی" عقیدت میں ڈوبی ہوئی شعری کاوش ہے۔ گو شعریت کا فقدان بعض جگہ کھٹکتا ہے، لیکن پھر بھی ایسے خشک موضوع کو شاعر نے موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔

ہمارے شعری سرمایۂ ادب کو جہاں نعت رسولؐ کے ایک پہلو "نور" نے بلحاظ موضوع وسعت بخشی وہاں فنی لحاظ سے بھی اسے مختلف جہتوں سے روشناس کرایا 'نور' کی تشبیہات و استعارات کی قوس قزح کے رنگوں سے شعری فضا رنگین ہو گئی اور صنائع لفظی کا گلشن کھل اٹھا۔ نور کی معنوی وسعت میں مبالغہ، حسن تعلیل اور ایہام وغیرہ کا بے ساختہ اور برجستہ استعمال شعراء کے لیے سہل ہو گیا اور 'نور' کے نورانی تخیل کو انھوں نے کبھی میدان مثنوی کی سمت موڑا، کبھی مسدس و مخمس کی راہ دکھلائی، کبھی بیت و رباعی پر اکتفا کیا تو کبھی تغزل کی فضا میں اسے پرواز بخشی۔ غرضکہ "نور" کی علامت کے مختلف النوع تجزیے کیے گئے۔ جس کی وجہ سے اشعار کے لعل و جواہر نور کی تابناکی سے خزینۂ ادب میں جگمگانے لگے۔ محمد محسن کاکوروی (م ۱۹۰۵ء) 'نور' کا استعمال اپنے اشعار میں کس کس انداز سے کرتے ہیں۔

سایہ زیبا ہی نہ تھا آپ کی قامت کیلیے — روشنائی تھی یہی مہر نبوت کے لیے

جسم محبوب خدا نور کا اک پتلا ہے — سایۂ حق وہ شہ منزلت طٰہٰ ہے

لاکھ عاشق ہوں مگر لطف دو محبوب نہیں — ظل حق ہو تو ہو پر ظل نبی خوب نہیں[۲۹]

مندرجۂ بالا اشعار میں شاعر نے 'نور' کی مناسبت سے 'سایہ'، 'روشنائی' اور

"نقل" وغیرہ متضاد الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ جو مناسبت لفظی اور نور کے بالمقابل نسبت تضاد کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کے علاوہ سرور جہاں آبادی، حالی، اکبر، شاد عظیم آبادی، آصف، اقبال سہیل، ظفر علی خاں اور جگر مراد آبادی وغیرہ کے کلام میں بھی نور محمدی سے متعلق ابیات پائے جاتے ہیں جو صنعت لفظی و معنوی کا بہترین نمونہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔

حفیظ جالندھری نے "شاہنامہ اسلام" جلد اول میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "یہودیوں نے حضرت عبداللہ میں علامات نور محمدی پا کر انھیں بارہا ہلاک کرنے کا قصد کیا مگر ہمیشہ ناکام رہے۔ حفیظ صاحب نے اس طرح کا ایک اور واقعہ بھی نقل کیا ہے، جس کا ماخذ دلائل ابی نعیم طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری ہیں، لیکن اکثر ارباب نظر کے نزدیک یہ واقعہ ضعف سے خالی نہیں۔ تاہم بعض کے نزدیک روایت کا تواتر اسے "حسن لغیرہ" کے زمرے میں کر دیتا ہے۔ یہاں واقعہ کی صحت و ضعف سے بحث نہیں، دکھانا یہ ہے کہ شعراء نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت نورانی کے بیان میں اس کو نہایت اہتمام سے منظوم کیا ہے۔ بعض شعراء نے محتاط انداز میں صرف آیات قرآنی اور احادیث صحیحہ ہی کو بنیاد بنا کر "نور نامے" لکھے ہیں۔ اور بعض نے "نور محمدی" کو تشبیہات، استعارات اور کنایات وغیرہ کے طور پر اپنے اشعار میں برتا ہے۔ بعض نے نور کو بطور علامت بھی استعمال کیا ہے اور اس کے ذریعہ اپنے اشعار میں کئی معانی و مفاہیم پیدا کیے۔ مثلاً صلصلۃ الجرس کے شاعر عتیق حنفی نے آپؐ کے نور کی مناسبت سے آپؐ کو "مشعل کائنات"، "شمع بزم حیات" وغیرہ القاب دے کر آپؐ کے نور کو بطور علامت کے استعمال کیا ہے۔

معراج نامے اردو کے معراج ناموں سے ایک طرف عقیدتِ رسولؐ کا اظہار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کی وجہ سے سماوی سفر پر مشتمل ادب وجود میں آیا ہے۔ اس قسم کے ادب کا سراغ سب سے پہلے ہومر کی "اوڈیسی" میں ملتا ہے۔ یہ ایک یونانی ڈرامہ ہے جس میں جنت، دوزخ اور اعرافات کے سفر اور وہاں کے آثار و مشاہدات کا خیالی بیان ہے۔ ڈانٹے (م ۱۳۲۱ء) نے "ڈیوائن کامیڈی" (طربیۂ خداوندی) میں اسی قسم کے سفر کو منظوم کیا تھا۔ عربی میں ابن شہید الاندلسی (م ۱۰۳۲ء/۴۲۶ھ) کے "رسالۃ التوابع والزوابع" اور ابو العلاء المعری (م ۱۰۵۵ء/۴۴۹ھ) کے "رسالۃ الغفران" میں بھی سفر فلک الافلاک کا بیان ہے۔ محی الدین ابن العربی (م ۱۲۴۰ء) کی "فتوحات مکیہ" میں بھی سیر فلک کا ذکر ہے۔ فارسی مثنوی "نہ سپہر" میں حضرت امیر خسرو نے نہایت ہی شاعرانہ انداز میں سماوی سفر کی روداد پیش کی ہے۔ فارسی مثنوی "دوستان خیال" میں بھی آسمانی سفر کا بیان ہوا ہے اور دورِ جدید کے مشہور شاعر علامہ سر شیخ محمد اقبال کی "جاوید نامہ" کو تو سماوی ادب پر مشتمل سفرناموں میں بلند درجہ حاصل ہے۔ غرضکہ سیرِ سماوی کو موضوعِ سخن بنانے کی روایت بہت قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہے۔ سعید احمد اکبرآبادی نے ڈاکٹر لویس عوض کی رائے نقل کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے:۔

> "اس طرح کے ادب پارے مستقل بالذات ہیں۔ ان میں اسلامی روایات کے ساتھ ساتھ یونانی اثرات بھی پائے جاتے ہیں... ڈانٹے کے زمانے میں واقعۂ معراج پر اسپانوی، لاطینی اور فرانسیسی زبانوں میں تین تراجم موجود تھے۔"

معراج تاریخ اسلام کا عظیم الشان واقعہ ہے۔ یہ واقعہ نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔

البتہ علمائے کرام کے ایک طبقہ کے نزدیک یہ ایک روحانی سفر تھا اور دوسرے کے خیال میں جسدی سفر، اس بحث سے قطع نظر اس تاریخی واقعہ نے ادب پر بڑی گہری چھاپ چھوڑی ہے جس کی وجہ سے شاعری کو ایک نیا موضوع ملا اور نئی علامات، تشبیہات اور استعارات و اصطلاحات بھی وجود میں آئیں۔

اردو شعرا نے مثنویوں میں نعت کے ذیل میں واقعہ معراج کو بالواسطہ بھی نقل کیا ہے اور بلاواسطہ خالص معراج نامے بھی ترتیب دیے ہیں۔ ملا وجہی اور نصرتی نے علاحدہ معراج نامے ترتیب نہیں دیے لیکن واقعہ معراج کو اپنی مثنویوں میں نعت رسول کے ضمن میں تفصیل سے بیان کیا ہے جس کی وجہ سے انھیں مستقل معراج ناموں کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

دکن میں واقعہ معراج کو موضوع بنا کر خالصتاً "معراج نامہ" ترتیب دینے کی روایت نثر میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (م ۱۴۲۱ء/۸۲۵ھ) کے یہاں پائی جاتی ہے اور نظم میں بلاقی کے یہاں۔ بلاقی کے معراج نامہ (م ۱۶۴۵ء/۱۰۵۶ھ) میں یہ مذہبی موضوع تصوف کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن بے بنیاد روایات کو جوڑنے کی وجہ سے ان کا معراج نامہ بس ایک دلچسپ واقعہ سے آگے نہیں بڑھ سکا۔ بلاقی نے فارسی معراج ناموں سے استفادہ کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے یہاں اثنا عشری عقائد کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمانی سفر کی منظر کشی کرنے میں شاعر نے وسعت نظر سے کام لیا ہے۔ جنت و دوزخ کے مناظر، پانچویں فلک کے ہیبت ناک فرشتے اور براق کی تصویر کشی میں اس نے اپنی مہارت کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔

بلاقی نے سات سو ابیات میں یہ معراج نامہ قلبند کیا ہے جو اس کے بقول "خلق میں عجیب و غریب یہ قصہ ہے"۔ اس مثنوی میں شاعر نے جگہ جگہ علم نجوم کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ جو اس کے علم نجوم سے واقفیت کی دلیل ہیں۔

بلاقی کے بعد دوسرا معراج نامہ معظم نے ۱۶۶۹ء/۱۰۸۰ھ میں ترتیب دیا تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر عنوان ایک شعر سے شروع ہوتا ہے۔ اور عنوان کے سب اشعار ایک ہی بحر اور ردیف و قافیہ میں لکھے گئے ہیں۔ ان سب اشعار کو اگر یکجا کر دیا جائے تو ایک الگ نظم بن جاتی ہے، جس میں سارے معراج نامے کا خلاصہ آجاتا ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے سالار جنگ کتب خانے کے مخطوطات کی فہرست میں فتاحی کے معراج نامہ کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس دور کا سب سے بہترین معراج نامہ جو شعری خوبیوں سے مالا مال ہے، مختار کا ہے۔ اس نے معراج نبوی کی پانچ وجہیں بیان کی ہیں۔ جو اگرچہ نصوص و احادیث سے ثابت نہیں ہیں مگر ان میں شعریت پوری طرح موجود ہے۔

پہلی وجہ یہ بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مشقت دیکھ کر اللہ رب العزت نے سورہ طٰہٰ نازل فرمائی اور اپنے محبوب کو اپنے پاس بلایا۔

دوسرا سبب یہ بتایا ہے کہ قیامت کے دن جب ہر ایک کو اپنی ہی فکر ہوگی اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کی فکر ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کے اذن سے آپ اپنی امت کی شفاعت کریں گے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو عرش پر بلا کر محشر کے حالات سے آگاہ کر دیا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی اولیت کا شرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو

حاصل ہو جائے۔

چوتھا سبب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا حبیب مکرم بنایا اور آپ کے تصرف میں زمین و آسمان کے خزانے دے دیئے وہ تمام گنج ہائے ارضی اللہ رب العزت نے معراج کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ظاہر کر دیئے۔

پانچواں سبب شاعر کا اپنا نتیجۂ فکر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں زمین و آسمان کا مکالمہ نظم کیا ہے، جس میں وہ اپنی اپنی خوبیاں بیان کرتے ہیں اس سے شاعر کی قادرالکلامی اور علوم ہیئت و نجوم پر گہری نظر کا پتہ چلتا ہے۔

اپنی بڑائی اور برتری بیان کرتے ہوئے زمین آخری حربہ استعمال کرتے ہوئے کہتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک مجھ پر ہیں اس لیے میں تجھ سے افضل ہوں آسمان یہ دلیل سن کر خاموش ہو جاتا ہے اور اللہ رب العزت کی بارگاہ عالی میں گڑگڑا کر دعا کرتا ہے جو قبول ہو جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں آسمانوں پر بلایا۔

مختار نے سدرۃ المنتہیٰ، عرش اعظم اور جنت و دوزخ وغیرہ کی منظرکشی عمدہ پیرائے میں کی ہے اور شعری محاسن کا خیال بھی رکھا ہے۔

عادل شاہی دور کے مشہور شاعر میراں ہاشمی (م، ۱۶۹۷/۱۱۰۹ھ) کے معراج نامہ کا ذکر بھی تاریخ کی کتب میں آیا ہے۔ باوجود نابینا ہونے کے ہاشمی معراج کے واقعہ کی تمام جزئیات کو بالتفصیل بیان کرتا ہے۔ اس کے معراج نامے میں وہ تمام عناصر دکھائی دیتے ہیں جن کا استعمال اس کے پیش روؤں نے کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دل کے نور سے تخیل کی آنکھیں روشن کر لی تھیں اور عقیدت کی روشنی میں جنت و دوزخ،

خود ملائکہ بھی اس کے دیدار سے مشرف ہوا تھا جو دیدہ وروں کو بھی مشکل ہی سے نصیب ہوتا ہے۔

گجرات کے شاعر امینؔ نے بھی واقعۂ معراج کو اپنا موضوع سخن بنایا تھا۔ اس کے "مولود نامے" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، معراج اور وفات کا ذکر ہے۔

واقعۂ معراج کو الگ سے موضوع بنا کر لکھے گئے معراج ناموں میں بارہویں صدی ہجری کے ربع آخر میں ابوالحسن قربیؔ اور شاہ کمال الدین کمالؔ کے معراج نامے دکن کے مذہبی ادب میں شاندار اضافہ کرتے ہیں۔ قربیؔ نے اپنے معراج نامے کیلئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مشہور فارسی تصنیف "مدارج النبوۃ" کو بنیاد بنایا ہے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سماوی سیر کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ قربیؔ کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس نے معراج کے تمام واقعات اس طرح پیش کیے ہیں گویا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیان کر رہے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام واقعات اُن احادیث کا ترجمہ محسوس ہوتے ہیں، جن میں معراج کا ذکر ہوا ہے۔ کمالؔ نے بھی اپنا معراج نامہ مروجہ طریقوں ہی پر ترتیب دیا ہے۔ اس نے بلاقیؔ کے معراج نامے کے نقائص بھی بیان کر دیے ہیں۔ اس نے اپنی تصنیف کو ایک عربی معراج نامہ کا ترجمہ بتایا ہے جو اس نے بیت اللہ شریف سے منگوایا تھا۔ کمال نے بعض اشعار میں عربی کے جملے جوں کے توں رکھ دیے ہیں۔

دکن کی طرح معراج ناموں کی روایت شمالی ہند میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہماری تحقیق میں شمالی ہند میں اردو کا پہلا منظوم معراج نامہ ۱۷۰۸ء ۱۲۰۴ھ کا لکھا ہوا ملتا ہے۔ اسے ایک غیر معروف شاعر قاسم نے ترتیب دیا تھا۔ ریختہ میں لکھے گئے

اس معراج نامے میں بقول شاعر ۱۲۳۲ ابیات ہیں۔ معراج کے جزوی واقعات کی تفصیل میں شاعر نے تسلسل قائم رکھا ہے اور روایات کو نقل کرنے میں اس نے احتیاط سے کام لیا ہے مثلاً اس جزوی سرخی "ظاہر ہونا دودھ اور شہد کے دو پیالوں کا" کے تحت اس نے ترمذی کی ایک مشہور حدیث کو منظوم کیا ہے۔

قاسم نے معراج کی جزوی داستانوں کے آخر میں اکثر جگہ مثنوی مولوی معنوی کے ایک ایک شعر پہ تضمین کی ہے۔

قاسم کے متعلق معلومات نہیں مل سکے۔ معراج نامہ سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ شمالی ہند سے ان کا تعلق تھا اور حضرت نظام الدینؒ سے عقیدت رکھتے تھے۔ درگاہ نظام الدینؒ ہی کی مسجد میں ان کے دوست نے واقعہ معراج کو ریختہ میں نظم کرنے کو کہا تھا۔ قاسم نے بالآخر ۲ ماہ ۲۰ دن میں معراج نامہ نظم کر لیا اور اس کا نام "زبدۃ الاخبار" رکھا۔

ڈاکٹر صلاح الدین نے "دہلی کے اردو مخطوطات" میں عبداللطیف خاں کی مثنوی "جلوۂ طور" کا تعارف کرایا ہے، جس میں معراج کے واقعات قلبند کیے گئے ہیں۔

قاسم کے بعد شمالی ہند میں ضمیر لکھنوی نے "ریحان معراج" کے عنوان سے ایک معراج نامہ ۱۲۴۷/۱۸۳۰ء ترتیب دیا تھا، جس کا تعارف اسپرنگر کے ترتیب دیے ہوئے کیٹلاگ میں ہے۔ اس کا ایک نسخہ مجھے سالار جنگ کے قلمی مخطوطات میں ملا ہے۔ ضمیر کا معراج نامہ اثنا عشری عقائد پر مبنی ہے۔ اس نے معراج نامہ کی ابتدا ساقی نامہ سے کی ہے اور ہر واقعہ کے لیے ایک سرخی فارسی میں قائم کی۔ اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس سماوی سفر کا حال بیان کرنے کے بعد

منکرِ معراج یہودی کا مشہور واقعہ بھی بیان کیا ہے۔

دکنیات کے سلسلہ میں باقر آگاہ اور لچھمی نرائن شفیق کے معراج نامے بھی قابل ذکر ہیں مگر ان سے مثنوی روایت آگے نہیں بڑھی ہے۔ رشید حسن خاں صاحب کے خیال میں امام بخش ناسخ کا غیر مطبوعہ "معراج نامہ" اس وقت ترتیب دیا گیا تھا جب وہ سنی المذہب تھے، بعد میں اثنا عشری مذہب قبول کر لینے کی وجہ سے انھوں نے اس کی اشاعت پسند نہیں کی (رسالہ اردو کراچی جولائی ۱۹۶۲ء)

منیر شکوہ آبادی (م ۱۸۸۱ء) کی مثنوی "معراج المضامین" میں بھی واقعۂ معراج کا بیان ہے لیکن ان کے یہاں اختصار بہت ہے۔

اردو کی نعتیہ شاعری میں محسن کاکوروی کا نام بہت ممتاز ہے۔ قدیم موضوعات کو انھوں نے نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی عقیدت سے معمور شاعری میں شریعت اپنے عروج پر قایم رہتی ہے بلکہ روحانیت کی پاکیزہ روشنی سے وہ اور زیادہ منور ہو جاتی ہے۔ "چراغ کعبہ" محسن کا نعتیہ قصیدہ ہے جو بلحاظ موضوع واقعۂ معراج کا ترجمان ہے۔ شاعر نے تشبیب، گریز اور پھر معراج کے واقعات میں مدح کا پہلو نکالا ہے۔ "آغاز روایت" کے عنوان سے تشبیب شروع ہوتی ہے۔

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلئ گل اندام — شبنم کی ردا بقصد احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

معراج چونکہ رات میں ہوئی تھی، اسی لیے شاعر نے وقت کی مناسبت سے تشبیب کے اشعار لکھے ہیں۔ احرام کی مناسبت سے شبنمی ردا، رات کی مناسبت سے

لیلیٰ کی صفت تجسیم وغیرہ مناسبتِ لفظی کا عمدہ نمونہ ہیں۔ گریز کے بعد اصل واقعہ شروع ہوتا ہے۔ اسی درمیان محسن جبرئیلؑ اور براق کی مدح سرائی کرتے ہیں۔ بیت المعمور پہنچنے کے بعد جبرئیلؑ بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت دگرگوں ہو جاتی ہے۔ احادیث میں تفصیل سے اس کا ذکر ہے۔ محسن نے بھی بڑے ہی دلآویز انداز میں آپؐ کی اس وقت کی نفسانی کیفیت کو بیان کیا ہے۔ قصیدہ کا خاتمہ روایتی انداز میں دعائیہ کلمات کے بجائے مناجاتی انداز میں ہوا ہے۔

دورِ جدید کے شعراء میں سیماب اکبرآبادی نے واقعۂ معراج کے ذریعہ بنی نوع انسان کو اخلاقی درس دیا ہے اور انھیں جھنجوڑا ہے کہ "ایک وقت وہ تھا کہ انسان کی پرواز بامِ ثریا سے بلند ہو کر عرشِ معلیٰ تک تھی مگر اب اس پر ذلت و نکبت کی نحوست منڈلا رہی ہے۔"[۵۱]

اقبال احمد سہیل اعظمی کا معراج نامہ احادیث و نصوص کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔ اس میں صحیح واقعات بڑے دلکش اور دلنشیں انداز میں نظم کیے گئے ہیں۔ سہیل کے یہاں عقیدت کے ساتھ ہی معنوی و ادبی محاسن بھی پوری طرح موجود ہیں ان کے عقیدت پر مبنی جذبات و کیفیات اور احوال و خیالات حسن و لطافت سے اس طرح آراستہ ہیں کہ ان کی ساری نعتیں نگارخانۂ شعر و ادب معلوم ہوتی ہیں۔ صحیح واقعات کی ترجمانی، پاکیزگی اور ان میں تسلسل ذوقِ سلیم کو گرما دیتے ہیں۔

دوسری زبانوں کے مقابلہ میں اردو معراج ناموں کی بدولت سیر سماوی پر مشتمل جو ادب پارے وجود میں آئے وہ نہ افسانوی رنگ میں ہیں اور نہ صرف

تخیل کی پرواز کا نتیجہ ان میں تاریخی شواہد کے باوجود عقیدت کی فراوانی بھی ہے۔

"ڈیوائن کامیڈی" اور "اوڈیسی" جیسی بین الاقوامی شہرت کی حامل علوی سفر پر مشتمل ادب پاروں کے مقابلے میں اردو ادب کے صرف "معراج نامے" ہی رکھے جاسکتے ہیں جو اس اعتبار سے ان سے بڑھ کر ہیں کہ ان میں عقیدت کیساتھ ہی تاریخی حقیقت بھی ہے جبکہ اول الذکر میں حقیقت و عقیدت دونوں کا فقدان ہے۔

وفات نامے نعتیہ شاعری میں جہاں شعراء نے اوصاف محمدیؐ کے بیان میں اپنے تخیلات کی پرواز کو بلند سے بلند تر کرنے کی سعی کی ہے۔ وہاں آپؐ کے حالاتِ زندگی کو بھی موضوعِ شاعری بنایا ہے اور واقعۂ ولادت، بعثت، معراج اور وفات کو قلمبند کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات مسلمانوں کے لیے عظیم سانحہ تھی۔ چنانچہ اس موقع پر جذبات کا بے قابو ہو جانا ناگزیر تھا، جس کی وجہ سے چند تاریخی واقعات وجود میں آگئے، جو آپؐ کی وفات کے واقعہ کے ساتھ اس طرح منسلک ہو گئے، جنھیں الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ان مشہور واقعات میں سے ایک واقعہ کا تعلق حضرت عمرؓ کی ذات سے ہے۔ انھوں نے وفورِ غم میں نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا انکار کر دیا تھا بلکہ تلوار نیام سے نکال کر صاف کہدیا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا لفظ زبان پر لانے والے کا سر قلم کر دوں گا۔ اس کی تفصیل کتب سیر و تاریخ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

سورۃ المائدہ کی آیت "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ" (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے) کے متعلق مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر نازل

ہوئی تھی۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت کریمہ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا اعلان تھی۔ شعراء نے اسی کو بنیاد بنا کر آپؐ کی وفات کا حال نظم کیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ وصال کو منظوم کرنے کی روایت اردو شاعری میں پرانی ہے۔ شمالی ہند کے شاعر شیخ محبوب عالم ساکن جھجر کے "دردنامہ" میں آپؐ کی سیرت کے ساتھ ہی آپ کی وفات کا تفصیلی بیان منظوم کیا گیا ہے۔

ایک غیر معروف شاعر عبداللطیف کے "وفات نامہ" کا ذکر جمیل جالبی نے اپنی کتاب تاریخ ادب اردو میں کیا ہے۔ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سُن کر شدت غم میں نڈھال ہوئے، صحابۂ کرامؓ کے جذبات کی عکاسی شاعر نے نہایت موثر انداز میں کی ہے۔

"وفات نامۂ رسولؐ" گجرات کے شاعر پیرو عالم نے نظم کیا ہے۔ مگر ان کے یہاں اس دور کی تصانیف کے مقابلے میں ادبیت کا فقدان ہے، ان کے بعد گجرات میں وفات ناموں کی روایت کو امین گجراتی نے آگے بڑھایا ہے۔ ان کی تصنیف "تولد نامہ" تین حصوں پر مشتمل ہے۔ میلاد نامہ، معراج نامہ اور وفات نامہ۔ امین نے سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت کو بنیاد بنا کر وفات نامہ ترتیب دیا ہے۔

دکن کے ایک غیر معروف شاعر دریا کے "وفات نامہ" میں بھی یہی روایت منظوم کی گئی ہے۔

"وفات نامہ سرور کائنات" کے عنوان سے لکھی ہوئی امامی کی مثنوی ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد میں موجود ہے۔ شاعر نے وصالِ رسولؐ کو بڑے غم ناک انداز میں منظوم کیا ہے۔

ولی ویلوری کی تصنیف وفات نامہ نبیؐ میں حضرت عمرؓ کے وفور غم میں بے قابو ہو جانے کے واقعہ کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر نے عقیدت سے مملو شاعری میں بھی شعری محاسن کا قابل لحاظ حد تک پاس رکھا ہے۔ تشبیہات، استعارات کے علاوہ تجنیس کا بھی برجستہ استعمال ولی کی اس مثنوی میں ہوا ہے، جس کی وجہ سے باوجود زبان کے قدیم ہونے کے اثر انگیزی میں فرق نہیں آتا۔

ولی ویلوری کے بعد محمد باقر آگاہ بیجاپوری کی "ہشت بہشت" کے چوتھے رسالے "جگ سوہن" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کا ذکر ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی نعت گو شعرا نے اس میدان میں جولانی دکھائی ہے اور گلشن عقیدت کو اپنی نعتیہ تصانیف کے گلوں سے سجایا ہے۔

اسرائیلیات اسرائیلیات سے مراد وہ روایات، اساطیر و موضوعات ہیں جن کا تعلق خالصتاً یہودی مذہب سے ہے اور وہ روایات بھی اسی ذیل میں آتی ہیں جو نعوذ باللہ آپ کو بدنام کرنے کے لیے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے جوڑ دی گئی تھیں اور علمائے کرام نے وقت گذرنے کے بعد بلا تحقیق انھیں اسلامی لٹریچر کا جزو بنا لیا تھا۔ یہاں ان تمام اسرائیلی روایات کا احاطہ ممکن نہیں، صرف چند پر اکتفا کیا جائے گا۔ تفصیل کے لیے سیرۃ النبیؐ جلد سوم ملاحظہ ہو۔ جس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ شعرا نے بھی تحقیق کے بغیر بعض اسرائیلی موضوعات سیرتِ رسولؐ سے جوڑ دیے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو اس کا بڑا قلق تھا۔ فرماتے ہیں :۔

"ملا معین الدین ہروی ..... جو فی الحقیقۃ انشا پردازی و حکایت طرازی و

افسانوں روایات ضعیفہ و موضوعہ و تاویلات رکیکہ، قرآن و سنت و عہد دور صحابہ صوفیات و روایات یہود میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ شاید بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ آج اردو زبان میں جس قدر مولود لکھے گئے ہیں اور رائج ہیں وہ سب کے سب بے واسطہ یا بالواسطہ اسی ملا معین ہروی کی کتابوں معارج النبوۃ، تفسیر سورہ یوسف موسوم بہ تفرہ کار، قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام موسوم بہ اعجاز موسوی وغیرہ سے ماخوذ ہیں۔

(الہلال ۲۲ فروری ۱۹۱۳ء مشمولہ معارف اعظم گڑھ نومبر ۱۹۸۷ء ص ۳۵۱)

رسالہ برہان دہلی کے سابق ایڈیٹر مولانا سعید اکبر آبادی مرحوم نے بھی لکھا تھا۔
"معراج سے متعلق احادیث صحیحہ میں بھی ضعف پایا جاتا ہے"۔

اردو شعراء نے جن اسرائیلی موضوعات کو نعتِ رسولؐ کا جزو بنایا ہے ان میں ایک مشہور قصہ جو بالعموم حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اردو کے ایک غیر معروف شاعر طالب اور ایک نامعلوم شاعر نے ایک واقعہ "معجزۂ باز و فاختہ" کے عنوان سے نقل کیا ہے کہ ایک بار دو پرندے باز اور فاختہ اڑتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ باز فاختہ کا پیچھا کر رہا تھا۔ فاختہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پناہ چاہی اور آپؐ نے بہ طیب خاطر فاختہ کو اپنی پناہ میں لے لیا اس پر باز نے کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے میری غذا ہے اور آپؐ نے اسے پناہ میں لے کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس کے بدلے تم جو چاہو میں دے دوں گا۔ باز نے اس پر کہا کہ مجھے آپؐ کے رخسار کا گوشت چاہیے۔ یہ سن کر سارے صحابہ ششدر رہ گئے اور سبھی نے اپنا

گوشت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدلے میں دینے کا اقرار کیا مگر باز نہیں مانا۔ بالآخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چھری رخسار کی طرف پھیری ہی تھی کہ باز اور فاختہ اپنی اصلی شکل میں آگئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اقدام سے روکا۔ باز حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے اور فاختہ عزرائیلؑ۔ دونوں نے بہ یک زبان کہا کہ اللہ نے آپؐ کے ایثار و قربانی کا امتحان لینے کے لیے ہمیں بھیجا تھا۔ بے شک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین پر آپؐ سے زیادہ ایثار والا کوئی نہیں۔

یہ قصہ ہو بہو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سیرت میں بھی کتب سیر میں ملتا ہے۔ غواصی نے اپنی مثنوی "طوطی نامہ" میں یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی سے منسوب کیا ہے۔ بدھ مذہب کی اساطیر میں راجہ شیبی سے بھی یہ قصہ منسوب ہے۔ راقم کے مضمون "ایک روایت تین مذاہب" مطبوعہ "دوربہ نامہ" ناگ پور میں اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ طالب کی مثنوی "معجزہ باز و فاختہ" مطبع کریمی بمبئی سے ۱۳۲۹ھ میں چھپ چکی ہے۔ ایک لامعلوم شاعر کی تصنیف "باز و فاختہ" کا ذکر زورؔ مرحوم نے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی وضاحتی فہرست کی جلد اول ص ۱۸۱ پر کیا ہے۔

دوسری اسرائیلی روایت بلاقی اور ضمیر کے معراج ناموں میں درج ہوئی ہے پچھلے صفحات میں منکر معراج یہودی کا جو قصہ گزرا ہے بلاقی اور ضمیرؔ کے معراج ناموں میں یہ فارسی سے داخل ہوا ہے۔ ایران میں مذہبی ادبیات اکثر غریب و ضعیف روایات کا مرقع ہیں۔ شعرا و ادبا غلوئے عقیدت میں اکثر ان روایات کو اپنے ادب عالیہ میں پیش کرتے چلے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے واقعات کو سیرت نبویؐ سے جوڑ دیا گیا ہے جن پر اسرائیلی اثرات نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کی

تفصیل کا موقع نہیں۔

عبدالعزیز خالد کی "فارقلیط"، "شیوۂ فرسودہ ابنائے زمن" کے بالمقابل "شوقِ تجدید سے صحرا کو گلستاں" کرنے کا پہلا قدم ہے۔ خالد نے اس عظیم انسانؐ کی مدح سرائی کے لیے مروجہ فرسودہ اسلوب سے ہٹ کر نعت کو نیا اسلوب دیا ہے، لیکن ان سے جہاں ایک طرف نعت کے نئے راستے کھلے ہیں وہاں اسلوب کی اساطیری اور اسرائیلی فضائیں اس "خلق عظیم" کے تقدس و عظمت کو داغدار کر دیتی ہیں۔

اسرائیلی روایات میں پیغمبرانِ اسرائیل پر جنسی لذت کوشی کا بہتان باندھا گیا ہے۔ خالد نے اس کی جسارت تو نہیں کی ہے لیکن وہ اسرائیلیات سے دامن نہیں بچا سکے ہیں۔ ان کا دوسرا مجموعۂ نعت "منحمنا" بھی اسی قبیل کا ہے۔ اس میں شاعر نے صحف قدیم بالخصوص تلمود، زبور و غیرہ عہد نامۂ عتیق کی بے شمار تلمیحات اور مثالیں پیش کی ہیں اور ان ہی کے بارے میں نعت رسولؐ کا چاند سنوارنے کی سعی کی ہے۔

عمیق حنفی کی "صلصلۃ الجرس" نام کے اعتبار سے تو حدیثِ حسن صحیح کا ٹکڑا ہے۔ لیکن اس میں بھی بعض اسرائیلی روایات در آئی ہیں۔ یہی حال "ہفت کشور" کے شاعر جعفر طاہر کا بھی ہے۔ غرضکہ ہمارے نعت گو شعرا نے عقیدت کے اندھے پن میں اسرائیلی روایات کے سم قاتل کو بلا سوچے سمجھے نعت کے شہد شیریں میں ملا دیا ہے۔

ہندیات | ہندوستان میں مسلمان اگرچہ فاتح قوم بن کر آئے تھے، لیکن یہاں کے تہذیب و تمدن نے انہیں مفتوح بنا ڈالا۔ چنانچہ دو قوموں کے ارتباط سے

سبحہ و زنار کے رشتے مضبوط ہوتے گئے۔ اذان و ناقوس کی دل خوش کن آوازیں فضاؤں کو مسحور کرنے لگیں اور عود و کافور کی مہک ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ چراغِ دیر اور شمعِ حرم میں تجلی وحدت کے خواہاں رام رحیم کے فرق کو مٹانے کے لیے "اوم" و "الا اللہ" کے ذکر سے رطب اللسان رہنے لگے۔ اس طرح دونوں قوموں کا اتحاد دونوں کے عقائد پر اس حد تک اثر انداز ہوتا رہا کہ "محمد رسول اللہ" یعنی کلمہ طیبہ کے جزو دوم کو جزو اول یعنی "لا الٰہ الا اللہ" میں جذب کرنے کی فکر کی گئی جیسا کہ ہندو مذہب میں پیغمبروں کے متعلق یہ تصور عام ہے کہ وہ انسانی شکل میں ہم ریشہ ہیں۔

ہمارے نعت گو شعراء نے اس تصور کو بڑی حد تک قبول کیا ہے اور اسی کے مطابق عقائد اسلامیہ کو بالائے طاق رکھ کر نعت نبیؐ کو جزو ایمان سمجھ لیا ہے۔ افسوس کہ علماء و فضلاء بھی اس بدعت قبیحہ کے مرتکب ہوئے ہیں۔ چنانچہ محسن کاکوروی رب اور مربوب کا فرق "عرب" کا عین ہٹا کر دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اسی طرح احد و احمد میں حرف "میم" کا وجود انھیں کھٹکتا ہے۔ دیکھئے انھوں نے کتنی جسارت اور دلیری دکھائی ہے ؎

عینیت غیر رب کو رب سے — غیریت عین کو عرب سے
ذاتِ احمدؐ تھی یا خدا تھا — سایہ کیا میم تک جدا تھا[۱]

دیوتاؤں اور اوتاروں کے مضامین میں "اکثر جامۂ بشری میں خدا" کا تصور پایا جاتا ہے، جیسا کہ 'رام' اور 'کرشن' کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ وہ شکل انسانی میں معبود تھے۔ اب ایک نعت گو توحید کے متوالے شاعر کی جرأت رندانہ نہیں بلکہ

مشرکانہ ملاحظہ ہو جسکے شعر کے لفظ لفظ نے وحدانیت کو پارہ پارہ کر دیا ہے ؎

وہی جو مستویٔ عرش ہے خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفےٰ ہو کر

اس سے بھی بڑھ کر قادرِ مطلق سے روگردانی اور اس کی شان ارفع و اعلیٰ میں گستاخی کی مثال بھی ملاحظہ ہو کہ لکھتے وقت بھی خوفِ خدا سے قلم لرز جائے۔

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے جو کچھ مجھے لینا ہے لے لونگا محمدؐ سے

استغفر اللہ!! اوتاروں کی شان میں لکھے گئے بھجن بھی اس کفریہ کلام کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ عبد و معبود اور رب و مربوب میں فرق مراتب کا لحاظ نہ رکھ کر لکھی گئی نعتیں یقیناً ایمان سوز ہیں۔ ثنائے محمدیؐ کو "حمد" کی شکل میں پیش کرنے کا فن کس قدر مذموم اور ناروا ہے لیکن اردو کی نعتیہ شاعری کی بڑی مقدار میں یہی اصنامی تصور چھایا ہوا ہے۔ یہی نہیں اردو شعراء نے نعت جیسی مقدس صنف میں نسائی انداز اپنا کر انتہائی درجہ کے سفلہ پن کا ثبوت دیا ہے چنانچہ شائق عشق نبیؐ میں فراق کی کیفیت کو نسائی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں ؎

طیبہ کے رنگیلے بانکے میاں موہے چاند سا مکھڑا دکھا جانا
میں برہا دیوانی تڑپت ہوں ذرا آجانا ذرا آجانا
دکھ درد کے مارے تڑپت ہوں مانت نہیں دل وقت تیک
اے کملی والے سائیں میرے روٹھے کو ذرا منوا جانا[۱۲]

اور مولانا عبد القدیر حسرت کے یہ حسرت بھرے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

بھولی بھالی میں ہوں ناری پیت گلے کا ہار
موری نیا منجدھار

تیرے دوارے آن پڑی ہوں چھوڑ کے سب گھر بار

مودی نیا منجدھار

کالی کملی والے بھیا آؤ اب سرکار

مودی نیا منجدھار[12]

صوفیانہ رنگ ڈھنگ میں حضرت امجد بھی مدینہ کی جوگن بن کر نکل کھڑے ہوئے۔

نکلی ہے گھر سے جوگن کفنی گلے میں ڈالے | پاؤں میں پڑ گئے ہیں اب چلتے چلتے چھالے
گمنے کو ہوں زمیں پر ہو کون جو سنبھالے | یثرب نگر کے راجہ وہ کالی کملی والے

کرپا کی ایک نظر ہو دکھیا پہ اپنی پیارے

بھولی نہیں میں تم کو تم کیوں مجھے بسارے[13]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو یثرب کہنے سے منع فرمایا ہے۔ پھر بھی امجد مدینہ طیبہ کو بحر و قوافی نبھانے کے لیے یثرب کہہ رہے ہیں۔

اس قسم کی روایت کو حفیظ جالندھری اور خالد (عبد العزیز) نے آگے بڑھایا ہے۔ خالد کی ایک نعتیہ قصیدے کی تشبیب "نشر نگار دس" کا مرقع نظر آتی ہے۔

کٹتیں تارے گن گن برہن کی راتیں | پلنگ اس کا ناگن سا لہرا رہا ہے
بچھاؤں تری سیج چن چن کے کلیاں | تو صاحب ہے میرا تو میرا اللہ ہے
پیا کی اٹاری چڑھوں گی میں چھم چھم | انوراگ نے مجھ کو بے کل کیا ہے[14]

نعت گوئی کے یہ چند موضوعات تھے، ان پر قصر نعت تعمیر کر کے اردو کے نعت گو شعرا یہ سمجھ رہے ہیں گویا انھوں نے جنت میں اپنے گھر تعمیر کرا لیے ہیں۔ جو کچھ بعید بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی سرشارانہ عقیدت رسول سے خوش ہو جائے اور یہی نعتیں ان کے لیے صدائی بخشش بن جائیں۔

مراجع

ل؎ بحوالہ "محسن انسانیت" دہلی ۱۹۶۵ء ص ۷۰ ۲؎ بحوالہ عربی میں نعتیہ کلام ص ۲۲ ۳؎ فخر الدین نظامی : (مرتبہ جمیل جالبی) کدم راؤ پدم راؤ دہلی ۱۹۷۹ء ص ۷۷ ۴؎ میراں جی شمس العشاق : "شہادت التحقیق" بحوالہ مغوب مرغوب (مرتبہ محمد ہاشم علی) ص ۳۴ ۵؎ محمد رفیع قاسمی : عقیدۃ الیقین (قلمی) ادارہ ادبیات ورق ۲ ب ۶؎ غوثی بیجاپوری : قصص الانبیاء (قلمی) ادارہ ادبیات ورق ۴ ب ۷؎ باقر آگاہ "ہشت بہشت" (من دیپک قلمی) ادارۂ ادبیات ورق ۲۴ الف ۸؎ (۲۹) محمد محسن کاکوروی : کلیات محسن" ص ۶۴-۶۵ ....

۱۰؎ محسن کاکوروی : کلیات محسن ص ۱۸۰ ۱۱؎ ڈاکٹر زرینہ ثانی : سیماب کی نظمیہ شاعری ، بمبئی ۱۹۷۸ء ص ۱۰۷ ۱۲؎ محسن کاکوروی : کلیات محسن ص ۲۲۳ ۱۳؎ میر اعظم علی خاں شائق : کلیات شائق حیدرآباد ۳۰۳ ۱۴؎ مولانا عبدالقدیر حسرت : زفرات الاشواق ۱۳۵۳ھ ص ۲۰-۱۹ ۱۵؎ امجد حیدرآبادی : ریاض امجد حیدرآباد حصہ اول ص ۱۲ ۱۶؎ عبدالعزیز خالد : "فارقلیط" لاہور ص ۱۰۲۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

نام مقام اشاعت	:	دار المصنفین اعظم گڈھ	پتہ	:	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	:	ماہانہ	نام پبلشر	:	" " "
نام پرنٹر	:	عتیق احمد	اڈیٹر	:	ضیاء الدین اصلاحی
قومیت	:	ہندوستانی	قومیت	:	ہندوستانی

نام و پتہ مالک رسالہ دار المصنفین اعظم گڈھ

میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں عتیق احمد۔

تصحیح و توضیح

از ڈاکٹر نورالسعید اختر

معارف بابت جولائی ۱۹۹۱ء میں فتح نامہ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر کے عنوان سے راقم کا جو مضمون شایع ہوا تھا اس پر نومبر ۱۹۹۱ء کے معارف میں محترمہ شاکرہ صاحبہ کے کچھ معروضات شایع ہوئے ہیں، ان میں میری فروگزاشتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بعض امور کی مزید توضیح و تنقیح کی استدعا کی گئی ہے، میں موصوفہ کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے محققانہ انداز میں استفسارات کرکے چند اہم نکات کی طرف مضمون نگار کی توجہ مبذول کرائی ہے، دراصل تحقیق حرف آخر نہیں ہوتی۔ اس میں سہو و تسامح کی بڑی گنجایش ہوتی ہے، متضاد تاریخی بیانات سے محقق صحیح نتائج اخذ نہیں کر پاتا ہے، البتہ اس کا فرض ہے کہ وہ چھان بین کے بعد ان کوتاہیوں کی تصحیح میں دریغ نہ کرے جن کی نشاندہی عقابی نظر قارئین کریں۔ ذیل میں شاکرہ صاحبہ کے معروضات کے سلسلے میں اپنی گزارشات پیش کرتا ہوں۔

۱- [۲۰۰۲] برہان مآثر (سید علی طباطبائی ۱۹۳۶ء) کے صفحہ ۱۲۶ میں ہے کہ محمود شاہ بہمنی کی عمر صرف ۳۷ سال ۲ ماہ تھی۔ فرشتہ نے جلد اول صفحہ ۳۴۰ میں لکھا ہے کہ اس نے ۲۵ سال ۲ دن حکومت کی۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ محمد سوم کا انتقال ٹھیک ۵ صفر ۸۸۷ھ کو ہوا اور اس وقت سے

۱۲ ذی الحجہ ۹۲۴ھ تک حساب لگانے سے ۶۳ سال، ۱۰ ماہ اور ۲۰ دن ہوتے ہیں۔
۱۴ ذی الحجہ ۹۲۴ھ (۲۰ دسمبر ۱۵۱۸ء) کے برابر ہے۔ (ملاحظہ ہو سیویل اینڈ
ایگر صفحہ ۲۴۲۔ سیویل نے اپنی کتاب 'اے فارگاٹن ایمپائر' کے صفحہ ۱۱۳ میں جو تاریخ
۸ دسمبر ۱۵۱۸ء محمود کے انتقال کی لکھی ہے، وہ قطعی غلط ہے (بحوالہ: دکن کے بہمنی
سلاطین: ۔ صفحہ ۳۰۲ ہارون خاں شروانی: اردو ترجمہ: رحیم علی الہاشمی) (مندرجہ
بالا اقتباس میں بھی (محمد سوم) اور (محمود) کا تسامح موجود ہے۔ ملاحظہ فرمائیں
خط کشیدہ الفاظ) مضمون نگار۔

ممکن ہے شہاب الدین محمود شاہ بہمنی کی تاریخ وفات: استاد محترم ڈاکٹر
نذیر احمد کے نزدیک ۹۲۴ھ مطابق ۱۵۱۸ء زیادہ صحیح ہو۔

۲۔ غالباً فرشتہ ہی کے بیان کی وجہ سے راقم سے یہ سہو ہوا ہے۔ حالانکہ
شاکرہ صاحبہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ فٹ نوٹ میں حافظ شیرازی کے دکن کے
سفر کی بابت صحیح حوالہ موجود ہے۔

۳۔ فرشتہ اور سیرہان آثر کے مصنف نے ہمایوں شاہ (۱۴۵۸ء/۱۴۶۱ء) کے کردار
کا جو خاکہ کھینچا ہے اس میں سنگین ترین جرائم اس سے منسوب کیے ہیں۔ صفحہ ۱۲۵ ہارون
خاں شروانی نے محمود گاواں کے خطوط "ریاض الانشاء" کے پیش نظر اس کے کردار
سے متعلق ایک علاحدہ نظریہ قائم کیا ہے۔ انھوں نے اس امر کا بھی اعتراف کیا ہے کہ
"صرف ۸۶۴ھ حسن خاں کے دوبارہ اعلان شاہی کے بعد اس وقت بیٹر میں (جو شاہ
حبیب اللہ کی جاگیر تھی) اور تقریباً ۸۶۴ھ (۱۴۶۰ء) کے وسط میں اس کی
گرفتاری کے بعد ہی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی ظالمانہ فطرت کا مظاہرہ کیا۔۔

ہمایوں حالات کو اس رنگ پر جاتے نہیں دیکھ سکتا تھا اور اپنی مختصر حکومت کے آخری تیرہ مہینوں میں اس نے اپنے دشمنوں کو عبرت انگیز سزائیں دیں۔ صـ۲۴ شاعر وقت کا نباض ہوتا ہے وہ حقائق کے اظہار و بیان میں پس و پیش نہیں کرتا۔ ہمایوں شاہ نے جس ظالمانہ فطرت کا اظہار کیا تھا۔ اس کی صدائے بازگشت نظیری شاعر کے قطعہ میں بھی ہے ؎

ہمایوں شاہ مُرد و رُست عالم	تعالی اللہ زہے مرگ ہمایوں
جہاں پُر ذوق شد، تاریخ فوتش	ہم از ذوق جہاں آمد بیروں ۸۶۵ھ (صـ۳۴۰)

(برہان صـ۹۵ / فرشتہ صـ۳۴۲)

ایسی صورت میں شیروانی صاحب کے نظریہ سے ہر شخص کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

۴۔ محترمہ شاکرہ صاحبہ کا یہ اعتراض صحیح ہے کہ (معارف۔ جولائی ۱۹۶۹ صـ۲۹) کے درمیانی اقتباس میں محمود شاہ سوم (۸۸۷ھ تا ۸۷۰ھ) کی بجائے محمد شاہ ثالث ہونا چاہیے۔

۵۔ شہاب الدین احمد اول ۱۴۲۲ء تا ۱۴۳۶ء شاہ نعمت اللہ کرمانی کے علم و فضل اور تقویٰ کا از حد معترف تھا۔ اس نے شاہ صاحب کو بیدر آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ شاہ صاحب نے اس کے اصرار پر سب سے پہلے اپنے پوتے شاہ نور اللہ (صفحہ ۱۸۱) کو ہندوستان بھیجا۔ بادشاہ نے انھیں اپنی لڑکی عقد میں دے کر شاہی خاندان میں شامل کر لیا۔ ۲۲ رجب ۸۳۴ھ (۵ مئی ۱۴۳۱ء) کو شاہ نعمت اللہ کرمانی کے انتقال کے بعد ان کا سارا خاندان یعنی شاہ حبیب اللہ عرف غازی (جاگیردار بہیر (مہاراشٹر) متوفی ۸۶۴ھ ۶۰-۱۴۵۹ء) بیدر منتقل

ہوگئے، ان کو بادشاہ نے اپنا داماد بنالیا اور شاہ محب اللہ کے ساتھ ولی عہد علاء الدین ہمنی کی لڑکی کی شادی کردی گئی (ص ۱۳۱)

شاہ خلیل اللہ، شاہ نعمت اللہ کرمانی کی واحد نرینہ اولاد تھے لہذا شاہ محب اللہ کو ان کا فرزند ہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ ہارون خاں شروانی ایک جگہ (ص ۱۳۱) رقمطراز ہیں کہ "شاہ نعمت اللہ کرمانی کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے شاہ خلیل اللہ اپنے سارے خاندان کے ساتھ ہجرت کرکے دکھن آگئے اور ان کے لڑکوں کی شاہی خاندان میں شادیاں کیں" (ص ۱۳۱) دراصل معارف جولائی ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۳ پر مضمون نگار کا جملہ یوں ہونا چاہیے" عیانی، شاہ خلیل اللہ عرف غازی" بت شکن" فرزند شاہ نعمت اللہ ولی سید نورالدین کے صاحبزادے شاہ خلیل اللہ اور شاہ محب اللہ سے خاص عقیدت رکھتے تھے" راقم کو سہو قلم کا اعتراف ہے۔

۶۔ ہارون خاں شروانی ایک جید عالم اور فاضل مورخ ہیں۔ انکی معرکۃ الآرا کتاب "دکن کے بہمنی سلاطین" ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ تاہم اس کے بعد بھی کئی باتیں ایسی ہیں جن پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے اور ان میں مورخین کے متضاد بیانات نے الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ آذری کا بہمن نامہ جسے (ساحتی ونڈیری) نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا یا جس کا پردۂ خفا میں ہے۔ عیانی کا فتح نامہ کی طرح دیگر کئی مخطوطات محققین کے منتظر ہیں۔ ان کارناموں کے پس منظر میں بہمنیوں کی تاریخ پر نئے زاویوں سے از سر نو روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔

۷۔ محترمہ شاکرہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ بہمن نامہ کے شاعر کا تخلص ساحتی ہے راقم نے ایک خط کے ذریعہ ایڈیٹر معارف کو اس کی تصحیح کے لیے درخواست کی تھی ممکن ہے اس خط کے پہونچنے سے قبل مضمون کی کتابت عمل میں آگئی ہو۔ ہارون خاں

شروانی صاحب کی کتاب دکن کے بہمنی سلاطین میں اسی شاعر کا نام سیتی بھی تحریر ہوا ہے۔

"محمود گاواں کی شہادت پر متعدد قطعات تاریخ کہے گئے ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور سیتی کا یہ مصرعہ ہے کہ "بے گنہ محمود گاواں شد شہید" ص۲۵۲

اسی کتاب کی تشریحات نمبر ۱۲۷ صفحہ نمبر ۲۷۳ پر رقمطراز ہیں" فرشتہ نے جلد اول صفحہ نمبر ۳۸۵ میں لکھا ہے کہ یہ قطعہ تاریخ سیتی کا تھا مگر برہان مآثر (کے مصنف) نے اسے فاضلی کی تصنیف بتایا ہے۔

علی بن طیفور بسطامی (مصنف حدائق السلاطین) نے اس شاعر کا تخلص سامی تحریر کیا ہے جو زیادہ صحیح ہے [صفحہ نمبر ۲۳۳ - حدائق السلاطین] بحوالہ - اے، کریٹیکل اسٹڈی آف انڈو پرشین لٹریچر از سیدہ بلقیس فاطمہ حسینی ص۵۳ "مولانا سامی کہ مداح و ندیم و صاحب (مصاحب) او بود"

۸۔ محترمہ شاکرہ صاحبہ کا اعتراض قابل قبول ہے۔ دراصل جولائی ۱۹۷۱ء کے معارف کے صفحہ نمبر ۳۵ کی اختتامیہ سطر میں" پانچویں بہمنی بادشاہ" کی بجائے چودہویں بہمنی بادشاہ (۱۴۸۲ء تا ۱۵۱۸ء) ہونا چاہیے ورنہ تاریخی بیانات بے سروپا ہو جائیں گے۔

۹۔ شہر ساگر کی پیش کردہ وجہ تسمیہ پر شاکرہ صاحبہ کا بیان درست ہے۔ راقم نے اس شہر کا نام "سگر اور صغر" بھی پڑھا ہے۔ "توضیح الحان" سے متعلق حوالہ یقیناً ہماری معلومات میں اضافہ ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں راقم نے اپنی استطاعت کے مطابق محترمہ شاکرہ صاحبہ کے معروضات کی وضاحت کر دی ہے اور مضمون کی لغزشوں کی تصحیح بھی کر لی ہے۔ انشاء اللہ عنقریب مستقبل میں" فتح نامہ محمود شاہی" کا متن مع مقدمے کے شایع کر دیا جائے گا۔

استفسار وجواب

اورنگزیب کی ہندو بیویاں؟

مولوی زبیر احمد کریمی صاحب
مدرسہ احیاء العلوم
دبی والا، مبارکپور۔ یوپی۔

میں اورنگ زیب کو ایک دیندار، خداترس فرماں روا سمجھتا تھا لیکن اس کے بارہ میں اردو کی بعض کتابوں میں یہ پڑھ کر بڑے خلجان میں مبتلا ہو گیا ہوں کہ اس نے خود اور اس کے بیٹے نے ہندو عورتوں سے شادی کی تھی، اس کی تحقیق فرما کر میرا خلجان رفع کر دیں تو ممنون ہوں گا۔

معارف: اورنگ زیب عالمگیر کی بیویوں اور کنیزوں میں دلرس بانو بیگم، نواب بائی، اورنگ آبادی محل، اودے پوری محل، زین آبادی محل، دولت آبادی محل اور دل آرام کے نام ملتے ہیں، ان میں نواب بائی، اودے پوری محل اور زین آبادی محل کے راجپوت یا غیر مسلم ہونے کا ذکر بعض کتابوں میں بھی ہے، ذیل میں اختصار سے ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔

عام شہرت یہ ہے کہ رحمت النساء بیگم معروف بہ نواب بائی کشمیر کی ایک ریاست راجوری کے راجپوت راجہ راجو کی صاحبزادی تھیں۔ لیکن ایک روایت کے مطابق وہ سید عبدالقادر جیلانیؒ کے خاندان کے ایک شخص سید شاہ میر کی صاحبزادی تھیں، خافی خاں نے اس روایت کو محض افسانہ قرار دیا ہے (ص ۴-۶) اور جدو ناتھ سرکار نے اس کو اس لیے رد کر دیا ہے کہ ان کے خیال میں نواب بائی کے بیٹے بہادر شاہ

کی تحفظیت کے استحقاق کو روا ثابت کرنے کے لیے وضع کی گئی تھی، تاہم ان کو بھی نواب بائی کا مجہول الاصل ہونا تسلیم ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاہجہاں کے عہد تک کشمیر میں بعض جگہ ہندو اور مسلمانوں میں شادیاں کرنے کا رواج تھا اور شوہر کا مذہب ہی بیوی کا مذہب ہوتا تھا، اگر وہ ہندو شوہر کی زوجیت میں مرتی تو اسے نذر آتش کیا جاتا اور مسلمان شوہر کے عقد میں رہتے ہوئے اسکا انتقال ہوتا تو اسے دفن کیا جاتا، اوپر گزر چکا ہے کہ خود جدوناتھ سرکار بھی نواب بائی کے مسلمان اور سید خاندان سے منسوب ہونے کی روایت کو صحیح نہیں تسلیم کرتے، تاہم دونوں قوموں میں شادی بیاہ کے رواج کی وجہ سے وہ نواب بائی کے اورنگزیب کے حرم میں شامل کیے جانے کے امکان کی وکالت بھی کرتے ہیں (ہسٹری آف اورنگزیب جدوناتھ سرکار ج ۱ ص ۵۸ تا ۷۳) اس طرح نواب بائی کے راجپوت راجکماری ہونے کا دعویٰ متنازعہ فیہ ہے۔

اودی پوری یا اودے پوری محل جو شہزادہ کام بخش کی والدہ تھیں، ان کے متعلق کئی روایتیں ہیں، یورپین مورخ خاص طور پر منوچی اس کو جارجیائی نسل کی ایک عیسائی خاتون قرار دینے پر زیادہ مصر ہیں جو پہلے دارا شکوہ کے حرم میں تھی، اور اس کے مرنے کے بعد اورنگ زیب کی سب سے زیادہ چہیتی بیوی بنی، اورنگ زیب نے اپنے مرض الموت میں شہزادہ کام بخش کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ .... "اودے پوری والدۂ شما در بیماری با من بودہ ارادہ رفاقت دارد" اس ایک جملہ سے مورخ ٹاڈ نے اندازہ لگایا کہ چونکہ اس میں اورنگ زیب کے ساتھ مرنے کی خواہش ظاہر ہوتی ہے اس لیے اس کا راجپوت ہونا قرین قیاس ہے لیکن

یدوناتھ سرکار بھی اس دور از کار قیاس کو درست نہیں سمجھتے، شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ دہلوی نے بڑا دلچسپ تبصرہ کیا ہے کہ "... لفظ اودے پوری نے بڑے تماشے دکھائے کوئی تو یہ کہتا ہے کہ اودے پور کے خاندان میں سے کوئی لڑکی اسکے نکاح میں آئی تھی، کوئی کہتا ہے کہ اودے پوری کی جگہ جودھ پوری ہے، سب سے زیادہ لطیفہ یہ ہے جو فرنگستانی تاریخوں میں لکھا جاتا ہے کہ اودے پوری ایک عیسائی عورت کا نام تھا جو جارجیا کی رہنے والی تھی، دارا شکوہ نے اسے ایک بردہ فروش سے خریدا تھا، یہی مخفی سبب تھا کہ دارا نے عیسائی مذہب اختیار کیا تھا، جب دارا مرگیا تو بادشاہ نے اپنے بڑے بھائی کی دو بیویوں سے شادی کرنی چاہی، ان میں ایک راجپوتنی تھی وہ زہر کھانے کو موجود ہو گئی مگر عالمگیر سے نکاح نہ کیا مگر اس کرسچن لیڈی نے اس سے نکاح کر لیا، فرنگستانی تاریخوں میں بہت سی ایسی دل لگی کی کہانیاں ہیں (بادشاہ نامہ عالمگیری، تاریخ ہندوستان جلد ہشتم ص، ۴۶) مختصر یہ کہ اودے پوری بیوی کا بھی راجپوت ہونا امر متفق علیہ نہیں۔

زین آبادی محل کے متعلق دل لگی کی روایتیں مآثر الامراء میں بھی ہیں اور اسکے متعلق معلومات کے دو اہم ذرائع میں مآثر کے علاوہ احکام عالمگیری بھی ہے، ان دونوں کے بیان کے مطابق "یہ پہلی نظر میں محبت" کا معاملہ تھا (مقدمہ رقعات عالمگیر ص ۱۵۵) مگر مآثر الامراء نے عوامی کہانیوں کو بنیاد بنا کر جو حاشیہ آرائیاں کی ہیں اورنگزیب نے خود شاہجہاں کے نام ایک خط میں ان کے متعلق صفائی پیش کر دی ہے کہ "عیوب بندہ سراسر تقصیر زیادہ ازاں است کہ تواں شمرد .... با حدے بمقام بدی و بداندیشی نیست، مقدمہ کہ دریں دلا بمسامع رسید محض خلاف است

دو رقعات ص ۴۹ خط ۶۴) زین آبادی کا نام ہیرا بائی بھی آتا ہے اس لیے اس کے غیر مسلم ہونے کا شک کیا گیا مگر کسی مورخ نے بالیقین اس کے مذہب کی تعیین نہیں کی یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بیگم کے علاوہ بائی اور محل جیسے الفاظ کو جادو ناتھ سرکار نے بھی محض ثانوی حیثیت کے مظاہر سے تعبیر کیا ہے، ان الفاظ کے امتیاز و اختلاف کی وجہ علاقائی اور لسانی فرق بھی ہو سکتا ہے۔ اورنگ آبادی محل کے مذہب کے متعلق مغربی اور جدید ہندوستانی مورخ خاموش ہیں۔

اس مختصر جائزہ سے معلوم ہوا کہ صرف نواب بائی رحمت النساء بیگم کا راجپوت ہونا قرین قیاس ہے مگر رحمت النساء بیگم نام خود ان کے مذہب کی خبر دیتا ہے۔ یہاں جادو ناتھ سرکار کا یہ قول بھی قابل ذکر ہے کہ "ہندو راجکماریاں مسلمان بادشاہوں سے شادی کرنے کے بعد اپنی ذات اور مذہب سے دستبردار ہو جاتی تھیں، مرنے کے بعد انہیں اسلامی طریقہ سے دفنایا جاتا تھا... مغل حکمرانوں کی کسی راجپوت ملکہ کے متعلق یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ بادشاہ کے مرنے کے بعد اس نے ستی ہونے کی کوشش کی۔" (ہسٹری آف اورنگ زیب ج ۱ ص ۵۰ تا ۶۳) مغل حکمرانوں کا معاملہ خواہ کچھ ہو مگر دارا شکوہ کے بیٹے سلیمان شکوہ کی شادی راؤ امراؤ سنگھ کی بیٹی سے ہوئی تو "شہزادی ایک ماہ پہلے سے بلائی گئی، حرم میں غالباً اس لیے رکھا گیا کہ مغلیہ تہذیب کے آداب و رسوم سے آگاہ ہو جائے اس کے بعد اسے مسلمان کر لیا گیا اور تب شادی کی رسمیں کی گئیں (تاریخ شاہجہاں از ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ مترجم ڈاکٹر سید اعجاز حسین ص ۲۴۳) اورنگ زیب کے دو بیٹوں شاہزادہ معظم اور شاہزادہ محمد کام بخش کی شادیاں واجد روپ سنگھ کی بیٹی اور امر چند کی بیٹی کلیان کنور سے

بیویوں کے متعلق یہ تو نہیں لکھا گیا کہ ان لڑکیوں کو مسلمان کر لیا گیا ہاں مآثرِ عالمگیری کے بقول راجکماری نے اسلام قبول کر لیا اور محل میں تربیت پائی (مآثرِ عالمگیر محمد ساقی مستعد خاں ص ۳۰) امر چند کی بیٹی کلیان کنور عرف جمیلۃ النساء کا عقد ہوا تو قاضی نے مسجد میں نکاح پڑھایا اور پچاس ہزار روپیہ مہر مقرر ہوا (ایضاً ص ۲۱۱)

امید ہے آپ کے شبہ کا ازالہ ہو گیا ہوگا، اس کے علاوہ اورنگ زیب کی تمام بیویوں کے مذہب و کردار کے متعلق مآثرِ عالمگیری کی یہ عبارت خود نہایت واضح ہے، مستعد خاں لکھتے ہیں کہ "ہمگیں جملہ نشنیاں مشکوی عزت و سایر محتجبات استار عفت ببرکات ارشاد و ہدایت آنحضرت اکتساب عقاید حقہ و احکام ضروریہ دینیہ نمودہ، ہمہ بر سجادہ طاعت و حق پرستی و تلاوت و کتابت قرآن مجید و اذکار حسنات و مبرات اشتغال می ورزیدند" (ص ۵۳۲) آخر میں اس پوری بحث میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ "عالمگیر نے کسی ایک ہندو کو بھی زبردستی مسلمان نہیں کیا، مگر اس کے عہد کی تاثیر ایسی تھی کہ دار الخلافہ اور اطراف میں ہندو مسلمان ہوتے جاتے تھے (تاریخ ہندوستان بادشاہ نامہ عالمگیر ج ۸ ص ۴۰۰)

(عمیر الصدیق دریابادی)

اورنگ زیب عالمگیر پر دار المصنفین کی ایک اہم کتاب

مقدمہ رقعات عالمگیر اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے اسلامی فن انشاء اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ اور ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، بالخصوص خود عالمگیر کے انشاء اور اس کی تاریخ کے مآخذ، عالمگیر کی ولادت سے جلوس اورنگ تک کے تمام واقعات و حالات پر خود ان خطوط و رقعات کی روشنی میں تنقیدی بحث کی گئی ہے۔

قیمت :- ۶/۵۰ روپے

معارف کی ڈاک

(۱)

کرامت منزل۔ اکبری گیٹ۔
لکھنؤ　　مکرمی و محترمی! سلام مسنون

۱۵ فروری ۸۲ء

مزاج گرامی! جنوری کا شمارہ ابھی دیکھا، میں تقریباً دو مہینے سے سفر ہی میں رہا۔ اندرون ملک اور حجاز پاک۔ آپ نے شذرات میں جو کچھ لکھ دیا اس کی ضرورت تھی۔ ہمارے دینی مدارس Routinwork ہو کر رہ گئے، انکی نظر ماضی قریب کے چند بزرگوں سے آگے نہیں بڑھتی ہیں انہیں کے طرز عمل کو دہراتے رہتے ہیں۔

ہمارے لیے تو Ideal شخصیت حضورؐ کی ہے اور Ideal معاشرہ وہ اسلامی معاشرہ ہے جو حضورؐ نے مدینہ منورہ میں قائم کیا ہمیں تو صرف انھیں دو چیزوں کو اپنے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے وہاں سے ہمیں زندگی کے تمام شعبوں میں رہنمائی مل جاتی ہے مسئلہ آزادیٔ فکر اور جدید فکر کا نہیں صرف نبی پاکؐ کی فکر برحق کا ہے، کاش اس فکر کی تمام گہرائیوں میں جانے کی کوشش کی جاتی تو یہ تنگ دامنی نہ ہوتی۔

عرصہ سے چند بزرگوں کے قصے ان کے کشف و کرامات کو بہت نمایاں کیا جاتا ہے جیسے یہ بھی کوئی شریعت کی چیز ہے، اس وقت لوگوں کو عملی میدان میں عملی نمونہ اور رہنمائی کی ضرورت ہے، بزرگوں کے صرف واقعات بیان کرنے سے مسائل حل نہیں ہوں گے، نئی نسل کا رشتہ اپنی تاریخ سے بس واجبی ہے، اب جو دور شروع ہو رہا ہے اس میں تو بنیادی چیزوں کا بھی اسے علم نہیں، دینی مدارس میں نقل کی وبا جس طرح چل پڑی ہے اس نے حدیث و قرآن کا احترام

بھی ختم کر دیا ہے رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات پیش آرہے ہیں۔ بہرحال پوری دل سوزی کے ساتھ ان مسائل پر متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

آج میں لکھنؤ کے شیعہ ڈگری کالج کے سامنے سے گزرا طلبہ کی یونین کا الکشن ہے ~~سارے بینر اور پوسٹر~~ ہندی میں لگے ہوئے تھے ایک بھی کوئی چیز اردو میں نہیں تھی۔ لکھنؤ کے تمام مسلم اداروں میں انٹر میڈیٹ کالج ہوں یا ڈگری کالج، پرائمری ابتدائی درجات ایک سے پانچ تک میں ہندی میڈیم میں تعلیم ہو رہی ہے حکومت کی طرف سے کوئی پابندی نہیں لیکن خود انتظامیہ نے یہ کر رکھا ہے یہ حال کم و بیش تمام مسلم اداروں کا ہے اس کا الزام ہم حکومت کو کیسے دیں۔ تنہا دینی مدارس اور دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام ادارے جو چل رہے ہیں، وہاں اردو میڈیم میں تعلیم ہو رہی ہے کیا یہ المیہ نہیں ہے۔

نوائے ملت امید ہے کہ مل رہا ہوگا۔

والسلام

خیر طلب: اشتیاق

(۳)

اندرا نگر لکھنؤ
۹۲،۲،۲۵ء

برادر محترم! سلام مسنون

فروری ۱۹۹۲ء کے معارف میں آپ نے اردو کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ صداقت پر مبنی ہے، سرکاری اداروں میں یونیورسٹیوں کے اساتذہ کی اجارہ داری چل رہی ہے اور اسی محدود دنیا میں انعامات و اعزازات تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اگر عربی کے مدارس نہ ہوتے تو باد مخالف کی زد پر اردو کا چراغ ابھی تک روشن نہ رہتا۔ پی ایچ ڈی کے لیے الٹا سیدھا مقالہ لکھ کر پہلے ڈگری ملتی ہے۔ پھر نوکری اور پھر اسی مقالہ پر ہمارے سرکاری ادارے انعام بھی دیدیتے ہیں اسلیے کہ انکی تمام کار بھی مختلف یونیورسٹی کے صدور شعبۂ اردو

کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے، اس موضوع پر تفصیل سے لکھنے کے لیے آپ کے قلم کو مذاق اور بے باک کرے۔

خیر اندیش

ملک زادہ منظور احمد

(۳)

شعبۂ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

برادر مکرم جناب عمیر الصدیق صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف کے مشمولات میں "اخبار علمیہ" کا کالم بھی بہت مفید اور معلومات افزا ہے جو آپکی کاوش و دیدہ ریزی کا نتیجہ ہوتا ہے اس سے دنیا کے مختلف حصوں کی علمی و ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں مفید اور اہم باتیں معلوم ہوتی رہتی ہیں۔ دسمبر میں ہندوستانی مورخین کی معروف تنظیم "انڈین ہسٹری کانگریس" کا ذکر بہت برمحل ہے تنظیم کی تاریخ اور کارگزاری بیان کرتے ہوئے آپ نے اسکے بعض اہم ارکان کے نام بھی تحریر فرمائے ہیں، اسی ضمن میں معارف و دارالمصنفین کی نسبت سے مولانا سید سلیمان ندوی کا ذکر کرنا بہتر ہوتا، وہ اس تنظیم کے رکن نہیں تھے، مگر مدراس میں دسمبر ۱۹۴۴ء میں اسکا جو اجلاس ہوا تھا اسمیں ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کے سیکشن کی صدارت انھوں نے فرمائی تھی اور انکا دستاویزی خطبۂ صدارت بہت مقبول ہوا جو اپریل ۱۹۴۵ء کے معارف میں شایع ہوا تھا

"اخبار علمیہ" کی نسبت سے ریاض سعودی عرب سے شایع ہونیوالے "عالم الکتب" کا تعارف مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ اسلامک فاؤنڈیشن (لیسٹر برطانیہ) کے "مسلم ورلڈ بک ریویو" کے طرز پر مجلہ ہے جو جدید عربی مطبوعات کے بارے میں تبصروں اور کتابیات کی صورت میں مفید و ضروری معلومات پر مشتمل ہوتا ہے اسکے شمارہ (جنوری ۱۹۹۱ء) میں قرآنیات پر ان کتابوں کی ایک ببلوگرافی شایع ہوئی ہے جو سعودی عرب میں دس سال (۱۴۰۰-۱۴۰۹ھ) کے عرصہ میں نشر و اشاعت کے مرحلہ سے گزری ہیں، اسکا اردو ترجمہ انشاء اللہ سہ ماہی علوم القرآن علی گڑھ کے آیندہ شمارے میں شایع ہوگا۔

والسلام ظفر الاسلام

التقریظ والانتقاد

سرِ شاخِ طوبیٰ

مرتبہ جناب فضا ابن فیضی۔ متوسط تقطیع۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ۔ صفحات:

۲۲۴۔ مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ قیمت ۱۵ روپیے۔ پتہ: ادارۃ البحوث الاسلامیہ

جامعہ سلفیہ۔ ریوڑی تالاب۔ بنارس۔

جناب فضا ابن فیضی کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے۔ ان کو مختلف اصنافِ سخن پر ماہرانہ قدرت ہے۔ ان کی پرواز تخیل کسی ایک فضا تک محدود نہیں ہے۔ انھوں نے شاعری کی اکثر زمینوں میں گل بوٹے اگائے ہیں۔ وہ عربی و فارسی کے منتہی ہیں۔ اردو کی معیاری اور کلاسیکل شاعری پر ان کی نظر گہری ہے، لیکن ان کا انداز سخن اور طرزِ بیان روایتی شاعری سے علانیہ مختلف ہے۔ اس صدی میں شعر و ادب کی اصلاح و ترقی کے لیے جو تحریکیں اٹھیں وہ ان سے کنارہ کش رہے۔ اور انھوں نے شاعری کے میدان میں اپنی الگ اور علیحدہ راہ نکالی۔ ابتدا میں کسی قدر علامہ اقبالؔ کا اثر ان پر رہا، لیکن جلد ہی وہ ان کے آستانہ پر ناصیہ سائی چھوڑ کر اپنی فطرت کے جلوؤں کے تماشائی بن گئے، اور بہار لالۂ صحرا کی جانب نگاہ اٹھانے کے بجائے اپنے دل کی نیرنگیوں کو دیکھنے دکھانے میں مصروف ہو گئے۔

حسن بیان کی طرح رعنائی خیال بھی فضا صاحب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے رچے ہوئے ذوق نے کلام کے حسن و نفاست، اس کی آرایش و زیبایش اور اس کے طریقۂ اظہار کی شان و شوکت اور بانکپن پر جس قدر توجہ کی ہے اس سے زیادہ جذبات و

احساسات کی صداقت و دردمندی، افکار و خیالات کی لطافت و نظافت اور لب و لہجہ کی شائستگی و متانت کو مدنظر رکھا ہے۔ فضا صاحب کی غزلوں، نظموں اور رباعیات کے جو مجموعے پہلے چھپے ہیں ان میں بھی ان کا قلم رکاکت و ابتذال سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ اور یہ نیا مجموعہ تو اسم با مسمّیٰ ہے۔ جس کے موضوعات نہایت پاکیزہ و برتر ہیں اس کی ترتیب جس سلیقہ اور خوبصورتی سے کی گئی ہے وہ بھی فضا صاحب کے لطیف اور ستھرے ذوق کا ثبوت ہے۔

"سر شاخِ طوبیٰ" چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ "خوشۂ سبز" میں حمدیہ و دعائیہ نظمیں ہیں۔ دوسرا حصہ "قوسِ حرا" نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصہ "منظر و پس منظر" کے زیرِ عنوان نظمیں درج ہیں۔ چوتھے حصہ "گل نغمہ" میں بعض دینی مدارس کے ترانے اور ملی اداروں کے افتتاح کے موقع پر کہی گئی نظمیں شامل ہیں۔

کتاب کی ابتدا حمدیہ و دعائیہ شاعری سے کی گئی ہے۔ دراصل حمد و ثنائے خداوندی انسان کی فطرت میں داخل اور اس کے دل کی اصل آواز ہے۔ یہ پوری دنیا اور اس کی تمام چیزیں یہاں تک کہ خود انسان کا اپنا وجود بھی خدا کی رحمت و ربوبیت اور اس کی کاریگری اور کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے۔ جس کو دیکھ کر ہر سلیم الطبع شخص کے اندر جذبۂ شکر و امتنان کا موجزن ہونا اور کائنات خلقت میں پھیلی ہوئی خدا کی عطا و بخشش کے اعتراف میں تحمیدی و تمجیدی نغمے گانا فطری ہے۔ دعا و مناجات اور تضرع و گریہ و زاری بھی انسان کی رگ و ریشہ میں سرایت ہے۔ وہ جب خطرات و مشکلات میں گھر جاتا ہے تو بے اختیار خدا ہی کو پکارتا اور اس سے مشکل کشائی کی درخواست کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان کی شاعری میں خدا کی حمد و معرفت کے زمزمے اور دعا و مناجات کے ترانے موجود ہیں

اردو کے جو شعراء اپنی رندی و ہوسناکی کے لیے بدنام ہیں ان کا سرمایۂ فن بھی حمدیہ و دعائیہ اشعار سے خالی نہیں ہے۔

<u>حمدیہ شاعری</u> | فضاؔ صاحب کے نزدیک کائنات کا پتہ پتہ اور بوٹا بوٹا معرفتِ کردگار کا صد دفتر ہے۔ اس کا ہر ذرہ انھیں حمد باری کی دعوت اور اس کے شکر و سپاس کی تلقین کرتا ہے

تمجید ہیں اسی کی، مرے دل کی دھڑکنیں ۔۔۔ اوراقِ نفس پہ نقشِ صدا بھی اسی کا ہے

اک اعتراف ہے شانِ الوہیت کا تری ۔۔۔ مرے لبوں پہ جو حرفِ اذان روشن ہے

حمد میں اس کی میں کیا کیا لکھوں ۔۔۔ حرف تا حرف ہوں دفتر اس کا

اس مجموعہ کی حمدیہ نظمیں فضاؔ صاحب کے اسی احساس و تاثر کا نتیجہ ہیں جن میں گوناگوں پہلوؤں سے خدا کی حمد و ستائش، اس کی وحدت و یکتائی، قدرت و کارسازی، حکمت و کارگیری، ربوبیت و رحمت، خلق و ابداع، صناعی و کمال، تدبیر امر، احسان و انعام غرض کائنات خلقت میں پھیلی ہوئی اکثر نعمتوں کا ذکر ہے۔

فضاؔ صاحب صحیح العقیدہ اور صحیح الخیال مسلمان ہیں۔ اس لیے خدا کے تصور و عقیدہ کے بارے میں انھوں نے صحیح اسلامی تعلیمات و ہدایات کو شاعری کی خوبیوں کو برقرار رکھتے ہوئے بہت مؤثر اور شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ خداوند قدوس کی ہستی کا اقرار و اعتراف تو مشرکین عرب کو بھی تھا لیکن اسلام کا طرۂ امتیاز توحید ہے جس کے بارے میں ہمیشہ اقوام عالم کو گمراہی پیش آتی رہی ہے۔ وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللَّهِ إِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُونَ۔ (یوسف)

فضاؔ صاحب توحید کی عظمت و اہمیت اور اس کے اصلِ دین ہونے کی حقیقت سے بخوبی واقف ہیں۔ اور ان حقائق کو انھوں نے اچھی طرح واضح کیا ہے۔

دانش تمام نے دو عالم یہی اک نکتۂ خیر — حاصل کلمہ و آیات ہواللہ احد
اصل ایمان و یقیں ہے یہی توحید کا رمز — کالنجر نقش مری بات ہواللہ احد ص ۲۴۸
یہ ایک نکتہ سب سے اہم سب کا حاصل — من جملۂ نکات ہواللہ واحد
دامن ہے نہ شہرتِ توحید سے تہی — قرآن کی زکات ہواللہ واحد ص ۱۴۲

نکتۂ توحید کو فلسفیانہ قیل وقال اور منطقیانہ موشگافی نے بڑا پیچیدہ اور دشوار بنا دیا ہے۔ اس کی وجہ سے توحید کی سادہ اور روشن حقیقت توہمات و خرافات میں کھو گئی ہے اور مسلمان بھی معقولات و منقولات کے لایعنی دفتر میں الجھ کر توحید کا سر رشتہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ نفضا صاحب معقولات و منقولات کے ایسے دفتر کو بے معنی بتلاتے ہیں اور توحید کے بارے میں مسلمانوں کو خرافات و اوہام سے نکال کر حقیقت شناس بننے کی دعوت دیتے ہیں۔

اس کا عرفاں جو نہ بخشیں تو نفضا محض فریب — یہ درایات و روایات ہواللہ احد
بس یہی ایک حقیقت ہے کہ قائم دائم — اور سب خواب و خرافات ہواللہ احد
اس سے ہٹ کر جہت عقل و عقیدہ بھی غلط — واہمہ سارے رسومات ہواللہ احد

خدا تمام اچھے اوصاف و کمالات کا جامع اور ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔ وہ سب سے اعلا و برتر اور زمان و مکان سے ماورا ہے۔ ہر ہر چیز سے واقف اور ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ ہر جگہ حاضر و موجود اور ہر شخص کے قریب ہونے کے باوجود سب کی نظر سے اوجھل ہے۔ یہ اور خدا کی عظمت و کبریائی، اس کی تنزیہہ و تقدیس اور توحید و علم کلام کے دوسرے اسرار و مسائل اور وحدت الوجود کے حقائق و دقائق کو اس طرح شعری قالب میں ڈھالا ہے کہ کہیں اعتقادی و عملی گمراہی کا شائبہ نہیں آنے پایا ہے۔ دراصل شاعر نشۂ توحید میں مخمور ہے اس لیے وہ اپنی کشتِ علم و ہنر اور متاعِ فکر و فن کو عطیۂ ربانی

تصور کرتا ہے اور اس کا قلم جن حقائق و معارف کی شرح و ترجمانی کرتا ہے ان کو وہ قدرت کی بخشائش و فیضان کا ایک مظہر قرار دیتا ہے۔

میرے ہنر کا یہ چم و خم ہے اسی کا فیض | یہ میرے پاس رختِ نوا بھی اسی کا ہے
مشکل تھی ورنہ معنی و مفہوم کی نمود | یہ خامۂ طلسم کشا بھی اسی کا ہے
امکان و عرش کب تھے تہِ شہپرِ خیال | یوں ہے کہ میرے فن کا اڑانا بھی اسی کا ہے

قدرت کی اس فیاضی و انعام کے باوجود فضا صاحب کو اپنی بے چارگی و شکستگی کا بھی احساس ہے۔ اس لیے وہ خدا کی حقیقت اور اس کے مخفی اسرار کی کنہ کے بارے میں اپنی نارسائی کا اس طرح اعتراف کرتے ہیں:

دانشِ عقدہ کشا پر بھی یہ عقدہ نہ کھلا | کتنے اسرار ابھی زیرِ نقاب اس کے ہیں
سمجھے گی کیا یہ عقل فرومایہ کار | قدرت کے مضمرات ہما شما واحدہ ص ۳۰

در اصل انسان خدا کا بندہ ہے۔ وہ رازِ کن فکاں اور سرِ ازل سے آشنا نہیں ہو سکتا ص ۴۴
اس کا تمغۂ عبودیت ہی صد مایۂ فخر ہے:

کی عطا اس نے سند ہم کو عبودیت کی | فخر یہ کم نہیں، ہم خانہ خراب اس کے ہیں ص ۳۷

دعا و مناجات | دعا و تضرع جناب باری میں اپنی بے چارگی و فرومائیگی کے اظہار کا نام ہے۔ فضا صاحب کی دعائیہ شاعری میں عجز و شکستگی کی طرح علوئے ہمت، بلند حوصلگی اور ولولہ و نشاط کا درس بھی ہے۔ کہیں کہیں ان کی ذاتی دعا میں قوم کی سربلندی کی تمنا بھی جھلکتی ہے:

مرا سفینہ ہے بے موج و بے گہر اس کو | صدف کا ظرف، سمندر کی بے کرانی دے
حصارِ کلفتِ نومیدیٔ زبوں سے نکال | شکستِ جاں کو پرِ بالِ کامرانی دے

وہ خدا کی معرفت، حقیقت کے جویا اور مطالعۂ کائنات و ذات میں گم رہنے کے آرزو مند ہیں۔ اس لیے ان کی دعا و طلب کا انداز نرالا ہے:

یہ دنیا ہو چکی آئینہ مجھ پر — جہاں تو ہے وہاں کی اب خبر دے
مجھے غرض کسی بے روح داستاں سے کیا — تو جس کہانی میں شامل ہے وہ کہانی دے
رہوں مطالعۂ ذات و کائنات میں گم — کتاب دی ہے تو ذوقِ کتاب خوانی دے
عشرتِ نظر کو اب — عشق کی طہارت دے

شاعر علم و بصیرت کا طلبگار، جہل و نادانی سے عبرت کا خواہش مند اور اپنے علم و فن کے کمال اور کسب و ہنر کی جلا کا ملتجی ہے:

سوادِ حرف ہوں پیرایۂ معانی دے — مرے قلم کو سر و برگ نکتہ دانی دے ص ۹۰
اٹھا دے جہل و نادانی کے پردے — مذاقِ امتیازِ خیر و شر دے ص ۶۶
ترے سرِ نہاں کو فاش دیکھوں — وہ چشمِ نکتہ بین و نکتہ ور دے ص ۶۷
فضا کے ناتراشیدہ قلم کو — تمیزِ نکتہ آرائی دے

ہے مجھے ضرورت دے — نقدِ شعر و حکمت دے
دھند ہوں معانی کی — لفظ کی بصیرت دے
علم عِلم، آموزش — جہل جہل، عبرت دے
ذوقِ فاشِ گفتن کو — عشوہ و اشارت دے
ذہن میں اتر جاؤں — وہ بلیغ حجت دے
شاعرانہ عشووں کو — دانشِ رسالت دے
میں فقیر ہوں یا رب — آگہی کی دولت دے

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ فضا صاحب کے قلم کی نکتہ آرائی، ذہن کی دیدہ وری اور حقائق و معارف کی شرح و ترجمانی کا سبب ان کی بھی دعائے نیم شبی اور مناجات کے آنسو ہیں۔

نعتیہ کلام | "قوسِ حرا" کے پرکشش عنوان کے تحت نعتیں درج ہیں۔ شعرا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے اپنی عقیدت و شیفتگی اور فدویت و جاں نثاری کے اظہار کے لیے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے اس کا اصطلاحی نام نعت ہے۔ یہ ایک بڑی نازک اور مشکل صنف ہے۔ بعض شعرا نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و محامد کے بیان میں یا تو اس قدر مبالغہ آرائی کی ہے کہ آپ کی عبدیت الوہیت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ یا ایسا عامیانہ اور مبتذل انداز اختیار کیا ہے جو آپ کی عظمت و کمال کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً اردو کا نعتیہ ذخیرہ غیر معتبر ہونے کے علاوہ بہت رکیک اور پست ہے۔ فضا صاحب کی راسخ الاعتقادی اور دین کی حقیقت سے واقفیت نے ان کی نعتیہ شاعری کو افراط و تفریط سے پاک رکھا ہے۔ یہاں نبوت نہ الوہیت کے حدود میں داخل ہوئی ہے اور نہ شانِ نبوت میں کوئی بے ادبی و گستاخی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود آپ کی جامعیت، عظمت، خلقِ عمیم، لطفِ عظیم، اور تمام اوصاف و کمالات کا پورا مرقع سامنے آگیا ہے۔ چند مثالوں سے ان کی نعت گوئی کے نرالے انداز کا پتہ چلے گا۔ ظہورِ قدسی کا منظر دیکھیے:

مہک اٹھا نفس عرش و طور کیا کہیے	محمد عربی کا ظہور کیا کہیے
مصرع کائنات کا، عیبِ شکست نارِدا	حسن میں جس سے ڈھل گیا، کون محمد کریم
شعور کامراں ہوا، یقین سرخرو ہوا	خزاں بہار بن گئی جو گل فروش تو ہوا

اور معراج کا یہ پر کیف منظر بھی ملاحظہ ہو :

نقشِ قدم ہے سینۂ آفاق پر ترا

آخر پڑاؤ تھا شبِ اسریٰ کدھر ترا

جبریل ہمسفر تھے عجب تھا سفر ترا

تو دل کی رہ گزر، کہ ترا نام مصطفےٰ

اور آپ کی تعلیم و ہدایت کے جلوے ملاحظہ ہوں :

ناقص ہے دو جہاں کی قیادت ترے بغیر

تشنہ ہے ہر نظامِ شریعت ترے بغیر

ممکن نہیں فلاح کی صورت ترے بغیر

تو میرا راہبر کہ ترا نام مصطفےٰ

کشود تیری ذات سے رموز لا الٰہ کی — صنم کدے کی خاک اڑی جدھر جدھر نگاہ کی

شکست کھا گئے صنم، مرے نبیٔ محترم

مرے رسولِ محتشم، مرے نبیٔ محترم

نظامِ جبر و ظلم کا حساب پاک کر دیا — جو ننگِ صلح و خیر تھا وہ پردہ چاک کر دیا

یہ لطف اور کرم، مرے نبیٔ محترم

مرے رسولِ محتشم، مرے نبیٔ محترم

نفضاؔ صاحب دربارِ رسالت میں یوں گلہ مند ہوئے ہیں :

گناہ گار زبان سے اور تیرا ذکرِ جمیل — میں جانتا ہوں کہ یہ بھی بڑی جسارت ہے

وفورِ درد تھا ایسا کہ ضبط ہو نہ سکا — خود اپنی وضعِ جسارت پہ مجھ کو حیرت ہے

یہ حرف حرف نہیں آرزو کے آنسو ہیں | یہ لفظ لفظ نہیں، جذبۂ عقیدت ہے
تو چھپ گیا ہے سرا پردۂ ابد میں کہاں | یہ تجھ سے امت مرحوم کو شکایت ہے
جو شرع دے یہ اجازت تو میں کہوں تجھ سے | اسے موج نور حجاب ابد سے باہر آ
کہ میرے دور کو اب بھی تری ضرورت ہے | تری نوا، ترے پیغام کی ضرورت ہے

"منظر و پس منظر" کے عنوان سے نظمیں دی گئی ہیں۔ ان میں عہد حاضر کے حوادث و واقعات، موجودہ حالات و مسائل، انسانی ذہن و مزاج کی کجی و بد اندیشی اور سیاست دانوں اور حکمرانوں کی عیاری اور دو رُخے پن کے بارے میں جو تاثرات بیان کیے گئے ہیں ان سے شاعر کے دل کی دردمندی، ذہن کے اضطراب اور طبیعت کے کرب اور گھٹن کا اندازہ ہوتا ہے۔ متعدد نظموں پر ڈاکٹر اقبال کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ اسی طرح کی ایک نظم "ابلیس سے ایک ملاقات" میں دکھایا ہے کہ اس دور کے انسانوں کی شیطنت اور شر انگیزی ابلیس کی فتنہ و فساد انگیزی سے بھی بڑھ کر ہے۔

ارباب سیاست کی تمنا ہی بر آئی | انسان کو لے ڈوبی تمدن کی خدائی

تجھ سے بھی غضبناک ہیں انسان کے کرتوت

اے ساحر لاہوت!

فضا صاحب کی نظموں میں افکار و تخیلات کی پاکیزگی و جلالی اور الفاظ و طرز ادا کی دلفریبی و بانکپن کے علاوہ ولولہ و حوصلہ، ہمت و اولوالعزمی، سعی و عمل اور امید و یقین کا درس و پیام بھی ملتا ہے۔ ان کی ایک موثر اور کامیاب نظم "زہر کی کاشت" میں بھوپال کی قدیم علمی، دینی اور تہذیبی عظمت و شکوہ وغیرہ کا ذکر کر کے چند برس قبل وہاں پیش آنے والے گیس المیہ کی تباہی و حشر سامانی دکھائی ہے۔ ملاحظہ ہو:

یہ ٹکنالوجی کی برکت، یہ تجرباتِ گلب — قدم قدم پہ ہوئے خوں کا نخلِ نصب

سنا ہے اب وہاں زہروں کی کاشت ہوتی ہے — ہوا زمیں میں عذابوں کے تخم بوتی ہے

زمیں سے زندہ جنازوں کی فصلیں اگتی ہیں — اجڑتی کوکھ سے بیمار نسلیں اگتی ہیں

وہ سلسلہ ہے ہلاکت کی تخم ریزی کا — کہ ٹوٹتا ہی نہیں تار مرگ خیزی کا

کرشمہ کس کا ہے یہ مرگِ صد ہزار نفوس — یہ ارتقا، یہ عروجِ ترقیٔ معکوس

خودی کی جھوٹی خدائی، یہ مادے کا فتور — نئے لباس میں باطل فراعنہ کا ظہور

برا نہیں جو ترقی کا حوصلہ ہے بہت — کرو لہو کی تجارت کہ فائدہ ہے بہت

بجائے گندم و تریاق زہر کاشت کرو — سنہرے کھیتوں میں بجلی کی لہر کاشت کرو

ترقیوں کا جنوں بھی ہے کس قدر شاطر — بنے وطن کے محافظ بھی زہر کے تاجر

غبارِ مرگ کو بادل بنا کے چھوڑ دیا — وطن سے شہر کو جنگل بنا کے چھوڑ دیا

یہ روندتے ہوئے لاشوں کو موت کے عفریت — کوئی بتائے یہ سائنس کی ہے ہار کہ جیت

ترانے بھی فضا صاحب کے قلبی واردات، خیالات کی جولانی اور الفاظ کی مینا کاری کی تماشا گاہ ہیں۔

فضا صاحب نے کلام میں الفاظ کا جو طلسم باندھ دیا ہے اس سے ان کی قدرت اور زورِ بیان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے استعاروں، تشبیہوں اور ترکیبوں کا شکوہ و دلفریبی بھی قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیے بغیر نہیں رہتا۔ نئی ہونے کے باوجود ان کی ترکیبیں نامانوس نہیں ہوتیں۔ اس کا اندازہ چند مثالوں سے ہوگا: روزنگارِ ابر و ہوا، کاروبارِ صبر و رضا، برگِ شبنم زدہ، لالۂ آتش دیدہ، دوشیزۂ حرم، غزالِ کنجِ ہوا، دانش گاہِ حرا، فاضلِ مکتبِ حرا، منشیٔ لاہوت، کلیدِ نورِ ازل، دستِ ترشگافِ گرہ، نکتۂ ازل وغیرہ

«ض»

مطبوعات جدیدہ

القول الاصیل فیما فی العربیۃ من الدخیل ڈاکٹر ف۔ عبدالرحیم

تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت، عمدہ، صفحات ۲۵۱، مع خوبصورت ڈسک کور، قیمت درج نہیں، پتہ: مکتبہ لینۃ للنشر والتوزیع، دمنھور۔

ڈاکٹر ف۔ عبدالرحیم صاحب استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کو لسانیات سے بڑا شغف ہے، ابھی حال ہی میں انھوں نے ابومنصور جوالیقی کی کتاب المعرب کو ایڈٹ کرکے شایع کرایا ہے، جس پر اس سے قبل معارف میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، المعرب کی ترتیب و تکمیل کے دوران ڈاکٹر صاحب کو خیال ہوا کہ اس میں تمام دخیل لفظوں کا استقصاء نہیں کیا جا سکا ہے، اس لیے انھوں نے اس طویل اور صبر آزما کام کا بیڑا ابھی اٹھا لیا، اس کتاب میں پانچسو ایسے دخیل الفاظ کا ذکر ہے جو المعرب میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے، کتاب کے مطالعہ سے عربی زبان کی وسعت اور دوسری زبانوں سے اس کے اخذ و استفادہ کا اندازہ ہوتا ہے، مصنف کی تحقیق کے مطابق اونچ (بلندی) ترپھلا (اطریفل) درشا (برسات) بھنگ بھات بش (زہر) تامبول شکر (شکری) سیپ شیشم (درخت) پیپلی (فلفل) کرشن (درخت عربی کرسنۃ) لاکھ (لک) نمبوک (لیمون) نو (کشتی) نولو تپل (نیلوفر) ہلاہل (زہر) جیسے خالص ہندی الفاظ مختلف نوعیت کی تبدیلیوں کے بعد عربی زبان میں داخل ہو گئے ہیں، اس سے عرب و ہند کے قدیم علمی و تجارتی تعلقات کا ثبوت بہم پہنچتا ہے یہ کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور اسکی تالیف و ترتیب میں عربی کے علاوہ دوسری زبانوں کی کتب لغت کی چھان بین کی گئی ہے اور قدیم و جدید دونوں قسم کے مراجع سے فائدہ اٹھایا گیا ہے اور یہ دونوں کی خوبیوں کی حامل ہے۔

([illegible])

جلد ۱۴۹ ماہ شوال المکرم ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۹۲ء عدد ۴

مضامین

مقالات

وفیات

ضروری اعلان

ہر قسم کا چیک اور ڈرافٹ صرف دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کے نام سے آنا چاہیے۔ ایڈیٹر یا کسی شخص کے نام سے ہرگز نہ بھیجا جائے

"منیجر"

شذرات

۱۲ / اپریل ۱۹۹۲ء کو دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ کا ایک جلسہ ندوۃ العلما لکھنؤ میں ہوا جس کی صدارت مجلس عاملہ کے محترم صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے فرمائی اور حسب ذیل ارکان نے اس میں شرکت کی:

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی دہلی۔ مولانا سید محمد رابع ندوی لکھنؤ۔ ڈاکٹر محمد معظم حیدرآباد، دہلی۔ مرزا امتیاز احمد بیگ اعظم گڈھ۔ جناب سید شہاب الدین دسنوی معتمد دارالمصنفین اور راقم الحروف۔

دارالمصنفین کے پرانے دستور کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں نئے حالات اور ضرورتوں کے مطابق مناسب ردوبدل کی ضرورت عرصہ سے محسوس کی جارہی تھی چنانچہ ترمیم شدہ دستور اور ارکان کی جانب سے موصول تجویزوں پر غور کر کے مجلس نے اسے آخری شکل دی اور سال رواں ۹۳ - ۹۲ء کا بجٹ منظور کیا۔ دارالمصنفین کے موجودہ حالات اور ضرورتوں کو معلوم کر کے ارکان نے اس کی فلاح و بہبود اور اس کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مفید مشورے دیے۔ صدر محترم نے خصوصیت سے کتب خانہ میں جدید مطبوعات کے حصول اور اسے معیاری اور ترقی یافتہ بنانے کی ہدایت فرمائی جس پر حسب سہولت و امکان ان شاء اللہ عمل کیا جائے گا۔ کتابت و طباعت کی موجودہ دشواریوں کے پیش نظر دارالمصنفین کی نئی مطبوعات کی اشاعت اور قدیم کتابوں کے جدید ایڈیشن نکلنے میں تاخیر ہو رہی ہے اس کے حل کے لیے کمپیوٹر کے استعمال کا مسئلہ زیر بحث آیا لیکن اس کے لیے خطیر رقم درکار ہوگی۔ اس کے بعد ہی کمپیوٹر کے استعمال سے طباعت کی دشواریوں کو رفع کیا جا سکے گا۔

ان صفحات میں پہلے بھی لکھا جا چکا ہے کہ مجلس دارالمصنفین کا ماہوار رسالہ "معارف" بہت خسارے سے نکل رہا ہے لیکن یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ معارف کی اشاعت کا مقصد حصول منفعت کبھی نہیں رہا ہے۔ اس کا اصل مطمح نظر قوم کی ذہنی و دماغی تربیت، اپنے مذہب و ملک کی خدمت، اسلامی علوم و فنون کی اشاعت اور مسلمانوں کی پُر عظمت تاریخ و تہذیب کی حفاظت ہے۔ لیکن اردو لکھنے پڑھنے والی نسل روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ نئی نسل اپنی زبان، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنی روایات سے بیگانہ ہوگئی ہے کل جدید لذیذ کے طلسم میں ایسی گرفتار ہے کہ سنجیدہ، صحت مند اور حقائق پر مبنی لٹریچر پڑھنے پڑھانے سے اسے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس کی وجہ سے ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس کا اور اس کے قومی و ملی تشخص کا باقی رہنا مشکل ہوگیا ہے۔ دارالمصنفین قوم کو اس کے مذہب، تاریخ و ادب اور تہذیب و تمدن سے وابستہ رکھنے کے لیے نئے حالات اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ان کی ترویج و اشاعت کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے معارف جیسے علمی و تحقیقی رسالہ کو کس مپرسی کی حالت میں چھوڑ دینا قوم کی بے حسی اور غفلت کا ثبوت ہے۔ صدر محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بقول کسی بھی لائبریری میں معارف کا نہ ہونا تعجب خیز اور افسوسناک ہے۔

ملک و اقوام کی طاقت و توانائی کا راز علم و آگہی میں پنہاں ہے۔ کوئی قوم اپنے ماضی کے ورثہ، اپنی تاریخ و تہذیب اور اپنی زبان سے دستکش ہو جانے کے بعد ترقی نہیں کرسکتی، اسلام نے علم ہی کو سب سے اہم اور ناقابل تسخیر قوت بتایا ہے۔ اسی کی بدولت عربوں نے دنیا کو مسخر کرلیا تھا لیکن اس کو چھوڑ دینے کے بعد انھیں ایک چھوٹے سے ملک نے زیر و زبر کر رکھا ہے۔ باوجودیکہ وہ زر سیال کے مالک ہیں۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں کے

رگ و ریشہ میں بھی مالی حرص وطمع اور مادیت سرایت کرگئی ہے۔ ان میں سطحیت، بدمذاقی اور ذہنی، دماغی اور اخلاقی تنزل بھی اسی لیے پیدا ہوگیا ہے کہ انھوں نے مال وزر کا کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ اور مادیت کا جادو ان پر پوری طرح چل گیا ہے۔ ہر شخص اپنے حقیر مفاد کے لیے قوم وملت کے مفاد کو نظر انداز کررہا ہے۔ اپنی معمولی مادی خوش حالی میں مست اور مگن ہے لیکن قوم کی موجودہ زبوں حالی، مسلمانوں کے ادنیٰ درجے کے شہری ہوجانے اور ہندوستان کے موجودہ نقشہ میں ان کے اپنی قدر وقیمت کھودینے کا نہ انھیں کوئی غم ہے اور نہ وہ اس کی بازیابی کے لیے کبھی فکرمند ہوتے ہیں۔

افسوس ہے کہ شعبان المعظم کے آخری ہفتہ میں مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے ناظم مولانا محمد شمیم کیرانوی وفات پاگئے۔ اس مدرسہ کی داغ بیل ترکوں کے دور میں اس وقت پڑی تھی جب حجاز میں مدرسوں کی تعداد بہت کم تھی، پہلے اس کی زمام کار مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے سنبھالی جن کا خاص مشن ردعیسائیت تھا۔ اظہار الحق کی تصنیف اور مشہور پادری فنڈر کو عبرتناک شکست دینا ان کا بڑا کارنامہ تھا۔ مولانا محمد شمیم کے والد بزرگوار مولانا محمد سلیم کیرانوی کی نظامت کے زمانہ میں مدرسہ صولتیہ نے بڑی ترقی کی۔ ان کی وفات کے بعد مولانا محمد شمیم صاحب نے مدرسہ کے لیے اپنی خدمات وقف کردی تھیں انھوں نے اپنے والد ماجد کی روایات کو باقی رکھا۔ ہندوستان سے حج وزیارت کے لیے تشریف لے جانے والے علماء ومشائخ کے آرام وآسایش کا وہ بڑا خیال رکھتے اور ان کو ہر قسم کی مدد اور سہولت بہم پہونچاتے۔ معارف اور دارالمصنفین کے بھی قدردان تھے۔ اور کبھی کبھی خطوط لکھ کر ان سے اپنے تعلق کا ثبوت دیتے۔ مولانا کی عمر ابھی کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن ان کی حیات مستعار کے دن پورے ہوچکے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور مدرسہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین

مقالات

رحمت الٰہی کا قرآنی تصور اور مولانا ابوالکلام آزاد

از

ضیاء الدین اصلاحی

کئی ماہ پہلے معارف میں "ربوبیت الٰہی" کے قرآنی تصورات کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات پیش کیے گئے تھے، اسی وقت سے بعض قارئین کی جانب سے دوسری صفات الٰہی کی وضاحت کے لیے بھی تقاضا ہو رہا تھا، یہ مضمون اسی خیال سے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی ان چار صفتوں کا ذکر ہے، ربّ العالمین، الرحمٰن، الرحیم، مالک یوم الدین، ان میں الرحمٰن والرحیم کا تعلق ایک ہی صفت "رحمۃ" کے دو مختلف پہلوؤں سے ہے، اس لیے دراصل یہ تین ہی صفات ہوئیں یعنی ربوبیت، رحمت اور عدالت، یہاں رحمت پر بحث و گفتگو مقصود ہے،

رحمت کا مفہوم | مولانا کے نزدیک رحمت عواطف کی اس رقت و نرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسرے کے لیے احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آجائے، گویا اس میں محبت، شفقت، لطف، فضل اور احسان سب کا مفہوم شامل ہے مگر یہاں سب سے زیادہ وسیع و حاوی ہے۔

رحمان ورحیم کا فرق | ان کی اصل ایک ہونے کے باوجود ان سے رحمت کے دو مختلف پہلو سامنے آتے ہیں، مولانا کے نزدیک عربی میں فعلان کا وزن صفات عارضہ کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً پیاسے کے لیے عطشان، غضبناک کے لیے غضبان، سراسیمہ کے لیے حیران اور مست کے لیے سکران آتا ہے اس کے مقابلہ میں فعیل کے وزن میں صفات قائمہ کا خاصہ ہوتا ہے جیسے کریم (کرم کرنے والا) عظیم (بڑائی رکھنے والا) علیم (علم رکھنے والا) اور حکیم (حکمت رکھنے والا) اس طرح ان کے خیال میں الرحمٰن کے معنی وہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرحیم کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ اس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے اور ہر وقت اور ہر لمحہ کائناتِ خلقت اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔

مولانا دو الگ الگ اسموں سے رحمت کی تعبیر کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ قرآن کے پیش کردہ خدا کے تصور میں سب سے زیادہ غالب اور نمایاں یہی رحمت کی صفت ہے:

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ — اور میری رحمت (دنیا کی) ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ (۷ : ۱۵۵)

اس لیے ان دونوں کا ذکر کر کے خدا کی صفتی اور فعلی دونوں حیثیتیں واضح کرنا مقصود ہے یعنی خدا الرحمٰن ہے اس لیے اس میں رحمت ہے اور وہ الرحیم ہے اس لیے اس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے۔ (ترجمان القرآن جلد اول مطبوعہ زمزم کمپنی لمیٹڈ لاہور ص ۶۳)

رحمت کیا ہے | مولانا کے بیان کے مطابق قرآن مجید کی رو سے کائنات ہستی میں جو کچھ بھی خوبی و کمال ہے وہ رحمت الٰہی کا ظہور ہے، اس اجمال کی تفصیل وہ اس طرح

کرتے ہیں کہ کائنات کے اعمال و مظاہر پہ غور کرنے سے سب سے پہلے نظام ربوبیت کی حقیقت نمایاں ہوتی ہے، لیکن علم و ادراک کا قدم جب آگے بڑھتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ وسیع اور عام حقیقت جو کارفرما ہے اور جس کے فیضان کا ایک گوشہ ربوبیت بھی ہے، کیونکہ ربوبیت اور اس کا نظام کائنات ہستی کی پرورش ہے مگر کائنات ہستی میں پرورش سے بھی زیادہ بنانے، سنوارنے اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کارفرما ہے نیز اس کی فطرت میں بناؤ اور بناؤ میں خوبی ہے، اس کے مزاج میں اعتدال اور افعال میں خواص ہیں، اس کی صورت میں حسن ہے صداؤں میں نغمہ ہے اور اس کی بو میں عطر بیزی ہے گویا اس کی ہر ہر بات کارخانہ ہستی کی تعمیر و درستگی کے لیے مفید ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو حقیقت اپنے بناؤ اور فیضان میں ربوبیت سے زیادہ وسیع اور عام ہے، اسی کو قرآن حکیم رحمت اور خالق کائنات کی رحمانیت و رحیمیت کا ظہور بتاتا ہے، (ص۹۳)

مولانا فرماتے ہیں کہ اس پورے کارخانۂ وجود اور اس کے ہر فعل میں بننے، بنانے، سنورنے، سنوارنے اور ہر طرح سے بہتر و اصلح ہونے کا خاصہ اس لیے ہے کہ فطرت کائنات میں رحمت ہے اور رحمت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ خوبی اور درستگی ہو بگاڑ اور خرابی نہ ہو، گویا ان کے نزدیک رحمت کی کارفرمائی سے کائنات خلقت اور کارخانۂ عالم کا کوئی گوشہ خالی نہیں، جمال فطرت و جمال معنوی اور نظام کائنات کے گوناگوں پہلوؤں پر طویل بحث کرنے کے بعد وہ برہان فضل و رحمت کا ذکر کرتے ہیں اور پھر رحمت کے آثار و حقائق سے توحید، معاد اور وحی پر قرآن مجید کے استدلال کا تذکرہ کرتے ہیں، اس کے بعد وہ رحمت کے سلسلے کے اہم اصولی اور بنیادی حقائق

ومسائل بیان کرتے ہیں جن کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اسلامی عقائد کا دینی تصور رحمت پر مبنی ہے

مولانا کے خیال میں قرآن مجید نے انسان کے لیے دینی عقائد واعمال کا جو تصور قائم کیا ہے اس کی بنیاد تمام تر رحمت ومحبت پر ہے اس لیے کہ قرآن مجید کے نزدیک انسان کی روحانی زندگی کائنات فطرت کے عالمگیر کارخانہ سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ یہ اسی کا ایک مربوط گوشہ ہے اور چونکہ کارخانۂ ہستی کی بنیاد رحمت پر ہے اس لیے اس گوشہ میں بھی اس کے تمام احکام کا سرتاسر رحمت پر مبنی ہونا ناگزیر ہے۔ اس مسئلہ میں وہ سب سے پہلے قرآنی آیات سے اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ بندوں سے خدا کا رشتہ محبت کا ہے اور وہ معبود کو صرف معبود ہی نہیں بلکہ محبوب بھی بتاتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَنْدَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (۲: ۱۶۵)	اور (دیکھو) انسانوں میں کچھ انسان ایسے ہیں جو دوسری ہستیوں کو اللہ کا ہم پلہ بنا لیتے ہیں، وہ انہیں اس طرح چاہنے لگتے ہیں جس طرح اللہ کو چاہنا ہوتا ہے، حالانکہ جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں، ان کی زیادہ سے زیادہ محبت صرف اللہ ہی کیلئے ہوتی ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری حقیقت وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ خدا کی محبت کی عملی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہوکر گزری ہے، اس لیے جو خدا سے محبت کرے

اسے اس کے بندوں سے بھی محبت کرنی چاہیے!

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ	اور اللہ کی محبت میں وہ مسکینوں،
حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَ	یتیموں، قیدیوں کو کھلاتے ہیں
أَسِيرًا ۔ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ	(اور کہتے ہیں) ہمارا یہ کھلانا، اس کے
لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ	سوا کچھ نہیں ہے کہ محض اللہ کے لیے
جَزَاءً وَلَا شُكُورًا	ہے، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے
(۷۶ : ۸ و ۹)	ہیں، نہ کسی طرح کی شکر گزاری۔

اس بحث میں مولانا آزاد نے اس مشہور حدیث قدسی کا ذکر بھی کیا ہے جس میں یہ حقیقت نہایت موثر پیرایے میں واضح کی گئی ہے کہ قیامت کے دن خدا ایک انسان سے کہے گا کہ اے ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ متعجب ہو کر کہے گا بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے؟ تو تو رب العالمین ہے، خدا فرمائے گا، کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تو نے اس کی خبر نہیں لی تھی، اگر تو اس کی بیمار پرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ (ترجمان القرآن جلد اول صفحہ ۱۰۱)

مولانا ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے اعمال و عبادات کی جو شکل و نوعیت قرار دی ہے اور اخلاق و خصائل کی جن باتوں پر زور دیا ہے اور اوامر و نواہی کے جو اصول و مبادی ملحوظ رکھے ہیں ان سب میں یہی حقیقت کارفرما ہے جو اس قدر واضح ہے کہ محتاج ثبوت و بیان نہیں ہے۔

قرآن مجید سراسر رحمت کا پیام ہے | آگے چل کر مولانا نے بتایا ہے کہ قرآن مجید نے سب سے

زیادہ خدا کی صفت رحمت ہی کو دہرایا ہے اور یہی مطلب اس کے صفات میں بہت زیادہ نمایاں ہے، اس میں تین سو سے زیادہ جگہوں پر رحمت کا ذکر براہ راست ہے، بعض جگہ رحمت کا لفظ صراحتاً نہیں آیا ہے لیکن جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں انکا تعلق بھی رحمت ہی سے ہے جیسے ربوبیت، مغفرت، رافت، کرم، حلم، عفو وغیرہ اگر ان کو بھی اس میں شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد اتنی بڑھ جائے گی کہ اسکے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید از اول تا آخر رحمت الٰہی کا پیام ہے۔ (ص۱)

وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل سے بھی خدا کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت و رحمت کو اسلام کی اصل حقیقت بتاتے ہیں اس مفہوم کی بعض حدیثیں نقل کرکے واضح کرتے ہیں کہ انسانی رحمت و شفقت کی اسلامی نوعیت اس قدر وسیع ہے کہ بے زبان جانور بھی اس سے باہر نہیں ہیں۔

صفات الٰہی سے تشبہ و تخلق | مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے خدا پرستی کی بنیاد اس جذبہ پر رکھی ہے کہ انسان اپنے اندر خدا کی صفتوں کا پرتو پیدا کرے کیونکہ صفات الٰہی کے تشبہ و تخلق سے انسانیت کی تکمیل اور جوہر انسانیت کی تحصیل ہوتی ہے اور انہی کی بدولت انسان حیوانات سے بلند اور ممتاز ہوتا ہے، اسی بناء پر قرآن مجید نے انسان کی خاص صفات کو براہ راست خدا کی طرف نسبت دی ہے اور جوہر انسانیت کو خدا کی روح پھونک دینے سے تعبیر کیا ہے۔ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ (۳۲ : ۸) یعنی خدا نے آدم میں اپنی روح میں سے کچھ پھونک دیا اور اسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے اندر عقل و حواس کا چراغ روشن ہو گیا۔ (ص۱۰)

مولانا کے مطابق قرآن مجید خدا کا رحمت کا یہ تصور اسی لیے پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ہم بھی سراپا رحمت و محبت ہو جائیں چنانچہ ربوبیت کا مرقع ہمارے سامنے اسکے لانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے چہرۂ اخلاق میں ربوبیت کے سارے خال وخط پیدا کریں، رافت ورحمت کا ذکر، لطف وکرم کا جلوہ اور جود واحسان کا نقشہ وہ اسی لیے کھینچتا ہے کہ ہم میں بھی خدا کی ان صفتوں کا جلوہ نمودار ہو، وہ بار بار ہمیں سناتا ہے کہ خدا کی بخشش ودرگزر غیر محدود اور لا متناہی ہے تاکہ ہم میں بھی اس کے بندوں کے لیے بخشش ودرگزر کا لا محدود جوش پیدا ہو جائے، کیونکہ اگر ہم خدا کے بندوں کی خطائیں بخش نہیں سکتے تو ہمیں اس کا حق نہیں کہ اپنی خطاؤں کے لیے اس کی بخشایشوں کا انتظار کریں۔ (ص۱۰۸)

احکام و شرائع | مولانا کے نزدیک قرآن مجید کی تعلیم احکام و شرائع اس کے سراپا پیام رحمت ہونے کے منافی نہیں ہے، انھوں نے اس مسئلہ کے کئی نکتوں کی وضاحت کی ہے، پہلے تمہید کے طور پر یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید یہ نہیں کہتا کہ دشمنوں کو پیار کرو کیونکہ یہ کہنا حقیقت نہیں مجاز ہوتا بلکہ اس نے یہ کہا ہے کہ دشمنوں کو بھی بخشش دو تاکہ اس سے خود بخود انسانی بغض ونفرت کی آلودگیاں زائل ہو جائیں اس موقع پر وہ قرآنی آیات نقل کرکے ان کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے بدلہ لینے سے بالکل روکنے کی تعلیم اس لیے نہیں دی ہے کہ یہ طبیعت حیوانی کا فطری خاصہ ہے اور اسی پر حفاظت نفس کا دارومدار ہے لیکن اس اجازت کے ساتھ اس نے عفو و بخشش اور بدی کے بدلے نیکی کی موثر ترغیب بھی دی ہے (ص۱۱۲)

حضرت مسیحؑ کی تعلیمات | یہاں پہنچ کر مولانا ہماری توجہ اس امر کی طرف منعطف

کرتے ہیں کہ یہودیوں کی ظاہر پرستی اور اخلاقی محرومی کی جگہ حضرت مسیحؑ نے رحم و محبت اور عفو و بخشش کی اخلاقی قربانیوں پر زور دیا تھا جو ان کی دعوت کی اصل روح ہے۔ چنانچہ انجیل کے مواعظ میں اس طرح کی تعلیم ملتی ہے کہ "تم نے سنا ہوگا کہ اگلوں سے کہا گیا کہ دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ مگر میں کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا پا اپنے ہمسایوں ہی کو نہیں بلکہ دشمنوں کو بھی پیار کرو یا اگر کوئی تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو چاہیے دوسرا گال بھی آگے کر دو" مولانا کے نزدیک یہ ساری باتیں دراصل اخلاقی فضائل و ایثار کا ایک موثر پیرایہ بیان تھا جس کا کوئی تعلق تشریع اور قانون سازی سے نہیں (ص۱۰۳ و ص۱۰۱)

مولانا کے نزدیک اس مقام پر انجیل کے معتقدین اور نکتہ چینوں دونوں کو لغزش پیش آئی ہو چنانچہ انھوں نے ان تعلیمات کو تشریع سمجھ لیا، اس کی وجہ سے دونوں نے انہیں ناقابل عمل احکام قرار دیا۔ نادان معتقدین نے انہیں ناقابل عمل سمجھنے کے بعد بھی انہی کو مسیحیت کے احکام بتایا اور کہا کہ ابتدائی دور کے کچھ ولیوں اور شہیدوں کا ان پر عمل کر لینا عملی نقطۂ خیال سے کافی ہے، بے درد نکتہ چینوں کے نزدیک یہ سراسر نظری اور ناقابل عمل تعلیم ہے جو چاہے کیسی ہی خوشنما کیوں نہ ہو لیکن عملی نقطہ خیال سے بے قدر و قیمت اور فطرتِ انسانی کے صریح خلاف ہے۔

مولانا کے نزدیک تاریخ انسانیت کے اس عظیم الشان معلم کے ساتھ یہ نوع انسانی کی بڑی ہی دردانگیز ناانصافی ہے، ان کے خیال میں قرآن کی سچائی کو ماننے والا نہ حضرت مسیحؑ کی تعلیم کو فطرتِ انسانی کے خلاف اور ناقابل عمل قرار دے سکتا ہے اور نہ انکی تعلیم کی سچائی کا انکار کر سکتا ہے، ان کے نزدیک کوئی سچی تعلیم فطرت انسانی کے خلاف

نہیں ہو سکتی اس لیے اس طرح کا اعتقاد قرآن مجید کی تعلیم کے منافی اور اس کی اس دعوت کی بنیاد کو متزلزل کر دینے والا ہے کہ وہ دنیا کے تمام انبیاء کی یکساں طور پر تصدیق کرتا ہے، قرآن مجید نے تفریق بین الرسل کو پیروان مذاہب کی سب سے بڑی گمراہی بتایا ہے :-

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (۳ : ۸۴)	ہم خدا کے رسولوں میں سے کسی کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں کسی کو نہ مانیں) ہم تو خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں (اسکی سچائی کہیں بھی آئی ہو اور کسی کی زبانی آئی ہو، ہمارا اس پر ایمان ہے)!

مولانا فرماتے ہیں قرآن مجید نے حضرت مسیحؑ کی رحمت و رقت کی دعوت کو جا بجا نمایاں کیا ہے اور یہودیوں کی اخلاقی خشونت و قساوت کے مقابلہ میں مسیحی اخلاق کی رقت و رافت کی تعریف کی ہے، وہ قرآن مجید کی اس فراخ دلی کو بھی نمایاں کرتے ہیں کہ اس نے جس قدر اور جس طرح خود اپنے اوصاف بیان کیے ہیں وہی اور اسی طرح کے انجیل و توراۃ کے بھی بیان کیے ہیں مثلاً اگر وہ اپنے کو ہدایت کرنے والا، روشنی رکھنے والا، نصیحت کرنے والا، قوموں کا امام، متقیوں کا راہنما کہتا ہے تو پچھلے صحیفوں کو بھی ان اوصاف سے متصف بتایا ہے، انجیل کی نسبت اس کا بیان ہے وَآتَيْنَاهُ الْإِنجِيلَ فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ (۵ : ۴۶) مولانا لکھتے ہیں جو تعلیم

فطرت بشری کے خلاف اور ناقابل عمل ہو وہ کبھی نور و ہدایت اور مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ نہیں ہو سکتی اس لیے وہ بتاتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی ان تعلیمات کی وہ نوعیت ہی نہیں تھی جو غلطی سے سمجھ لی گئی ہے، ان کے نزدیک دنیا میں ہمیشہ انسان کی سب سے بڑی گمراہی کا سرچشمہ انکار کے بجائے کچھ اندیشانہ اعتراف ہی رہا ہے۔ (ص۱۰)

حضرت مسیحؑ کی اصل دعوت کی نوعیت

حضرت مسیحؑ کی دعوت کی اصل حقیقت و نوعیت کو وہ اس طرح واضح کرتے ہیں:-

"حضرت مسیحؑ کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا جب کہ یہودیوں کا اخلاقی تنزل انتہائی حد تک پہنچ چکا تھا اور دل کی نیکی اور اخلاق کی پاکیزگی کی جگہ محض ظاہری احکام و رسوم کی پرستش دینداری و خدا پرستی سمجھی جاتی تھی، یہودیوں کے علاوہ جس قدر متمدن قومیں قرب و جوار میں موجود تھیں مثلاً رومی، مصری، آشوری وہ بھی انسانی رحم و محبت کی روح سے یکسر ناآشنا تھیں، لوگوں نے یہ بات تو معلوم کر لی تھی کہ مجرموں کو سزائیں دینی چاہئیں، لیکن اس حقیقت سے بے بہرہ تھے کہ رحم و محبت اور عفو و بخشش کی چارہ سازیوں سے جرموں اور گناہوں کی پیدائش روک دینی چاہیے انسانی قتل و ہلاکت کا تماشا دیکھنا، طرح طرح کے ہولناک طریقوں سے مجرموں کو ہلاک کرنا، زندہ انسانوں کو درندوں کے سامنے ڈال دینا، آباد شہروں کو بلا وجہ خاکستر کر دینا، اپنی قوم کے علاوہ تمام انسانوں کو غلام سمجھنا اور غلام بنا کر رکھنا، رحم و محبت اور حلم و شفقت کی جگہ قلبی قساوت و بے رحمی پر فخر کرنا، رومی تمدن کا اعلیٰ اور مصری اور آشوری دیوتاؤں کا پسندیدہ طریقہ تھا۔

ضرورت تھی کہ نوع انسانی کی ہدایت کے لیے ایک ایسی ہستی مبعوث ہو جو نہ

رحمت و محبت کا پیام ہو اور جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں سے قطع نظر کرکے، حضرت
اس کی قلبی و معنوی حالت کی اصلاح و تزکیہ پر اپنی تمام پیغمبرانہ ہمت مبذول کردے؛
چنانچہ حضرت مسیحؑ کی شخصیت میں وہ ہستی نمودار ہوگئی، اس نے جسم کی جگہ روح پر، زبان
کی جگہ دل پر اور ظاہر کی جگہ باطن پر نوعِ انسانی کو توجہ دلائی اور انسانیت اعلا کا
فراموش شدہ سبق تازہ کر دیا" (ترجمان القرآن ص۱۰۲)

حضرت مسیحؑ کے مواعظ و ارشادات کی صحیح توجیہ

حضرت مسیحؑ کے بارے میں یہ عظیم الشان غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ ان کے مواعظ کو تشریع کا درجہ دے دیا گیا اور جو کلام مجازاً کہا گیا تھا اسے حقیقت پر محمول کر لیا گیا، اصل یہ ہے کہ ہر بلیغ کلام کی طرح اس الہامی کلام کی بلاغت کے بھی مجازات تھے جو اس کی تاثیر کا زیور اور اس کی دل نشینی کی خوب روئی ہیں مگر افسوس کہ اقانیم ثلاثہ اور کفارہ کے گورکھ دھندوں میں پڑنے والے حضرت مسیحؑ کے مواعظ کا مقصد و محل نہیں سمجھ سکے (ص۱۰۶)

مولانا فرماتے ہیں کہ "دشمنوں کو پیار کرو" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر انسان کو چاہیے کہ وہ ان کا عاشق زار ہو جائے بلکہ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ اس میں غیظ و غضب اور نفرت و انتقام کی جگہ رحم و محبت کا پُر جوش جذبہ ہونا چاہیے دوست تو دوست دشمن سے بھی عفو و درگزر سے پیش آنا چاہیے غرض "دشمنوں تک کو پیار کرو" دراصل اس مطلب کو واضح کرنے کا ایک نہایت ہی بلیغ اور موثر پیرایۂ بیان ہے کہ رحم کرو، بخش دو، انتقام کے پیچھے نہ پڑو، جس گرد و پیش میں اپنوں اور عزیزوں کے ساتھ بھی رحم و محبت کا برتاؤ مفقود ہو، دشمنوں سے بھی نفرت نہ کرو کہنا رحم و محبت

کہ مروت کا ایک اعلا اور کامل ترین تخیل پیدا کر دیا تھا ؎

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کے میسر شود این مقام کہ با دوستانت خلاف است و جنگ

اس طرح مولانا بتاتے ہیں کہ "اگر کوئی تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی آگے کر دو" کا مطلب یہ نہ تھا کہ سچ مچ تم اپنا گال آگے کر دیا کرو بلکہ اس کلام کا صریح مطلب یہ تھا کہ انتقام کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرو، مولانا کے نزدیک بلاغتِ کلام کے یہ مجازات ہر زبان میں یکساں طور پر ہوتے ہیں، ان کے مقصود و مفہوم کے بجائے ان کے منطوق پر زور دینا بڑی جہالت کی بات ہے، مجازات کو ظواہر پر محمول کرنے سے تمام الہامی تعلیمات درہم برہم ہو جائیں گی اور دنیا کی تمام زبانوں میں ادب و بلاغت کے ساتھ کہا جانے والا سارا کلام یک قلم مختل ہو جائیگا (ملخصاً)

مولانا نے حضرت مسیحؑ کے مواعظ کی اصل نوعیت جو سمجھائی ہے اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ حضرت مسیحؑ نے سزا کی جگہ محض عفو و درگزر ہی پر کیوں زور دیا، مولانا کو یہ تسلیم ہے کہ شرائع نے تعزیر و عقوبت کا حکم دیا ہے، لیکن ان کے نزدیک یہ فی نفسہ تعزیر و عقوبت کے مستحسن عمل ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے بلکہ وہ انسانی معیشت کی بعض ناگزیر حالتوں کے لیے اسے ناگزیر علاج بتاتے ہیں جس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ بڑے درجے کی برائیوں کو روکنے کے لیے ایک کم درجہ کی برائی کو گوارا کر لیا گیا لیکن وہ فرماتے ہیں کہ دنیا نے اسے علاج کے بجائے ایک دل پسند مشغلہ اور انسان کی تعذیب و ہلاکت کا خوفناک آلہ بنا لیا اور انسانی قتل و غارت گری کی ہر ہوسناکی اسی شریعت و قانون کے نام پر کر ڈالی جو بدلہ لینے اور

سزا دینے کے حکم کا ظالمانہ استعمال تھا، مولانا نہایت جذباتی انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ میدان جنگ سے باہر انسانی ہلاکت کی سب سے بڑی قوتیں وہ عدالت گاہیں ہیں جو مذہب و قانون کے نام پر قائم کی گئیں اور انھوں نے بڑی وحشت انگیزی و ہولناکی کے ساتھ اپنے ہم جنسوں کی تعذیب و ہلاکت کا عمل جاری رکھا، انھوں نے انسانی گمراہی کی بوالعجبیوں کی یہ مثال دی ہے کہ جس انجیل کی تعلیم یہ سمجھی گئی تھی کہ وہ کسی حال میں بدلہ لینے اور سزا دینے کو روا نہیں سمجھتی اسی کے پیروؤں نے اس کے اور اسکے مقدس معلم کے نام پر نوع انسانی کی تعذیب و ہلاکت کا عمل ایسی وحشت و بے رحمی کے ساتھ صدیوں تک جاری رکھا کہ آج اس کا تصور بھی دہشت و سہم اس کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح کا مقصد تعزیر و سزا کے خلاف کوئی نئی تشریع کرنا نہ تھا، انھوں نے تعزیر و عقوبت کی جگہ سرتاسر رحم و درگزر پر زور اس لیے دیا ہے کہ وہ اس ہولناک غلطی سے انسان کو نجات دلانا چاہتے تھے جس میں تعزیر و عقوبت کے غلو نے اسے مبتلا کر دیا تھا، وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ انسانی اعمال میں تعزیر و انتقام کے بجائے رحم و محبت اصل ہے۔ تعزیر و سیاست بطور ایک ناگزیر علاج کے جائز رکھی گئی ہے جس کو اس لیے عمل میں نہ لایا جائے کہ دل رحم و محبت کی جگہ سرتاسر نفرت و انتقام کا آشیانہ ہو جائیں۔

شریعت موسوی کو اس کے پیرووں نے صرف سزا دینے کا آلہ بنا لیا تھا، مولانا کہتے ہیں کہ حضرت مسیح نے بتلایا کہ شریعت سزا دینے کے بجائے نجات کا راستہ دکھانے کے لیے آتی ہے اور یہ سرتاسر محبت و رحمت کی راہ ہے (صک۱)

عمل و عامل کا فرق | مولانا ابوالکلام کے نزدیک عمل و عامل میں امتیاز قائم رکھنا انسان کی بنیادی غلطی رہی ہے وہ کہتے ہیں کہ عمل کیسا ہے اور عمل کرنے والا کیسا ہے، مذہب کی تعلیم کے مطابق دونوں میں بڑا فرق ہے اور دونوں کا حکم ایک نہیں ہے، بدعملی اور گناہ کی طرف سے انسان کے دل میں نفرت پیدا کرنا بلاشبہ تمام مذاہب کا عالمگیر مقصد رہا ہے، لیکن انسان کی طرف سے دوسرے انسان کے دل میں نفرت پیدا کرنے کو مذاہب گوارا نہیں کرتے، ان کی تعلیم یہ تو ہے کہ گناہ سے نفرت کرو مگر یہ نہیں ہے کہ گناہ گار سے نفرت کرو، جس طرح ایک طبیب بیماریوں سے لوگوں کو ڈراتا اور ان کے مہلک نتائج کا نقشہ کھینچ کر انہیں سہما دیتا ہے، لیکن نہ خود بیماروں سے ڈرتا اور نفرت کرتا ہے اور نہ لوگوں کو ان سے نفرت کرنے اور ڈرنے کے لیے کہتا ہے بلکہ اسے اپنی توجہ و شفقت کا مرکز بناتا ہے اور جو جتنا زیادہ بیمار ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کی توجہ و شفقت کا مستحق ہوتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں، جسم کے طبیب کی طرح روح و دل کے طبیب بھی گناہوں کے لیے نفرت مگر گنہگاروں کے لیے سراپا رحمت و شفقت کا پیام ہوتے ہیں، وہ روح و دل کی بیماریوں اور گناہوں سے تو نفرت و دہشت پیدا کرتے ہیں لیکن گنہگار انسانوں سے ایسا نہیں کرتے، مولانا کے نزدیک یہی وہ نازک مقام ہے جہاں پیروان مذاہب کو ہمیشہ ٹھوکر لگی ہے، مذاہب نے انہیں برائی سے نفرت کرنا سکھایا لیکن انھوں نے ان انسانوں سے نفرت کرنا سیکھ لیا جو ان کے خیال میں برائی کے مجرم تھے۔

مولانا کے بیان کے مطابق حضرت مسیحؑ کی دعوت کی حقیقت اور روح یہ

تھی کہ گناہوں سے نفرت کرو مگر گناہوں میں مبتلا ہوجانے والے انسانوں سے نفرت نہ کرو، ان کے خیال میں انسان کے گنہگار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی روح و دل کی تندرستی باقی نہیں رہی، جب اس نے بدبختانہ اپنی تندرستی کھودی ہے تو وہ نفرت کے بجائے تمھارے رحم و شفقت کا زیادہ مستحق ہوگیا، بیمار بھائی کی تیمار داری کی جاتی ہے اسے جلاد کے تازیانے کے حوالے نہیں کیا جاتا مولانا سینٹ لوقا کی زبانی یہ واقعہ سناتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی خدمت میں ایک گنہگار عورت آئی اور اس نے اپنے بالوں کی لٹوں سے ان کے پاؤں پوچھے تو ریاکار فریسیوں کو سخت تعجب ہوا لیکن حضرت نے فرمایا طبیب تندرستوں کے لئے نہیں بیماروں کے لیے ہوتا ہے پھر خدا اور گنہگار بندوں کا رشتہ رحمت واضح کرنے کے لیے یہ نہایت موثر اور دلنشین تمثیل بیان کی فرض کرو ایک ساہوکار کے دو قرضدار تھے ایک پچاس روپے کا اور دوسرا ایک ہزار روپیہ کا، ساہوکار نے دونوں کا قرض معاف کردیا، اب کس قرضدار پر اس کا احسان زیادہ ہوا اور کون اس سے زیادہ محبت کرے گا۔ مولانا نے بعض ائمہ تابعین کے اس قول کی بھی یہی حقیقت بتائی ہے کہ "خدا کو فرمانبردار بندوں کی تمکنت سے زیادہ گنہگار بندوں کا عجز و انکسار محبوب ہے" (ص۱۰۱)

اس سلسلہ میں مولانا ہم کو قرآن مجید کے اس اسلوب کی جانب توجہ دلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عموماً یائے نسبت کے ساتھ گنہگار انسانوں کو مخاطب کیا یا انکا ذکر کیا ہے جو تشریف و محبت کی دلیل ہے جیسے قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ (۳۹:۵۳) ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِيْ (۲۵:۱۸) مولانا کے

نزدیک یہ ویسی ہی مثال ہے جیسے ایک باپ جوش محبت میں جب اپنے بیٹے کو پکارتا ہے تو اس کے ساتھ اپنے رشتہ پدری پر خصوصیت سے زور دیتا اور کہتا ہے اے میرے بیٹے! اے میرے فرزند! سورۂ زمر کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے مولانا امام جعفر صادق کے حوالہ سے اس کی یہ تفسیر نقل کر کے اس کی تحسین کرتے ہیں۔

"جب ہم اپنی اولاد کو اس طرح اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں کیونکہ سمجھ جاتے ہیں، ہم ان پر غضبناک نہیں، قرآن مجید میں خدا نے بیس[۲] سے زیادہ موقعوں پر یہی عبادی کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور سخت سے سخت گنہگار انسانوں کو بھی یٰعِبَادِیَ کہہ کر پکارا ہے، کیا اس سے بھی بڑھکر اسکی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہو سکتا ہے"۔

انجیل اور قرآن مجید کی تعلیم میں اختلاف نہیں

مولانا کے نزدیک حضرت مسیحؑ کی اس تعلیم اور قرآن مجید کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر کوئی فرق ہے تو محل بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے صرف اخلاق اور تزکیۂ قلب پر زور دیا کیونکہ شریعت موسوی کا ایک نقطہ بھی وہ بدلنا نہیں چاہتے تھے مگر قرآن مجید نے اخلاق اور قانون دونوں کے احکام بہ یک وقت بیان کیے ہیں اس لیے اس نے مجازات و تشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف جچا تلا پیرایۂ بیان اختیار کیا، پہلے اس نے عفو و درگزر پر زور دیا اور اسے نیکی و فضیلت کی اصل قرار دیا مگر چونکہ ناگزیر حالتوں میں بدلہ اور سزا کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اس لیے اس کا دروازہ بھی کھلا رکھا مگر اس میں کسی طرح کی زیادتی اور ناانصافی سے قطعی اور صریح لفظوں

میں روک بھی دیا۔ مولانا دنیا کے تمام نبیوں اور شریعتوں کے احکام کا حاصل یہی تین اصول بتاتے ہیں (ص) اس موقع پر مولانا وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ (۴۲: ۴۰) کی آیت نقل کرکے اس کے اسلوب بیان پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں اس میں عفو کی تکرار ہے جس کو اس کی اہمیت واضح کرنے کے لیے لایا گیا ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ گو سزا اور انتقام کا دروازہ کھلا ہے مگر نیکی و فضیلت کی راہ عفو و درگزر ہی کی ہے۔ زیر بحث آیت میں انھوں نے اس نکتہ پر بھی زور دیا ہے کہ قرآن مجید نے برائی کے بدلے میں دی جانے والی سزا کو بھی برائی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا اس سے ظاہر ہے کہ بدلہ میں کیا جانے والا عمل حسن نہ ہوگا، سیئہ ہوگا جس کا دروازہ اس لیے باز رکھا گیا ہے کہ اس سے بھی زیادہ برائیاں ظہور میں نہ آئیں، دوسری جانب معاف کرنے والے کے لیے أَصْلَحَ (سنوارنے والا) کا لفظ آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بگاڑ کو سنوارنے والے اصلاً وہ لوگ ہیں جو بدلے کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ (ص ۱۱۰-۱۱۱)

قرآن مجید کے زواجر و قوارع آخر میں مولانا قرآن مجید کے زواجر و قوارع کے متعلق بعض اصولی باتیں بیان کرکے اس شبہ کو دور کرتے ہیں کہ جب اس کی تمام تعلیم کا اصل اصول رحمت ہی ہے تو اس نے اپنے مخالفین کی نسبت زجر و توبیخ کا سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا؟ مولانا کو یہ تسلیم ہے کہ قرآن مجید نے مخالفوں کے لیے شدت و غلظت کا اظہار کیا ہے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ مخالفین کی ایک قسم وہ ہے جن کی مخالفت محض اختلاف فکر و اعتقاد کی ہے، ان کی مخالفت معاندانہ اور جارحانہ نوعیت کی نہیں ہوتی، ان مخالفین کے بارے میں وہ پورے وثوق کے ساتھ

نزدیک یہ ویسی ہی مثال ہے جیسے ایک باپ جوش محبت میں جب اپنے بیٹے کو پکارتا ہے تو اس کے ساتھ اپنے رشتہ پدری پر خصوصیت سے زور دیتا اور کہتا ہے اے میرے بیٹے! اے میرے فرزند! سورۂ زمر کی جو آیت اوپر نقل ہوئی ہے مولانا امام جعفر صادق کے حوالہ سے اس کی یہ تفسیر نقل کر کے اس کی تحسین کرتے ہیں۔

"جب ہم اپنی اولاد کو اس طرح اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں کیونکہ سمجھ جاتے ہیں، ہم ان پر غضبناک نہیں، قرآن مجید میں خدا نے بیس[۲] سے زیادہ موقعوں پر ہیں عبادی کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور سخت سے سخت گنہگار انسانوں کو بھی یٰعِبَادِیَ کہہ کر پکارا ہے، کیا اس سے بھی بڑھ کر اسکی رحمت و آمرزش کا کوئی پیام ہو سکتا ہے"۔

انجیل اور قرآن مجید کی تعلیم میں اختلاف نہیں

مولانا کے نزدیک حضرت مسیحؑ کی اس تعلیم اور قرآن مجید کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر کوئی فرق ہے تو محل بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے صرف اخلاق اور تزکیۂ قلب پر زور دیا کیونکہ شریعت موسوی کا ایک نقطہ بھی وہ بدلنا نہیں چاہتے تھے مگر قرآن مجید نے اخلاق اور قانون دونوں کے احکام بہ یک وقت بیان کیے ہیں اس لیے اس نے مجازات و تشابہات کی جگہ احکام و قوانین کا صاف جچا تلا پیرایۂ بیان اختیار کیا، پہلے اس نے عفو و درگزر پر زور دیا اور اسے نیکی و فضیلت کی اصل قرار دیا مگر چونکہ ناگزیر حالتوں میں بدلہ اور سزا کے بغیر چارہ نہیں ہوتا اس لیے اس کا دروازہ بھی کھلا رکھا مگر اس میں کسی طرح کی زیادتی اور ناانصافی سے قطعی اور صریح لفظوں

میں مدد کی بھی دیا، مولانا دنیا کے تمام نبیوں اور شریعتوں کے احکام کا ماحصل یہی تین اصول بتاتے ہیں (ص۹) اس موقع پر مولانا وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ (شوریٰ: ۴۰) کی آیت نقل کرکے اس کے اسلوب بیان پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں اس میں عفو کی تکرار ہے جس کو اس کی اہمیت واضح کرنے کے لیے لایا گیا ہے نیز یہ بتایا گیا ہے کہ گو سزا اور انتقام کا دروازہ کھلا ہے مگر نیکی و فضیلت کی راہ عفو و درگزر ہی کی ہے۔

زیر بحث آیت میں انھوں نے اس نکتہ پر بھی زور دیا ہے کہ قرآن مجید نے برائی کے بدلے میں دی جانے والی سزا کو بھی برائی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا اس سے ظاہر ہے کہ بدلہ میں کیا جانے والا عمل حسن نہ ہوگا، سیئہ ہوگا جس کا دروازہ اس لیے باز رکھا گیا ہے کہ اس سے بھی زیادہ برائیاں ظہور میں نہ آئیں، دوسری جانب معاف کرنے والے کے لیے اَصْلَحَ (سنوارنے والا) کا لفظ آیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بگاڑ کو سنوارنے والے اصلاً وہ لوگ ہیں جو بدلے کی جگہ عفو و درگزر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ (ص۱۱۰ و ۱۱۱)

قرآن مجید کے زواجر و قوارع آخر میں مولانا قرآن مجید کے زواجر و قوارع کے متعلق بعض اصولی باتیں بیان کرکے اس شبہ کو دور کرتے ہیں کہ جب اس کی تمام تعلیم کا اصل اصول رحمت ہی ہے تو اس نے اپنے مخالفین کی نسبت زجر و توبیخ کا سخت پیرایہ کیوں اختیار کیا؟ مولانا کو یہ تسلیم ہے کہ قرآن مجید نے مخالفوں کے لیے شدت و غلظت کا اظہار کیا ہے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ مخالفین کی ایک قسم وہ ہے جن کی مخالفت محض اختلاف فکر و اعتقاد کی ہے، ان کی مخالفت معاندانہ اور جارحانہ نوعیت کی نہیں ہوتی، ان مخالفین کے بارے میں وہ پورے وثوق کے ساتھ

کئے ہیں کہ صفاتِ قرآن میں ان کے لیے شدت و غلظت کا ایک لفظ بھی نہیں ملتا، سختی کا اظہار ان مخالفین کے لیے کیا گیا ہے جن کی مخالفت بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی جارحانہ معاندت تھی وہ کہتے ہیں کہ اصلاح و ہدایت کی کوئی تعلیم بھی ان سے گریز نہیں کرسکتی، ان مخالفوں کے ساتھ اگر نرمی و شفقت کا برتاؤ کیا جائے تو یہ انسانیت کے لیے نہیں ہوگا، ظلم و شرارت کے لیے ہوگا جو مولانا کے خیال میں کبھی رحمت کا معیار نہیں ہوسکتا کہ وہ ظلم و فساد کی پرورش کرے، قرآن مجید نے صفاتِ الٰہی میں رحمت کے ساتھ عدالت کو بھی جگہ دی ہے اور سورۂ فاتحہ میں ربوبیت و رحمت کے بعد عدالت ہی کی صفت جلوہ گر ہوئی ہے اس لیے قرآن مجید رحمت سے عدالت کو الگ نہیں کرتا بلکہ اسے رحمت کا عین مقتضا بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ انسانیت کے ساتھ رحم و محبت کا برتاؤ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ظلم و شرارت کے لیے سختی کا رویہ اختیار کیا جائے چنانچہ حضرت مسیحؑ کو بھی اپنے زمانے کے مفسدوں کو "سانپ کے بچے" اور "ڈاکوؤں کا مجمع" کہنا پڑا۔

کفر محض اور کفر جارحانہ | مولانا بتاتے ہیں کہ قرآن مجید میں کفر انکار کے معنی میں آیا ہے جو دو طرح کا ہوتا ہے، (صلا۱۱) انکارِ محض اور انکارِ جارحانہ انکارِ محض کا مفہوم ان کے نزدیک یہ ہے کہ ایک شخص قرآن مجید کی تعلیم اس لیے قبول نہیں کرتا کہ وہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یا اس میں طلب صادق نہیں ہے یا وہ اپنی اختیار کردہ راہ پر قانع اور مطمئن ہے۔ (صلا۱۱)

جارحانہ انکار سے وہ اس کد و ضد کو مراد لیتے ہیں جو بڑھ کر بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کرلیتی ہے، اسطرح کے مخالفین کے بارے میں

مولانا بتاتے ہیں کہ ان کے اندر بغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنی زندگی اور اس کی ساری قوتوں کے ساتھ تمہاری ہلاکت و بربادی کے درپے ہو جاتا ہے، اچھی باتوں کو بھی جھٹلا دیتا ہے اور اچھا سلوک کرنے پر بھی اذیت کے درپے رہتا ہے، روشنی کو تاریکی سے بہتر کہنے پر وہ کہے گا کہ تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں، کڑواہٹ سے مٹھاس کو اچھی کہا جائے تو وہ کہے کڑواہٹ ہی میں دنیا کی سب سے بڑی لذت ہے، قرآن مجید نے اسی حالت کو انسانی فکر و بصیرت کے تعطل سے تعبیر کیا ہے :-

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ	ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں
بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ	ان کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں
بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ	ان کے پاس کان ہیں مگر سنتے نہیں
بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ	وہ ایسے ہو گئے ہیں جیسے چارپائے۔
هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ	نہیں، بلکہ چارپایوں سے بھی زیادہ
الْغَافِلُونَ (۷ : ۱۷۹)	کھوئے ہوئے، بلاشبہ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں ڈوب گئے!

مفسرین اسی کو کفر جحود کہتے ہیں، مولانا کہتے ہیں کہ قرآن مجید کے زواجر و قوارع اسی نوعیت کے مخالفین کے لیے آئے ہیں۔ (ص۱۱۲) مولانا کے تجربہ کے مطابق سچائی کی دعوت کے سلسلے میں تین رویے ہوتے ہیں۔

(۱) کچھ لوگ اسے قبول کر لیتے ہیں (۲) کچھ انکار کرتے ہیں (۳) ایک گروہ اس کے خلاف طغیان و جحود اور ظلم و شرارت کی جتھا بندی کر لیتا ہے،

مولانا فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے ظہور کے وقت بھی یہ تینوں جماعتیں تھیں، پہلی جماعت کو اس نے اپنی آغوش تربیت میں لے لیا، دوسری کو دعوت و تذکیر کا مخاطب کیا، تیسری کے ظلم و طغیان پر حسب حالت و ضرورت زجر و توبیخ کی، اگر لب و لہجہ کی اس سختی کو رحمت کے خلاف سمجھا جائے تو بے شک قرآن ایسی رحمت کا قائل و معترف نہیں (ص۱۱۱)

مولانا کے خیال میں قرآن مجید کے نزدیک دین حق کے معنوی قوانین کائنات فطرت کے عام قوانین سے الگ نہیں ہیں اور فطرت کائنات کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے فعل و ظہور کے ہر گوشہ میں گو سرتاسر رحمت ہے لیکن رحمت کے ساتھ عدالت اور بخشش کے ساتھ جزا کا قانون بھی رکھتی ہے اس لیے انسان کی جس مزعومہ رحمت سے فطرت کا خزانہ خالی ہے وہ اسے قرآن مجید کے آستین و دامن میں بھی نہیں مل سکتی۔

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (۳۰:۲۹)	اللہ کی فطرت، جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے، اللہ کی بناوٹ میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی، یہی (اللہ کی ٹھہرائی ہوئی فطرت) سچا اور ٹھیک ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر انسان ایسے ہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔

قرآن مجید میں غور کرنے سے منکروں کے معاملہ میں اس کی سختی کی یہی حقیقت سامنے آتی ہے (ص۱۱۳)

داراشکوہ کے عارفانہ دعوے

از

ڈاکٹر عبدالرب عرفان کاظمی

مغل تاجدار شاہجہاں کے خلف ارشد اور نامزد ولیعہد سلطنت سلطان محمد داراشکوہ نے اپنی ایک غزل میں کہا ہے:

زشاگردی بتنگ آمد دل من — زبہر حق مرا استاد سازید[1]

(شاگردی سے میرا دل اُکتا گیا ہے، خدا کے لیے تم مجھے استاد بنا دو۔)

بادی النظر میں اس پر ایک لطیف شاعرانہ مضمون کا گمان ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت یہ عارف کامل اور واصل الی الحق بزرگ کی حیثیت سے شہرت پانے کی اس شدید خواہش اور دلنشیں تمنا کا اظہار ہے جو داراشکوہ کے دل میں شاہ میانمیر (متوفی ۱۰۴۵ھ) سے دو ملاقاتوں (۷، شوال ۱۰۴۳ھ اور اواسط شعبان ۱۰۴۴ھ) کے بعد پیدا ہوئی اور اس وقت تک اسکے سینے میں مچلتی رہی جب تک اس کے خوشامدی مصاحبوں اور اس زمانے کے بعض مصلحت کوش مشائخ نے اسے یہ باور نہ کرا دیا کہ وہ معرفت کے درجۂ کمال پر فائز ہو چکا ہے اور اب اسے روحانی اور باطنی تربیت کے لیے کسی پیر و مرشد کی حاجت نہیں رہی۔ اس مرحلے پر اس نے "شاگردی" ترک کر کے "استادی" اختیار

---

[1] دیوان داراشکوہ مرتبہ احمد نبی خاں، ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور، ص ۳۳۔

کھلی اور اپنے عارف کامل اور صاحب کشف و کرامات ہونے کے[1] اعلان و اشتہار کی غرض سے اپنی نگارشات میں ایسے ایسے حیرت انگیز اور بلند بانگ دعوے کیے ہیں کہ عقل حیران اور خامہ انگشت بدنداں ہے۔ دارا کے گوناگوں نوعیت کے عارفانہ اور موحدانہ دعووں پر تبصرہ اور ان کا تجزیہ کرنے سے قبل اس کے کردار کی روشنی میں ان محرکات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جو اس کی فکری کج روی اور "طرح حرم" پر اس کی بت خانہ سازی کی کوشش کے ذمہ دار رہے ہیں۔

کردار | دارا شاہجہاں کو بے حد عزیز تھا کیونکہ وہ متواتر تین بیٹیوں کی ولادت کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں تمہزاران نذر و نیاز درخواست پسر" کے بعد پیدا ہوا تھا[1]۔ چنانچہ شاہجہاں نے اپنی پدرانہ شفقت و محبت کا تمام تر سرمایہ اس پر لٹا دیا۔ اسے موقع بموقع مناصب و خطابات عطا کیے مگر کسی مہم پر مامور کیے بغیر۔ یکے بعد دیگرے چار صوبوں کی نظامت بھی تفویض کی لیکن اسے اپنی نگاہوں سے دور کیے بغیر۔ صوبوں کے انتظامی امور نائبوں کے توسط سے انجام پاتے رہے۔ نتیجۃً دارا عسکری اور انتظامی تجربوں سے محروم رہ گیا۔ وقت کی فراوانی اسے موقع شناسوں، تملق شعاروں اور مفاد پرستوں کی صحبت میں لے گئی۔ ان حالات کے زیر اثر وہ خود بینی، خود ستائی، خوشامد پسندی، بددماغی، تلون مزاجی اور غرور و نخوت جیسی اخلاقی کمزوریوں کا شکار ہو گیا[2]۔ مخلص بہی خواہوں کی نصیحتیں اسے گراں گزرتیں۔ برنیر کے بقول وہ نصیحت

---

[1] سفینۃ الاولیا، داراشکوہ، مطبع نولکشور کانپور: ص ۷ و [2] خافی خاں (بقیہ ص ۲۶۵ پر)

کرنے والوں کا ذکر انتہائی حقارت آمیز لہجے میں کیا کرتا تھا[۱]۔ جلیل القدر امرا اس کی تند خوئی اور بد مزاجی سے نالاں تھے۔ بایں ہمہ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ ہر شخص اس سے محبت اور اس کا احترام کرتا ہے[۲]۔ شاہجہاں کو علم ہی نہیں، احساس بھی تھا کہ دارا "سامان تجمل و صولت" رکھنے کے باوجود "عدوی نیکوان و دوست بدان" واقع ہوا تھا[۳]۔

دارا کی ذات میں اعلا ظرفی کا زبردست فقدان تھا۔ وہ اپنی بعض معمولی سی کامیابیوں کی تشہیر کے لیے ایسے اقدامات کر گزرتا تھا جو خود اس کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوتے تھے۔ اسے صرف اپنی انا کی تسکین سے غرض تھی اور اس کا وافر سامان اس کے ان خود غرض مصاحبوں اور حاشیہ نشینوں کی تملق شعاریوں میں دستیاب تھا جو اسے "کامل" کہہ کر خطاب کرتے تھے[۴]۔

دعووں کے محرکات اس سلسلے میں انتہائی افسوسناک بات یہ تھی کہ اس زمانے کے بعض مصلحت کوش مشایخ جو دارا کی اس کمزوری کا پورا علم رکھتے تھے، اسے عارف کامل، حقیقت شناس موحد اور صاحب کشف و کرامات ہونے کا مکمل تاثر دے رہے تھے، ان کی موقع شناس نگاہیں دارا کو اس کے دنیاوی جاہ و اقتدار

(بقیہ ص ۲۶۶) نے محاصرۂ قندھار (۱۰۶۳ھ) کے جو واقعات بیان کیے ہیں ان سے مذکورہ اخلاقی کمزوریوں کے علاوہ اس کا توہم پرست اور بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے منتخب اللباب جلد اول، ص ۲۰۲ تا ۲۰۴، [۱] ٹریولس ان مغل امپائر (ترجمہ کانسٹبل) ص ۶ [۲] اسٹوریا ڈو موگور، جلد اول، منوچی: ص ۲۲۲ [۳] رقعات عالمگیری، نولکشور کانپور ۱۸۸۵ء ص ۴۲ [۴] سکینۃ الاولیا، مقدمہ سید محمد رضا جلالی نائینی، (تہران)، ص چہل و چہار۔

کے ساتھ اپنے عقاید و نظریات کی ترویج و اشاعت کے ایک موثر آلۂ کار کی شکل میں دیکھ رہی تھیں۔ ممکن ہے بعض قارئین اس معروضے کو الزام تراشی کا نام دیں لہذا اس عہد کے چند مشایخ کے بیانات ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

دارا کے ہمعصر صوفیوں میں ایک شاہ محمد دلربا تھے۔ ان سے دارا کی مراسلت تھی۔ شاہ صاحب کے نام دارا کے لکھے ہوئے جو چند خطوط زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہ گئے ہیں ان سے علم ہوتا ہے کہ شاہزادے کو شاہ صاحب سے ملاقات کرنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ ایک خط میں اشتیاق دید کے اظہار کے ساتھ از روئے انکسار اس نے خود کو "بندۂ شما" لکھ دیا۔ اس کے جواب میں شاہ صاحب نے کیا فرمایا[1] دارا کے جواب الجواب سے ماخوذ درج ذیل عبارت میں ملاحظہ فرمائیں:

"این ذرہ چہ لایق آن کہ آن شاہ — یہ ذرہ اس لائق کہاں کہ محققوں کے
محققان و عین الرحمٰن[2] این را بستایند — بادشاہ اور عین الرحمٰن[2] اسکی تعریف
و در بارۂ این فقیر فرمایند: — کریں اور اس فقیر کے بارے میں فرمائیں:
چون تو گفتی بندۂ مومن — جب تم نے خود کو میرا بندہ کہا تو میری ہنسی
از عرش بگذرد خندۂ من — آسمان سے پرے جانے لگی۔
ای در صفت ذات تو حیران کہ و مہ — اے کہ تیری ذات کی توصیف میں
از جملہ جہان خدمات درگاہ تو بہ"[3] — ہر چھوٹا بڑا حیران ہے ساری دنیا سے

[2] عین کثیر المعانی لفظ ہے۔ یہاں آنکھ، چشمہ، ذات، اصلیت اور نفس مراد لیے جا سکتے ہیں۔ دارا شکوہ کا منشاء طبع کے پیش نظر غالب ہے کہ اس نے "عین الرحمٰن" بعینہٖ رحمٰن" یا "عین ذات حق" مراد لیا ہوگا۔ [3] رقعات عالمگیر، جلد اول، مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی، ص ۲۱۹۔

صرف تیری بارگاہ کی خدمت اچھی ہے

اسی طرح شیخ محب اللہ الٰہ آبادی بھی، جو وسیع المشرب اور آزاد خیالی کے لیے مشہور تھے، موقع بموقع دارا شکوہ کے عارفانہ پندار کو بالیدگی عطا کرتے رہے ہیں۔ دارا کو مراسلت کے ذریعے ان سے رابطہ قائم کرنے کا موقع ۱۰۵۵ھ میں ہاتھ آیا۔ اس سال اسے الٰہ آباد کی صوبہ داری عطا ہوئی۔ باقی بیگ نامی امیر کو اس کا نائب بنا کر وہاں بھیجا گیا[1]۔ دارا نے اسی کے توسط سے سولہ مختلف النوع سوالات پر مشتمل ایک مراسلہ شیخ کے پاس بھیجا۔ اس کا بارھواں سوال تھا:

"از تربیت روح معرفت تمام حاصل گردد یا نہ؟[2]" روح کی تربیت سے کامل معرفت حاصل ہوتی ہے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب کا آغاز شیخ نے اس فقرے سے کیا:

"از موحد محقق ایں استفسار بس عجب است[3]" ایک حق آگاہ موحد کی جانب سے یہ سوال بڑا تعجب خیز ہے۔

دارا شکوہ جیسے خوشامد پسند اور بزعم خود "عارف کامل" کے لیے یہ فقرہ بھی کم طمانیت بخش اور سرور انگیز نہ رہا ہوگا، مگر اس کے بے محابا اور بلند بانگ دعووں کے محرکات میں سب سے توانا وہ مجہول اقوال و بیانات ہیں جنھیں شاہ میاں میر کے بعض مریدوں نے ان سے منسوب کر کے دارا شکوہ تک پہنچایا اور اس نے اپنے نام نہاد بلند عارفانہ مقام کے اظہار و اشتہار کی غرض سے ان جھوٹے اقوال و بیانات کو

---

[1] بادشاہ نامہ، جلد دوم، عبدالحمید لاہوری: ص ۴۲۴ [2] رقعات عالمگیر، جلد اول، مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی: ص ۳۲۵ [3] ایضاً: ص ۳۲۸۔

اپنے مولفات میں نقل کر دیا۔ اس سلسلے میں بطور خاص توجہ طلب اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شاہ میاں میر سے منسوب اقوال و بیانات کے صرف پانچ راویوں ـ ملا صالح، شیخ احمد، حاجی محمد بنیانی، خواجہ بہاری اور شیخ جلال واحد ـ کے نام داراشکوہ نے سکینۃ الاولیا میں تحریر کیے ہیں۔ بعض موارد پر کسی راوی کے حوالے کے بغیر کچھ باتیں اس طرح لکھی ہیں کہ ان پر شاہ میاں میر سے براہ راست مسموع ہونے کا گمان گزرتا ہے درآں حالیکہ اسے شاہ میاں میر سے ملاقات کے صرف دو موقعے نصیب ہوئے۔ پہلا، ۱ شوال ۱۰۴۴ھ کو اور دوسرا اواسط شعبان ۱۰۴۴ھ میں[۲]۔ یہ نکتہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ شاہ میاں میر سے اس کے بیعت ہونے کا ثبوت نہ اس کی نگارشات سے ملتا ہے نہ کسی اور ماخذ سے۔ اب اس پس منظر میں دارا کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں:

"و حضرت میاں جیو در بارۂ این	حضرت میاں جیو اس سراپا اخلاص
مرید تمام اخلاص کامل العقیدت	کامل العقیدت مرید سے بے انتہا
بی نہایت شفقت و عنایت	شفقت اور بے پایاں عنایت
عنایت داشتند۔ چنانچہ روزی	کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چنانچہ
بیاران مخصوص و مریدان خاص	ایک دن انھوں نے ملا صالح،
خود مثل ملا صالح و شیخ احمد	شیخ احمد، میاں حاجی محمد بنیانی
و میاں حاجی محمد بنیانی و غیرہم	وغیرہ جیسے اپنے خاص یاروں اور
فرمودند کہ چنانچہ من ہمیشہ متوجہ	مریدوں سے فرمایا کہ جس طرح میں

---

[۱] سکینۃ الاولیاء، داراشکوہ، مرتبہ دکتر تاراچند و سید محمد رضا جلالی نائینی، تہران: ص ۸۴ [۲]

بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم، عبدالحمید لاہوری: ص ۱۴۳؛ منتخب اللباب جلد اول، خافی خاں: ص ۵۰۲

احوال فلانی (دارا) ام، شما نیز	فلاں (دارا) کے حال کی طرف
پیوستہ متوجہ حال او باشید۔ اگر	متوجہ رہتا ہوں تم بھی رہا کرو۔
شمایان از دروی بگردانید،	اگر تم نے اس سے روگردانی کی
از خدای خود روگردان شدہ	تو اپنے خدا سے روگردانی کے مرتکب
باشید[1]	قرار پاؤگے۔

اس نحو، گمراہ کن بلکہ کفر و شرک آمیز تعلیم کا بظاہر کوئی راوی نہیں لیکن اسی قبیل کی چند روایتیں جو راویوں کے حوالے سے نقل کی گئی ہیں، غمازی کرتی ہیں کہ منقولہ بالا روایت بھی کسی راوی کے توسط سے دارا تک پہنچی ہوگی۔ اس قیاس کی تائید میں سکینۃ الاولیا سے صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ دارا ایک جگہ لکھتا ہے:

"میاں شیخ عبدالواحد میفرمودند	میاں شیخ عبدالواحد فرماتے تھے کہ وہ
کہ گاہی بیاران خود امر میکردند	(میاں میر) کبھی کبھی اپنے مریدوں کو حکم
کہ صورت فلانی را تصور نمودہ	دیتے تھے کہ فلاں (یعنی دارا) کی صورت
متوجہ شدہ بنشینید۔ چنانچہ	کو تصور کیے ہوئے (اس کی طرف) متوجہ ہو کر
روزی بمن نیز این حکم کردند[2]	بیٹھو۔ چنانچہ ایک روز مجھے بھی یہ حکم دیا۔

ایک مورد پر یوں رقمطراز ہے:

"میاں خواجہ بہاری فرمودند	میاں خواجہ بہاری نے فرمایا
کہ ما ہرگز ندیدیم کہ حضرت میانجیو	کہ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ حضرت
تسبیح بدست گرفتہ باشند	میانجیو نے تسبیح ہاتھ میں لی ہو۔

---

[1] سکینۃ الاولیا، چاپ تہران: ص ۳-۵۲ [2] ایضاً: ص ۵۳۔

روزی دیدیم تسبیحی بدست دارند و چیزی میخوانند - عرض کردیم که حضرت هرگز تسبیح بدست نگرفته اند - این برای چیست و کیست؟ نام این کمترین مریدان را گرفته فرمودند که چون فلانی کوفتی دارد برای او میخوانم[1]

ایک روز ہم نے دیکھا کہ انکے ہاتھ میں تسبیح ہے اور وہ کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ہم نے عرض کیا کہ حضرت نے کبھی تسبیح ہاتھ میں نہیں لی۔ یہ ہاتھ میں تسبیح، کس لیے اور کس کے لیے ہے؟ انھوں نے اس کمترین مرید کا نام لیکر فرمایا کہ چونکہ فلاں بیمار ہے، لہذا اسکیلئے پڑھ رہا ہوں[1]

یہ اور اس قسم کی تمام روایتیں مجعول اور ناقابل اعتبار ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ شاہ میانمیرؒ کے "یاران خاص" نے داراشکوہ کو یہ تاثر دینے کی غرض سے کہ شاہ میانمیر اس کی ذات میں ایک عارف کامل کو شناخت کر چکے تھے، یہ روایتیں وضع کر کے اس سے بیان کی ہوں گی۔ گویا وہ اس تدبیر سے اسے شاہ میانمیر کے خلیفہ ملا شاہ (متوفی ۱۰۷۹ھ) سے بیعت ہونے کی درپردہ ترغیب دے رہے تھے تاکہ ان کے مسلک کو شاہزادے کی براہ راست تائید اور سرپرستی حاصل ہو جائے۔ ملا شاہ کے بعض صریح بیانات بھی اس خیال کے موید ہیں[2]

---

[1] سکینۃ الاولیا، چھاپ تہران، ص ۲۵

[2] داراشکوہ لکھتا ہے کہ ملا شاہ نے اپنے ایک مرید ملا سنگین سے کہا: میں نے بہتوں کو شغل کا درس دیا اور ان سے امید کی کہ وہ طریقۂ قادریہ کو رواج دیں گے مگر ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی دنیاوی کام میں مشغول ہوگیا۔ الحمد للہ میں اس جوان (مراد داراشکوہ) سے امید رکھتا ہوں کہ وہ ہمارے طریقے کو رواج دے گا۔ (سکینۃ الاولیا، ص ۱۰۹) ملا محمد سعید سے بھی اسی طرح کی بات کہی تھی۔

ملا شاہ کی توقع کے عین مطابق داراشکوہ نے ۱۲ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کی شب میں ان سے پہلی بار ملاقات کی اور بیعت ہو گیا۔ اسی رات اسے وہ سب کچھ مل گیا جس کے حصول کی خاطر طالبانِ حق برسوں ریاضت و مجاہدہ کرتے ہیں[1]۔ یہ بیان واقعہ نہیں، داراشکوہ کا ایک کھوکھلا دعویٰ ہے جو اس کے شیوۂ لاف و گزاف کا ایک ادنیٰ سا مظہر ہے۔ شاہزادے کی اس جسارت کی ذمہ داری بڑی حد تک ملا شاہ پر بھی عائد ہوتی ہے۔ قرائن پتہ دیتے ہیں کہ ملا شاہ اس متوقع ملاقات سے پہلے ہی شاہزادے کی فطرت، افتادِ طبع اور نفسیاتی کمزوریوں کے بارے میں خاصی واقفیت حاصل کر چکے تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ شاہی محلوں میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے والا شاہزادہ عارفِ کامل کی حیثیت سے شہرت کا طالب ہے۔ انھیں احساس رہا ہوگا کہ وہ اس راہ کی صعوبتیں برداشت نہیں کر پائیگا اور اسی سبب سے یہ اندیشہ بھی لاحق رہا ہوگا کہ مبادا مجاہدے کی سختیاں اسے حق جوئی کا ارادہ فسخ کرنے پر مجبور کر دیں۔ لہذا انھوں نے اس کے لیے ایک خصوصی رعایت والی آسان سی صورت نکال لی اور اسے عمومیت کا رنگ دیکر فرمایا:

طریقۂ حضرت میانجیو ما بسیار[1]	ہمارے حضرت میانجیو کا طریقہ بہت
شاق بود و طالب محنت بسیاری	سخت تھا اور طالب کو بہت محنت کرنی پڑتی تھی
کشید و بی ترک و تجرید نمی شد۔	اور بات ترک و تجرید کے بغیر نہیں
ما بر مریدان خود بسیار آسان	بنتی تھی۔ ہم نے اسے اپنے مریدوں

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۷۰۔

کردیم و عوض ہمہ ما ریاضت	کے لیے بہت آسان کر دیا اور
کشیدہ ایم و ایشان را از ریاضت	سب کے عوض خود ریاضت کر لی
شاقہ فارغ ساختہ ایم"۔[1]	ہے اور انھیں ریاضت شاقہ سے
	فارغ کر دیا ہے۔

ایک شاہزادے کی باطنی تربیت کی اس سے آسان اور بہتر صورت اور کیا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ملا شاہ کے "فیضان توجہ" سے قلیل مدت میں اس نے وہ سب کچھ پالیا جس کی اسے طلب تھی۔ مگر ملا شاہ کی مصلحت کوشیوں کو صرف اسی پر اکتفا کرکے بیٹھ رہنا منظور نہیں تھا۔ وہ شاہزادے کو پوری طرح ملا شاہ کے قابو میں دیکھنا چاہتی تھیں اور اس مقصد سے انھیں اس کی نفسیاتی کمزوریوں کے استحصال کے لیے نت نئی تدبیریں بھاتیں۔ چنانچہ ملا شاہ نے اسے یہ باور کرانے کی خاطر کہ وہ "درجۂ کمال" کو پہنچ چکا ہے اور منصب رشد و ہدایت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری صلاحیت اور استعداد اس میں پیدا ہو چکی ہے، اس سے بتکرار فرمایش کی کہ وہ ان کے مریدوں کی باطنی تربیت کرے کیونکہ اس کی عقل سبھوں کی عقل سے زیادہ ہے۔[2] لیکن دارا کو اپنے پیر و مرشد کا یہ حکم بجا لانے میں تامل رہا۔ ایک دن انھوں نے بہت اصرار کے ساتھ اسے "رخصت ارشاد و اجازت ہدایت عطا فرمائی"۔[3] اس نے اپنے تئیں سوچا کہ وہ اتنا عظیم کام انجام دے بھی پائے گا یا نہیں اور اس کی تربیت سے کسی کی "گشایش" ہو گی بھی یا نہیں؟ لیکن ملا شاہ کے بہت اصرار کرنے پر وہ رضامند ہو گیا۔ بعض علما جو اس کے آشناؤں میں سے تھے، اسے

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۶۵، [2] ایضاً: ص ۷۰، [3] ایضاً: ص ۷۱۔

ملامت کرنے لگے۔ تذبذب کے عالم میں اس نے قرآن مجید سے استخارہ کیا۔

درج آیتیں برآمد ہوئیں:

لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا	ہر امت کے لیے ہم نے مقرر کر دی
هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ	ایک راہ بندگی کی کہ وہ اسی طرح
فِي الْأَمْرِ وَادْعُ	کیا کرتے ہیں بندگی، سوان (مومنوں)
إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ	لوگوں کو چاہیے کہ نزاع نہ کریں
هُدًى مُّسْتَقِيمٍ وَإِن	اس امر میں اور تو ان کو بلائے جا
جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ	اپنے رب کی طرف۔ تو بے شبہ سیدھے
أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ	راستے پر ہے اور اگر یہ لوگ تجھ سے
	جھگڑتے رہیں تو تو ان سے کہہ دے
	کہ اللہ خوب جانتا ہے تمھارے
	کاموں کو۔

دارا نے جب اس کا ذکر ملا شاہ سے کیا تو انھوں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

بسیار خوب شد، اجازتی از	بہت اچھا ہوا تو نے خدائے پاک
حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ نیز	و برتر سے بھی اجازت حاصل کر لی
حاصل کردی، مبارک است	تجھے مبارک ہو۔
بتو ہے	

لہ سکینۃ الاولیا، ص ۵-۴۳ (قرآن کریم، سورہ ۲۲، آیات ۶۷ اور ۶۸) ۲ے سکینۃ الاولیا (قلمی) ص ۵۲ا۔

اپنے پیر و مرشد کے امتثال امر میں ان کے بعض مریدوں کی باطنی تربیت کی ذمہ داری قبول کرنے کا وافر ثبوت ملا شاہ اور دارا شکوہ دونوں کی تحریروں سے فراہم ہوتا ہے۔ ملا شاہ اپنے ایک مکتوب میں اسے تاکید کرتے ہیں: "ان لوگوں کے حالات سے خوب باخبر رہو جو معرفت کے درس کے لیے تمھاری بارگاہ میں بھیجے گئے ہیں"[1] ایک مراسلے میں لکھتے ہیں: "دربار حقیقت میں باریاب ہونے والوں کو بہت سی دعائیں۔ تم ان کی خبر گیری کیا کرو کہ وہ سب تمھارے حوالے کیے گئے ہیں"[2] دارا خود بیان کرتا ہے کہ ایک دن ملا شاہ نے اس[3] کہا:

"کسانی کہ درایں ایام بما	جو لوگ ان دنوں ہم سے وابستہ
پیوستہ اند، ہمہ را بتو حوالہ	ہوئے ہیں، ہم ان کو تیرے حوالے
می کنیم و ہمہٗ آنہا نیز خبر کردہ	کرتے ہیں اور ہم نے ان سبھوں کو
ایم، از احوال آن جماعت	خبر بھی کر دی ہے، تو اس جماعت
خبردار خواہی بود"[4]	کی خبر گیری کرے گا۔

داراشکوہ کی ہمشیرۂ کلاں شاہزادی جہاں آرا بیگم کو بھی تصوف سے علماً اور عملاً دلچسپی تھی۔ وہ ملا شاہ سے غائبانہ بیعت تھی۔ دبستان مذاہب کے مولف کے بقول اس نے ملا شاہ کے فرمان پر "حضور دل[5] کے ساتھ سلوک کی منزلیں طے کر کے "معرفت کامل" حاصل کی تھی[6]" باطنی تربیت کے دوران بعض مسائل کی وضاحت کے لیے وہ بزبان قلم ملا شاہ سے رجوع کرتی تھی۔ ملا شاہ بھی اس کے

---

[1] سکینۃ الاولیا (تہران): ص ۴۳ [2] ایضاً: ص ۱۸۱ [3] ایضاً: ص ۸۸ [4] دبستان مذاہب، مطبع نولکشور کانپور ۱۹۰۴ء: ص ۳۰۹۔

مکاتیب کا جواب دیتے تھے۔ دارا شکوہ نے سکینۃ الاولیا میں ان کے دو خطوط بنام جہاں آرا نقل کیے ہیں۔ ایک خط میں توحید کا مفہوم اجمالاً بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"توحید ذات اللہ کہ سرمایۂ جمیع	اللہ کی ذات کی توحید جو تمام
سعادات است، باو (دارا شکوہ)	سعادتوں کا سرمایہ ہے، اس سے
گفتہ شد، و این وقت مبارک	(دارا سے) بیان کر دی گئی اور یہ مبارک
(کہ) سر دفتر جمیع مبارکات است،	وقت جو تمام برکتوں کا حاصل ہے،
اورا دست داد..... القصہ	اس نے پالیا..... قصہ مختصر یہ کہ اس
آنکہ از برادر کسب کنید۔ اورا	(یعنی توحید) کا اکتساب تم اپنے بھائی سے
خدای تعالیٰ دادو داو مقبول	کرو۔ خدا نے اسے (یہ دولت) بخشی ہے۔
ہمۂ بزرگان حال و گذشتہ	وہ حال اور ماضی کے تمام بزرگوں میں
شد"[1]	مقبول ہو گیا۔

دوسرے خط میں شاہزادی کو تاکید فرماتے ہیں:

"قدر برادر عزیز خود را بسیار	تو اپنے عزیز بھائی کی خوب قدر کر
بدان۔ اگر وجود شریف او نمی	اگر اس کا وجود شریف نہ ہوتا تو
بود، بتو این سعادت نمی رسید	تجھے یہ سعادت نصیب نہ ہوتی....
.... اگر قدر او را ندانی قدر	اگر تو اس کی قدر نہ جانے گی تو ہماری
ما را چہ دانی؟"[2]	قدر کیا جانے گی؟

---

[1] سکینۃ الاولیا (تہران): ص ۰۰-۱۸۶ [2] ایضاً: ص ۱۹۰۔

ایک انتہائی تملق آمیز خط میں دارا شکوہ کو "بادشاہ ظاہری و باطنی" اور "راست گو" جیسے القاب سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ترا از برکت مرشد آن راہ بہ بعیت	تجھے مرشد کی برکت سے بعیت نبی
نبی بدست افتادہ است"[1]	کی وہ راہ ہاتھ آگئی ہے۔

ملا شاہ کے ان صریح بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دارا شکوہ کو "عارف کامل" اور منصب ارشاد کا سزاوار ہونے کا مکمل تاثر دے رہے تھے اور اس کے پندار حق جوئی و حق شناسی کی بالیدگی کا ہر ممکنہ سامان فراہم کر رہے تھے۔ وہ کس درجے کے مصلحت کوش اور دارا شکوہ کے فطرت شناس تھے اس کا اندازہ انکے درج ذیل بیانات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ پہلے بیان کا پس منظر یہ ہے کہ دارا نے ملا شاہ کو ان کے دو مریدوں کے بارے میں اپنی رائے لکھ بھیجی تھی۔ اس کے جواب میں وہ تحریر فرماتے ہیں :

حقا در تم حقا کہ از دو کس و احوال	خدا کی قسم! تم نے دو اشخاص، انکے
ایشان و بی اعتدالی ایشان (کہ)	احوال اور ان کی بے اعتدالیوں کے
نوشتہ بودید، این در صورت	بارے میں، جو لکھا تھا، وہ تمہاری
اشراق و کشف و خوارق عادات	روشن ضمیری اور کشف و کرامات
شما ظاہر شد"[2]	کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اسی خط میں ابوالمعالی نامی اپنے ایک مرید کے بارے میں شاہزادے کو لکھتے ہیں:

"اگر ابو المعالی را باصلاح	اگر تم نے ابو المعالی کی اصلاح

---

[1] سکینۃ الاولیا (ترجمہ)، ص ۱۹۱ [2] ایضاً: ص ۱۸۳۔

آوردہ باشید، این ہم کرامات شماست[1]	کرلی ہوگی تو یہ بھی تمھاری کرامت ہوگی۔

ایک فاسق و فاجر، کج فکر اور ریاکار کو اس کے روشن ضمیر اور صاحب کشف و کرامات ہونے کا یقین دلا دینا خود ملا شاہ کی مہتم بالشان کرامت ہے۔ آخر وہ کون سی مصلحت تھی جو انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی؟ اس سوال کا واضح جواب خود ملا شاہ کے بیانات سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ داراشکوہ لکھتا ہے کہ ایک روز ملا شاہ نے ملا محمد سعید سے فرمایا:

" ما این جوان[2] نظر آن داریم	مجھے اس جوان سے امید ہے کہ وہ
کہ رواج طریقۂ قادریہ نماید	طریقۂ قادریہ کو رواج دے گا اور
و جمع کثیری را ارشاد کنند[3]"	ایک جمع کثیر کی رہنمائی کرے گا۔

ایک جگہ ملا سنگین کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ایک دن ملا شاہ نے ان سے کہا:

" ما بسیاری را مشغول کردیم و	ہم نے بہتوں کو شغل کی تعلیم دی
امیدداشتیم کہ این طریقۂ ما را	اور ان سے امید کی کہ وہ ہمارے
رواج خواہند داد، اما ہر کدامی	طریقے کو رواج دیں گے لیکن
بامری فرو رفتند، الحمد للہ کہ از ان	ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی کام میں
جوان آدمی زادہ امیدوار شدیم	الجھ گیا۔ الحمد للہ ہم اس جوان آدمی
کہ طریقۂ ما را رواج خواہد	زادے سے پر امید ہوئے کہ وہ

---

[1] ایضاً: ص ۴۰۔ [2] ملا شاہ داراشکوہ کو اسکا نام لے کر خطاب نہیں کرتے تھے۔ اسے "جوان" یا "آدمی زادہ" کہتے تھے۔ (سکینۃ الاولیا: ص ۷۰)۔ [3] سکینۃ الاولیا (تہران): ص ۱۷۹۔

داد[1] ہمارے طریقے کو رواج دے گا۔

ملا شاہ نے اس بات کی صراحت نہیں فرمائی کہ انھوں نے طریقۂ قادریہ کو رواج دینے کی امید داراشکوہ کی کس حیثیت سے وابستہ کی تھی۔ اس وقت کے شہزادے اور مستقبل کے ممکنہ بادشاہ سے یا دل سے دنیا کی دوستی دور ہو جانے کا صرف زبانی دعویٰ کرنے والے بزعم خود فقیر سے؟ ان کی اصل نیت کا بھرم کھولنے کے لیے انہی کے ایک خط (بنام داراشکوہ) کی درج ذیل عبارت کافی ہے:

"دست ما فقیران از تنبیہ کردن	ہم فقیروں کا ہاتھ ان شریر بدبختوں
بدبختان شریر کہ خود را داخل	کو تنبیہ کرنے سے قاصر ہے جنھوں نے
مشرب ما ساختہ اند و آنچہ	خود کو ہمارے مشرب میں داخل
میخواہند میگویند و میکنند، کوتاہ	کر لیا ہے اور وہ جو چاہتے ہیں کہتے
است و شما را بی شک دست	اور کرتے ہیں۔ تم بے شک دست رسا
رساست و ما را فایدہ از آشنائی	کے مالک ہو اور ہمارے لیے
شما بازین دیگر چہ خواہد بود"[2]	تمھاری دوستی کا اس سے اچھا
	فائدہ کیا ہوگا؟

منقولہ بالا اقتباس کے فقرے "دست ما فقیران۔۔ کوتاہ است"۔ اور "شما را بی شک دست رساست"۔ صاف غمازی کر رہے ہیں کہ ملا شاہ نے یہ خط اپنے "صاحبقران ملا"[3] یعنی فقیر بی اندوہ[4] محمد داراشکوہ کو نہیں بلکہ ولی عہد سلطنت

---

[1] سکینۃ الاولیا (تہران): ص ۹۸، [2] ایضاً، ص ۱۹۸، [3] ملا شاہ نے داراشکوہ کی شان میں ایک غزل کہہ کر اس کے پاس بھیجی تھی (سکینۃ الاولیا: ص ۱۷۹) اس کا ایک شعر یہ ہے: (بقیہ ص ۲۸۱)

"شاہزادہ بلند اقبال[1] سلطان محمد داراشکوہ" کو لکھا تھا۔ شاید اسی لیے انھوں نے شاہزادے کو "صاحبقران" سے منسوب نہیں کیا بلکہ اس کے قطعی برعکس "صاحب بیت رسا" کہہ کر اس سے استعانت کی۔ اس خط سے ملا شاہ کی اصل نیت کا پردہ فاش ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے "زمرۂ یاراں" کے تحفظ اور طریقۂ قادریہ کے فروغ کی امید میں ایک منظم منصوبے کے تحت شاہزادے کے ملکی اور سیاسی اقتدار و اختیار کا استحصال کر رہے تھے۔ اگر ملا شاہ کے نوشتہ جات میں داراشکوہ کی بے جا اور غلو آمیز ستایش نہ پائی جاتی تو ان کے اقوال و بیانات کو جو سکینۃ الاولیا کے صفحات میں بکھرے پڑے ہیں ان کے مریدوں کی ذہنی اختراع تصور کیا جا سکتا تھا لیکن ان کا یہ تحریر کرنا کہ وہ اپنے مریدوں کو باطنی تربیت کے لیے داراشکوہ کے سپرد کر رہے ہیں، جہاں آرا کو اپنے بھائی (داراشکوہ) کی قدر کرنے اور توحید کا درس اس سے لینے کی تاکید کرنا اور اسے صاحب کشف و کرامات ہونے کا احساس دلانا ان اقوال و بیانات کے مجعول نہ ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی مزید توثیق ملا شاہ کی عارفانہ زندگی، بالخصوص "تحصیل گشایش" کی داستان سے ہوتی ہے۔

ملا شاہ کی بیان کردہ ان کی "تحصیل گشایش" کی داستان داراشکوہ نے صیغۂ واحد

(بقیہ ص ۲۸۰) صاحبقران اول و ثانی قرین چیست (کذا) داراشکوہ ماشدہ صاحبقران دل (سکینۃ الاولیا: ص ۱۸۰) [2] داراشکوہ کے بیشتر مولفات میں اس کے نام سے پہلے "فقیر بی اندوہ" پایا جاتا ہے۔ [1] شاہزادہ بلند اقبال، داراشکوہ کا پہلا خطاب ہے جو اسے ۱۰۵۲ھ میں ملا تھا۔ (بادشاہ نامہ، جلد دوم؛ عبدالحمید: ص ۳۰۸؛ نیز بادشاہ نامۂ عنایت خاں۔ انگریزی ترجمہ از بیگلی و ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی: ص ۲۹۷)

شکل میں قلمبند کی ہے۔ گویا نطق و سماعت کے درمیان کسی تیسرے کا وجود نہیں تھا۔

اس کا ترجمہ درج ذیل ہے :

"(انھوں نے ملا شاہ نے) فرمایا : میں جب ولایت[1] سے آیا تو تین سال کشمیر میں رہا۔ میرے دل میں طلب الٰہی پیدا ہوئی۔ کسی شیخ کی زیارت کی تمنا میں ہندوستان کی طرف چل پڑا اور لاہور سے گزر کر آگرے کا رخ کیا۔ راستے میں ایک شخص نے حضرت میانجیو (شاہ میانمیر) کا ذکر کیا کہ لاہور میں ایک عارف باللہ ہے جو ترک و تجرید میں درجۂ کمال پر فائز ہے ..... میں واپس لاہور آیا اور حضرت میانجیو کی خدمت میں پہنچا ..... میں ان کی خدمت کرتا رہا لیکن انھوں نے مجھ سے اس قدر بے اعتنائی برتی کہ تین سال تک ان کی توجہ سے محروم رہا۔ تین سال کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا کہاں رہتا ہے ؟ میں نے کہا : مسجد میں۔ فرمایا : مسجد میں قیام نہ کر۔ میں نے مسجد کی سکونت ترک کر دی۔ اس کے بعد فرمایا : کیا کھاتا ہے ؟ میں نے کہا : بازار کی روٹی۔ فرمایا : بازار کی روٹی نہ کھایا کر۔ چونکہ کہیں سے کچھ ملنے کی امید نہیں تھی اس لیے میں نے فاقہ کشی اختیار کر لی۔ آخر کار حضرت میانجیو مجھ پر مہربان ہوئے اور مجھے "مشغول" فرمایا لیکن وفات سے چند سال پہلے انھوں نے اشاروں میں ایک بات کہی جسے میں نے مضبوطی سے گرہ میں باندھ لی۔ ایک رات طلوع فجر سے پہلے مجھے ایک سعادت نصیب ہوئی۔ اس وقت معلوم ہوا کہ یہ اور ہی مقام ہے اور میں نے وہ سب کچھ پا لیا جس کی مجھے خواہش تھی"[2]

بات یہیں ختم ہو جاتی تو اسے ملا شاہ کی سادگی بیان پر محمول اور مسائل کو مرشد

---

[1] مراد ہے ملا شاہ کا وطن بدخشاں [2] سکینۃ الاولیا : ص ۳ ۔ ۱۶۲ ۔

شاہ میانمیر کے فیض تصرف سے تعبیر کیا جاسکتا تھا لیکن اس کے بعد کے واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ "بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر" نہیں دیا گیا' یا پھر "قدح خوار" اس شراب کو جو اسے دی ہی نہیں گئی، اپنے خالی ظرف سے چھلکانے کی اداکاری کرتا رہا۔ اپنی کیفیت خود ملا شاہ نے بیان کی ہے جسے داراشکوہ نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

فارسی	اردو
"حقیقت حال اینست (کہ)	حقیقت حال یہ ہے کہ میرے دل
مرا در دل ذوقی تازہ و شورشی	میں ایک نئے ذوق اور بے اندازہ
بی اندازہ افتادہ و بہزار محنت	وجد و حال کی کیفیت پیدا ہوئی
نماز فجر ادا توانستم کرد و بیتاب	میں بہزار وقت فجر کی نماز ادا کر
گشتہ حاجی صالح را طلب نمودم	سکا اور بیتاب ہو کر حاجی صالح
و باو ظاہر ساختم کہ اینچنین دولتی	کو طلب کیا اور اس پر ظاہر کیا کہ
بمن روی نمودہ، تو چرا ازین	مجھ پر اس طرح کی دولت کا انکشاف
سعادت بی نصیب باشی، بگیر	ہوا ہے، تو اس سعادت سے
آنچہ می توانی و شروع در ایماد	کیوں محروم رہے، جتنا کچھ سے
اشارہ نمودم۔ او را نیز ذوقی	سکے لے اور میں نے ایماد و اشارہ
و شورشی دست داد و در گرفت،	سے بتانا شروع کیا۔ اسے بھی وجد
و یاری دیگر داشتم ملا سنگین نام،	و ذوق کی کیفیت حاصل ہوئی
و این ہر دو مریدان حضرت	ملا سنگین نامی میرا ایک اور رفیق
میانجیو بودند، او را نیز طلبیدہ	تھا۔ یہ دونوں حضرت میانجیو
گفتم آنچہ بحاجی گفتم۔ چون آمادہ	کے مرید تھے، میں نے اسے بھی بلا کر

ومستعد بود، او نیز در گرفت	وہی کہا جو حاجی سے کہا تھا۔ چونکہ وہ
و یافتند آنچہ مدتہا در طلب	آمادہ اور تیار تھا، اس نے بھی (وہ
آن بودند [1]	دولت) پالی اور انھوں نے وہ چیز
	حاصل کر لی جس کے ایک مدت سے
	وہ طالب تھے۔

اس "روداد گشایش" کا نقطۂ عروج ملا شاہ کا یہ بے محابا اور برملا اعلان ہے:

"بہانگ بلندی می گویم کہ مطلب	بہ آواز بلند کہتا ہوں کہ بلند ترین
اعلیٰ را من یافتہ ام و این سعادتی	مقصد کو میں نے پالیا ہے اور یہ وہ
است کہ بمن روی نمودہ [2]	سعادت ہے جو مجھ پر منکشف ہوئی۔

ملا شاہ نے جس "مطلب اعلیٰ" کی تحصیل کا دعویٰ اور "بہ بانگ بلند" اظہار و اعلان فرمایا ہے اس کی حقیقت اور نوعیت کو انھی کے ایک شعر سے قیاس کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے "حصول گشایش" سے برسوں پہلے کہا تھا۔ فرماتے ہیں:

پنجہ در پنجۂ خدا دارم من چہ پروای مصطفیٰ دارم [3]

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۶۳ [2] ایضاً: ص ۱۶۴ [3] تذکرۂ حسینی تالیف میر حسین دوست سنبھلی مطبع نولکشور کانپور، ۱۸۷۵ء: ص ۱۶۶۔ روز روشن میں یہ شعر نقل کر کے محمد اکرام فرماتے ہیں کہ جب ملا شاہ نے یہ شعر کہا تو کشمیر کے علما نے کفر کا فتویٰ دے دیا اور شاہجہاں سے ان پر شرعی حد جاری کرنے کی درخواست کی۔ شاہجہاں نے کشمیر کے صوبہ دار ظفر خاں کے نام فرمان بھی لکھ دیا لیکن داراشکوہ نے مداخلت کرتے ہوئے سفارش کی کہ اس معاملے میں تعجیل سے کام لینے کے بجائے کسی اور بزرگ مثلاً شاہ میاں میر سے استصواب کر لیا جائے۔ بادشاہ مان گیا۔ جب شاہ میاں میر سے (بقیہ ص ۲۸۵ پر)

(میرا ہاتھ خدا کے ہاتھ میں ہے ، پھر مجھے مصطفیٰ کی کیا پروا؟)

ملا شاہ کی اس ہرزہ سرائی سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بزعم خود، معرفت کے اس اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہو چکے تھے جہاں بعض صوفیہ کے بقول عبد و رب کے درمیان سے سارے "حجابات" اٹھ جاتے ہیں[1]

دارا شکوہ کے عارفانہ دعوے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، دارا شکوہ ایک اچھا نقال اور اداکار تھا۔ چنانچہ ایک عارف کامل کی حیثیت سے متعارف اور مشہور ہونے کے لیے اس نے اپنے پیر و مرشد کے اسی خود نمائی اور خودستائی کے فن کا سہارا لیا جس پر وہ کاربند تھے۔ اس اعتبار سے وہ ملا شاہ کا حقیقی جانشین قرار پاتا ہے۔ وہ اپنی عارفانہ زندگی کا آغاز کس شان سے کرتا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

غوث الثقلینؒ سے نسبت ارادت

"این فقیر خود را در سلسلۂ متبرکہ معظمہ قادریہ منتظم گردانیدہ دست در دامن سعادت قطب ربانی، غوث صمدانی، پادشاہ مشائخ، امام ایمہ، پیر دستگیر، شاہ محی الدینؒ

یہ فقیر خود کو مبارک و عظیم قادری سلسلے میں منسلک کر کے قطب ربانی غوث صمدانی، مشائخ کے بادشاہ اماموں کے امام، پیر دستگیر شاہ محی الدین عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کا دامن مبارک تھام کر امید کرتا ہے کہ

(بقیہ ص ۲۸۴) رجوع کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ احوال کے زیر اثر ملا ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جن سے احتراز لازم ہے۔ اس طرح ملا شاہ کی جان بخشی ہوئی۔ (رود کوثر، بحوالہ ص: ۲۴۴)

[1] علامہ ابن جوزی نے ایک بے باک صوفی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "قرآن حجاب ہے، رسول حجاب ہے [illegible] نہیں" (تلبیس ابلیس، قاہرہ، ۱۹۵۰ء: ص ۳۲۴)

عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ	سیدوں کے اس سردار کی برکت
زدہ امیدوار است کہ از برکت	سے کونین کی نجات حاصل کرے
آن سید سادات نجات کونین	اور حق تعالیٰ اپنے اس کمترین بندے
حاصل نماید و حق تعالیٰ این کمینہ	کو ان کے وسیلے سے بخش دے۔
بندہ خود را با ایشان (؟) بخشد[1]	

یہ عبارت دارا کی تالیف سفینۃ الاولیا سے مقتبس ہے جس کی تکمیل (۲۷ رمضان ۱۰۴۹ھ) کے وقت اس کی عمر پچیس سال، چھے ماہ اور اٹھائیس دن تھی۔ اس وقت شاہ میا نمیر کی وفات (۷ ربیع الاول ۱۰۴۵ھ) کو ساڑھے چار سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ان کی وفات کے دن دارا اپنی عمر کے اکیس سال اور آٹھ دن پورے کر چکا تھا۔ قادری مسلک کے اس قدوۂ عارفاں یعنی شاہ میا نمیر سے دارا نے دو بار ملاقات کا شرف حاصل کیا لیکن اس کے باوجود اس کا ان سے بیعت نہ ہونا اور ان کے خلیفہ ملا شاہ کے مریدوں میں شامل ہو جانا ظاہر کرتا ہے کہ اس کے دل میں "بنیان گزار سلسلۂ قادریہ" سے بلاواسطہ عقیدت و ارادت کا رابطہ قائم کرنے کا خیال شاہ میا نمیر کی وفات اور سفینۃ الاولیا کی تکمیل کے درمیانی عرصے میں کسی وقت پیدا ہوا ہو گا۔

ان حقائق کے پس منظر میں اب دارا کے اس بیان پر غور فرمائیں:

"نسبت ارادت این فقیر اگرچہ	اس فقیر کی نسبت ارادت اگرچہ ابتدا
در ابتدا در زمرۂ سگان آستان	سے حضرت غوث الثقلین ابو محمد شاہ
قدسی نشان حضرت غوث الثقلین	محی الدین سید عبدالقادر جیلانی کے-

---

[1] سفینۃ الاولیا، کانپور: ص ۸۵ [2] ایضاً: ص ۲۱۹ [3] سکینۃ الاولیا (تہران) ص ۹۲۔

ابو محمد شاہ محی الدین سید عبدالقادر
جیلانی داخل است، واز آوان
طفولیت تا امروز کہ بہ بیست
وہشت سالگی رسیدہ، در جمیع
احوال و ہمہ اوقات باطناً از
روح مقدس و منور آنحضرت
رضی اللہ عنہ، تربیت یافتہ و
در ہمہ جا و ہمہ وقت مدد و معاونت
نمودہ اند، و در واقعہ با این بندۂ
شرمندۂ خود را زانو بزانو نشاندہ
تربیت فرمودہ اند و امیدوار
است کہ بعد از این نیز در دنیا
و آخرت دستگیر این فقیر باشند[1]
او حضرت پیر دستگیر میانجیو قدس اللہ
سرہٗ در حیات بظاہر کمال عنایت
بر این عاجز داشتند و بباطن نیز

آستان قدسی نشان کے زمرۂ سگاں
میں داخل ہے اور بچپن سے آج تک
کہ اٹھائیس برس کی عمر کو پہنچ چکا ہے
جملہ حالات اور تمام اوقات میں
باطنی اعتبار سے آنحضرت رضی اللہ
عنہ کی مقدس و منور روح سے اس نے
تربیت پائی ہے اور ہر جگہ اور ہر وقت
انھوں نے مدد اور اعانت فرمائی ہے
اور خوابوں میں اپنے اس بندۂ
شرمندہ کو پہلو بہ پہلو بٹھا کر اس کی
تربیت فرمائی ہے اور اسے امید
ہے کہ اس کے بعد بھی دنیا اور آخرت
میں اس فقیر کی دستگیری فرمائیں گے
لیکن حضرت پیر دستگیر میانجیو قدس اللہ
سرہٗ زندگی میں ظاہراً (بھی) اس
عاجز پر انتہائی مہربانی فرماتے تھے

---

[1] سکینۃ الاولیاء کے مرتبین ڈاکٹر تارا چند اور سید محمد رضا جلالی نائینی نے "باشند" تک کی عبارت ایک مکمل پیراگراف کی صورت میں نقل کی ہے اور "او حضرت ..." سے نیا پیراگراف بنا کر ایک طویل جملے کو دولخت کر دیا ہے۔ جملہ موجودہ صورت میں دوسرے پیراگراف کی تیسری سطر میں مکمل ہوتا ہے۔

تربیت این فقیر میکردند و بعد از وفات ہم بطریق اویسی تربیت این مرید می کنند[1]	اور باطناً بھی اس فقیر کی تربیت کرتے تھے اور وفات کے بعد بھی اویسی طریقے سے اس مرید کی تربیت کرتے ہیں۔

"آوان طفولیت" میں حضرت غوث الثقلین سے "نسبت ارادت" استوار کرنے کے اس دعوے کی صداقت جاننے کے لیے شاہ میانمیر سے دارا کی پہلی ملاقات کے اسباب وکوائف سے واقفیت ضروری ہے۔ تقریب ملاقات خود اس نے بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۰۴۳ھ میں اسے ایک ایسا عارضہ لاحق ہوا جس کے علاج میں اطبا ناکامی سے دوچار ہوئے۔ شاہجہاں اسے شاہ میانمیر کے پاس لے گیا۔ اسوقت دارا شکوہ ان کو نہیں جانتا تھا۔ بادشاہ نے ان سے کہا کہ شاہزادہ ان کا "دوست دار" ہے، اس پر توجہ فرمائیں۔ انھوں نے پیالے میں تھوڑا سا پانی لیا، اس پر دم کیا اور اسے پلا دیا۔ ایک ہفتے میں شاہزادے کے سارے امراض "برطرف" ہوگئے۔[2]

منقولہ بالا دو عبارتوں اور تقریب ملاقات کے خلاصے کی روشنی میں درج ذیل نکات پر غور فرمائیں:

(۱) ۱۰۴۹ھ (پچیس برس کی عمر) میں تالیف وتکمیل کے مراحل طے کرنے والی کتاب سفینۃ الاولیا میں وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے عرف ارتباط عقیدت قائم کرنے اور سلسلۂ قادریہ میں اپنے انضمام کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس اقدام کے وقت اس کی عمر کیا تھی؟ اس باب میں وہ خاموش ہے۔

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۴-۳۔ [2] ایضاً: ص ۴۹۔

(۲) سکینۃ الاولیا (سالِ تکمیل ۱۰۵۲ھ) میں اپنی عمر (اٹھائیس برس) صراحت کے ساتھ مذکورہ دعوے کا اعادہ کرتے ہوئے اس میں یہ اضافہ کرتا ہے کہ وہ بچپن ہی میں قادری سلسلے سے وابستہ ہو گیا تھا۔

(۳) سکینۃ الاولیا میں ایک جگہ لکھتا ہے:

"دل من پیوستہ فریفتۂ درویشان	میرا دل ہمیشہ درویشوں پر فریفتہ
می بود و اوقات در جستجوی ایشان	رہتا تھا اور وقت ان کی جستجو میں
می گذشت"[1]	گزرتا تھا۔

(۴) "آوانِ طفولیت" سے سلسلۂ قادریہ میں منتظم ہونے اور ہمیشہ درویشوں کی جستجو میں رہنے کا دعویٰ کرنے والے داراشکوہ کو عنفوانِ شباب یعنی انیس برس کی عمر میں قادری سلسلے کے ایک بزرگ (شاہ میاں میر) سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی۔ انھوں نے صرف دم کیے ہوئے پانی سے اس کے مرض کا مداوا کرکے اپنے روحانی مرتبہ و مقام کی بلندی کا ثبوت بھی دیا مگر ان سے بیعت ہونا تو درکنار، اس نے اس موقع پر قادری سلسلے میں اپنے انضمام کا اظہار تک نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان کی وفات کے بعد ان سے "بطریق اویسی" باطنی تربیت پانے کا دعویٰ ضرور کرتا رہا۔

قول و فعل کا یہ تضاد بتا دیتا ہے کہ بچپن میں قادری مسلک سے اس کی وابستگی کا دعویٰ دراصل ملا شاہ سے اس کی بیعت کے بعد کی اختراع ہے اور اس کا اظہار پہلی بار ۱۰۴۹ھ کے بعد ہوا ہے۔　　(باقی)

---

[1] سکینۃ الاولیا، ص ۵۔

"نفحۃ العرب" کا ایک تنقیدی جائزہ

از پروفیسر ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

"نفحۃ العرب" مولانا محمد اعزاز علی دیوبندی مرحوم درس نظامی کی ایک مشہور کتاب ہے، مرحوم دارالعلوم کے فارغ التحصیل اور پھر اس کے مشہور اساتذہ میں سے تھے، چالیس سال سے زیادہ دیوبند میں افتاء اور تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور ۱۳۷۴ھ / ۱۹۵۵ء میں عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔

مرحوم نے درس نظامی میں شامل انیسویں صدی کی لکھی ہوئی قدیم "نفحۃ الیمن" تصنیف الشیخ احمد بن محمد الیمنی الشروانی کی طرز پر طلبہ کے لیے ایک کتاب تصنیف فرمائی اور اس کا نفحۃ العرب نام رکھا جو برسوں سے برصغیر کے سینکڑوں اعلیٰ عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، جہاں درس نظامی کا نصاب پڑھایا جاتا ہے اور بلا مبالغہ ہزاروں طلبہ نے اس کو پڑھا ہوگا اور ہزاروں یا سینکڑوں اساتذہ نے اسکو پڑھایا ہوگا اور پڑھا رہے ہوں گے، ان مدارس میں عربی نثری ادب کا یہی اعلیٰ سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔

چونکہ راقم السطور نے ہندوستان میں صرف ایک سال ندوہ کا "شہادۃ عالمیۃ" کا نصاب پڑھا تھا اور پھر باقی اعلیٰ تعلیم عرب ممالک میں حاصل کی، اس لیے نہ تو کبھی نفحۃ الیمن کو پڑھنے کا موقع ملا اور نہ نفحۃ العرب کو۔ ان دنوں ایک تحقیقی کام کے سلسلے میں جس کا تعلق برصغیر میں عربی زبان و ادب سے ہے ان دونوں کتابوں

کو پڑھنے کا موقع ملا، یہاں دوسری کتاب یعنی "نفحۃ العرب" کا ایک جائزہ مقصود ہے۔

اس کتاب کی تصنیف سے مولانا مرحوم کے دو مقاصد تھے، ایک عربی زبان کے طلبہ کے لیے ادبی تحریروں کا ایک ایسا معیاری انتخاب پیش کرنا جو ان میں عربی ادب کا ذوق پیدا کر سکے اور دوسرے یہ کہ وہ غیر اخلاقی، فحش اور رومانوی حکایات سے بھی پاک ہو جو "نفحۃ الیمن" میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ایک طرف ان کا مقصود علمی و ادبی تھا تو دوسری طرف اخلاقی اور دینی، بلاشبہ یہ دونوں مقاصد بہت مستحسن تھے اور مرحوم بڑی حد تک ان میں اور خاص طور پر دوسرے یعنی اخلاقی و دینی مقصد میں تو پوری طرح کامیاب رہے ہیں۔

جہاں تک علمی و ادبی کاوش کا تعلق ہے تو افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بس یہ بھی "نفحۃ الیمن" کی طرح حکایات و قصص کا ایک مجموعہ ہے، جس میں اخلاقی عنصر غالب ہے، لیکن اس انتخاب میں کوئی تاریخی یا معیاری پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے کہ اس میں عہد نبوی سے لے کر موجودہ عہد تک کی معیاری عربی تحریروں کے نمونے پیش کیے جاتے، سب سے خاص بات یہ کہ مصنف نے جن کتابوں سے یہ حکایات و قصص انتخاب کیے ہیں ان کا حوالہ نہیں دیا ہے کہ قاری ان سے رجوع کر سکے اور کسی لفظ کی صحت یا کسی تاریخی غلطی کا اس کو احساس ہو تو اس کی تصحیح کر سکے۔ کتاب میں یہ ایک بڑا منہجی نقص ہے۔

کتاب کا انداز وہی ہے جو آج سے ہزار بارہ سو سال قبل لکھی ہوئی بعض عربی کی عام ادبی معلوماتی کتابوں کا ہے جیسے جاحظ کی "البیان والتبیین" ابن قتیبہ کی "عیون الاخبار" اور ابن عبد ربہ کی "العقد الفرید" وغیرہ اور جواب برسوں سے مصر و

شام وعراق وغیرہ ملکوں میں متروک ہو چکا ہے، بلکہ ہندوستان میں اعلی عربی کے چوٹی کے ادیب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ نے اس کو ترک کر کے اسی نئے انداز سے عربی ادب کی مشہور و ممتاز کتاب "مختارات من الادب العربي" کو ترتیب دیا ہے (اور وہ بھی اخلاقی معیار پر پوری اترتی ہے) جو عربی دنیا میں رائج ہے اور جس سے عربی ادب کی چودہ سو سالہ نمائندہ تحریریں سامنے آجاتی ہیں اور عربی ادب وانشاء کو سکھانے میں بڑی ممد و معاون ہیں۔

بہرحال منہج اور طریقہ کار کی یہ بات تو ضمناً آگئی ہے، مجھے جس بات نے یہ جائزہ لکھنے پر آمادہ بلکہ مجبور کیا ہے، وہ اصل کتاب یا اس کے متن نہیں بلکہ وہ کثیر تاریخی حواشی ہیں جو کسی طرح بھی کتاب کے اصل متن سے کم نہیں بلکہ یقیناً زائد ہی ہیں اور ان حواشی یا تعلیقات میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو طلبہ کو غلط بلکہ بعض اوقات تو مضحکہ خیز معلومات مہیا کرتی ہیں، لہٰذا میں محض ان کے فائدہ کی خاطر اس جائزہ کو لکھنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہوں، میرا مقصد ہرگز کسی کی تنقیص یا عیب چینی نہیں شاید اس سے کسی کو اختلاف نہ ہو کہ تاریخی وعلمی اغلاط کی تصحیح بھی ایک علمی فریضہ ہے اور مسلمانوں نے علم حدیث سے متعلق بہت نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں کہ کسی راوی کے رتبہ علم سے مرعوب نہ ہوتے ہوئے غلط روایات کی نشاندہی کی ہے۔

میرے سامنے "نفحة العرب" کا قدیمی کتب خانہ۔ آرام باغ کراچی سے شائع شدہ تازہ نسخہ ہے جو اس کے مالک جناب معراج صاحب ایم۔ اے سابق لیکچرر شعبہ تاریخ جامعہ کراچی نے بڑی محنت سے شائع کیا ہے، اس نسخہ کو دیکھیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ اکثر صفحات میں متن آدھا صفحہ یا تہائی صفحہ اور کبھی تو

چند سطروں میں اور چونکہ متن کتاب موٹے حروف میں ہے اور حواشی اس کے مقابلہ میں کافی چھوٹے حروف میں، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ نسخہ جو ۲۸۰ صفحات میں ہے، ان میں تقریباً دو تہائی حصہ ان حواشی کا ہے۔ جن میں بہت سے بعض الفاظ کے معنی سے متعلق ہیں جو کبھی عربی میں دیے گئے ہیں اور کبھی فارسی میں اور کبھی کبھی اردو میں بھی ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک ایسی اعلیٰ ادبی منتخبات کی کتاب میں جو مبتدیوں کے لیے نہیں لکھی گئی ہے، بیشتر ایسے الفاظ کے معانی دینا ضروری سمجھا گیا ہے جس کو ایک عام عربی داں بھی سمجھتا ہوگا، جیسے افعال: ناول، بعنی، اسقط، عثر، ابطر، خشی وغیرہ یا اسمار: العمران، المسامر، سبحۃ، السجادۃ، حفرۃ، الفاسق، مراھق وغیرہ وغیرہ۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ حاشیہ نویسی کے اس مرض کا تسلسل ہے جو صدیوں سے برصغیر کے علماء کو لگ چکا تھا اور جس کے وہ ایسے اسیر ہو گئے تھے کہ ان کو یہ بھی احساس نہیں رہا تھا کہ کہاں حاشیہ لکھنے کی ضرورت ہے اور کہاں نہیں، آخر قاری کی سمجھ بوجھ پر کچھ تو اعتماد ہونا چاہیے اور کچھ تو خود اس کو محنت کرنے کے لیے چھوڑ دینا چاہیے، تاکہ وہ خود کوئی لغت اٹھا کر دیکھے، آخر ہمارے قدیم علمائے عرب نے یہ صحاح، یہ القاموس المحیط، یہ لسان العرب وغیرہ کس کے لیے لکھی تھیں، جمہرۃ اللغۃ، المخصص، تہذیب اللغۃ اور معجم مقاییس اللغۃ وغیرہ کو تو چھوڑیے اور کچھ نہ ہی تو لبنان کے عیسائی لوئیس معلوف کی المنجد ہی سہی، یا

۱؎ پاکستان میں اس لغت کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، لیکن یہ اسکولوں کے طلبہ کے لیے ہے اور عرب یونیورسٹیوں کے طلبہ کو اس سے رجوع کرنے کا مشورہ نہیں دیا جاتا (بقیہ ص ۲۹۴ پر)

پیدا ہو گئی۔ اردو لغات، اس طرح کی حاشیہ نویسی اور حاشیہ خوانی نے طلبہ اور اساتذہ دونوں کے قوائے فکری و ذہنی کو مفلوج کر دیا اور کسی علمی میدان میں وہ کوئی اہم کام نہیں کر سکے۔ الا ماشاء اللہ۔

بہرحال میرے تنقیدی جائزہ کا مقصود یہ حواشی بھی نہیں مگر مجھے ان پر حیرت و استعجاب ضرور ہوا، بلکہ میرے جائزہ کا مقصد وہ حواشی ہیں جن کا تعلق متن کتاب میں وارد شخصیات سے ہے جن پر مختصر سوانحی نوٹ لکھے گئے ہیں اور جن کو عربی میں تراجم کہتے ہیں اور جن میں بہت سوں کو پڑھ کر افسوس کے ساتھ میری زبان پر آ گیا "ناطقہ سربگریباں کہ اسے کیا کہیے"۔ یاد رہے کہ یہ سب حواشی مصنف کتاب یعنی مولانا اعزاز علی دیوبندی مرحوم کے قلم ہی سے ہیں کاش کہ مولانا یہ حواشی نہ لکھتے یا پھر لکھتے تو کچھ تاریخی شعور استعمال کرتے اور کتابوں میں چھان بین کرتے، دونوں باتوں کا بہت سے ایسے "تراجم" میں فقدان نظر آتا ہے۔

اب میں بعض ایسے حواشی کی نشاندہی اور ان کی تصحیح پیش کرتا ہوں۔

۱۔ صفحہ ۱۰ حاشیہ نمبر ۲ | متن میں ایک جملہ ہے "ما حکاہ ابوبکر التاریخی فی کتاب اخبار النحویین" یعنی ابوبکر التاریخی نے کتاب اخبار النحویین میں جو روایت کی ہے اب اس ابوبکر التاریخی پر مصنف نے ایک سوانحی نوٹ پانچ سطور کا لکھا ہے، جس میں ایک سے زیادہ اغلاط ہیں، سب سے پہلے تو یہ کہ موصوف نے اس ابوبکر التاریخی کو

(بقیہ ص ۲۹۳) بلکہ اس سے گریز کرنے کے لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں بہت سی لغوی اغلاط موجود ہیں، میرے دمشق یونیورسٹی کے استاذ اور عظیم عرب محقق الاستاذ سعید افغانی تو اس کے بہت خلاف تھے۔

مشہور محدث الخطیب البغدادی سمجھا اور اس کا اظہار بھی کیا، پھر اس کو تقریباً سو کتابوں کا مصنف ٹھہرا دیا، یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ حیرت ہے کہ مصنف کو یہ خیال نہیں کہ بغداد کے یہ مشہور محدث تو خطیب بغدادی کے نام سے ہی مشہور ہیں اور پھر وہ علمائے نحو سے بھی نہیں اور متن میں ایسے ابوبکر التاریخی کا ذکر ہے جس نے کتاب اخبار النحویین لکھی ہے، پھر وہ کس طرح خطیب بغدادی ہو سکتا ہے، ابن خلکان سے نقل کرتے ہوئے جو سوانحی نوٹ موصوف نے لکھا ہے تو عرض ہے کہ ابن خلکان نے بھی ان کے ترجمہ میں ان کو اخبار النحویین کا مصنف نہیں بتایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس ابوبکر التاریخی کا پورا نام محمد بن عبد الملک ہے۔ اس کا اور اس کی کتاب اخبار النحویین کا ذکر ابن الندیم (یا زیادہ صحیح الندیم) نے اپنی کتاب الفہرست کے الفن الثالث المقالۃ الثانیۃ میں علمائے نحو و لغت کے تذکرہ میں کیا ہے۔ مصنف اگر اس انتہائی مشہور کتاب سے رجوع کرتے تو اس غلطی میں نہ پڑتے اور یہ ابوبکر التاریخی ابوبکر احمد بن علی الخطیب البغدادی سے تقریباً سو سال پہلے کی شخصیت ہے کہ ابن الندیم نے اپنی کتاب ۳۷۷ھ میں لکھی تھی، جبکہ الخطیب البغدادی پانچویں صدی ہجری کے عالم ہیں۔ دوسری غلطی یہ کہ مولانا اعزاز علی صاحب نے خطیب بغدادی کو تقریباً سو کتابوں کا مصنف قرار دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جیسا کہ میرے مرحوم شامی استاد و مورخ ڈاکٹر یوسف العش نے اپنی کتاب "الخطیب البغدادی" میں تحقیق کی ہے ۹۰ کتابیں تصنیف کی ہیں جبکہ یاقوت نے معجم الادباء میں ان کے مفصل ترجمہ میں ۵۶ کتابیں ہی بتائی ہیں اور ان کے نام دیے ہیں اور اس میں اخبار النحویین کا ذکر نہیں اور پھر فاضل مصنف

نے جس کتاب سے الخطیب البغدادی کا ترجمہ پیش کیا ہے یعنی ابن خلکان، اسی کو بنظر غور دیکھتے تو اس میں ان کو نظر آتا کہ اس میں خطیب کی کتابوں کی تعداد ساٹھ سے کچھ زائد بتائی گئی ہے۔ اس لیے تقریباً سو تصنیفات کی بات درست نہیں۔

۲۔ ص ۷۰، حاشیہ نمبر ا | متن میں ہے: حکی المسعودی فی شرح المقامات (مسعودی نے شرح مقامات میں روایت کی ہے) اس "مقامات" سے حریری کی مشہور مقامات مقصود ہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔

یہاں فاضل مصنف نے مسعودی پر جو سوانحی نوٹ لکھا ہے اس کو پڑھ کر تو آدمی سر پیٹ لے۔

فرماتے ہیں" قولہ المسعودی: ھو من مشاھیر المصنفین ولہ ید طولی فی التصنیف، ومن مصنفاتہ مروج الذھب، اسمہ عبدالرحمٰن بن عتبہ بن عبداللہ بن مسعود الکوفی المسعودی . . .
. . . . . وھو من کبار اتباع التابعین" (المسعودی مشہور مصنفین میں سے ہے، اس کو تصنیف کا بڑا ملکہ تھا، اس کی تصنیفات میں مروج الذہب ہے، نام ہے عبدالرحمٰن بن عتبہ بن عبداللہ بن مسعود الکوفی المسعودی . . . . اور وہ اکابر تبع تابعین میں سے ہیں) سبحان اللہ!

اب اس حاشیہ میں جو اغلاط در اغلاط ہیں تو وہ "ظلمات بعضھا فوق بعض" کا نمونہ نظر آئیں گی جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ شرح مقامات (الحریری) کا مصنف مسعودی صاحب کتاب مروج الذہب کو بنا دیا۔

۲- اور پھر اس مسعودی کا نام عبدالرحمن بن عتبہ بن عبداللہ بن مسعود رکھا۔
۳- اور اسی صاحب مروج الذہب کو اکابر تبع تابعین میں داخل کر دیا۔
۴- اور پھر اس مسعودی کا جو تبع تابعین میں سے ہیں پورا نام بھی صحیح نہیں لکھا۔

اب عرض ہے کہ اگر فاضل مصنف کو حریری کا سن وفات ۵۱۶ھ اور مسعودی صاحب مروج الذہب کا سن وفات ۳۴۶ھ معلوم ہوتا تو وہ ہرگز یہ غلطی نہ کرتے پھر اگر ان کو مروج الذہب کے مصنف کا صحیح نام معلوم ہوتا جو ابوالحسین علی بن الحسین المسعودی ہے تب بھی وہ اس غلطی سے بچ جاتے اور اس کو تبع تابعین میں شمار نہیں کرتے کہ اس کی اور دوسرے مسعودی تبع تابعی کی وفات میں تقریباً دو سو سال کا فرق ہے۔

پھر اگر فاضل مصنف اسماء الرجال کی متداول کتابوں میں دیکھتے تو انکو پتہ چلتا کہ جو مسعودی تبع تابعین میں شامل ہیں، مروج الذہب تو کیا انھوں نے تو کوئی کتاب ہی نہیں لکھی، وہ ایک بڑے فقیہ اور محدث تھے جنکا سنہ وفات ۱۶۰ھ ہے۔

اور پھر انہیں کتابوں میں نظر آتا کہ ان کا نام عبدالرحمن بن عتبہ نہیں بلکہ عبدالرحمن بن عبداللہ بن عتبہ بن عبداللہ بن مسعود ہے (ملاحظہ ہو ذہبی کی تاریخ الاسلام ۶/۲۲۷ اور سیر اعلام النبلاء ۷/۹۳-۹۴) اب سوال ہوتا ہے کہ آخر شرح مقامات کا مصنف یہ مسعودی کون ہے؟ تو عرض ہے کہ مسعودی شہرت متعدد اشخاص و مصنفین کی ہے، ایک تو یہی محدث جن کا نام مولانا اعزاز علی صاحب

نے لکھا ہے، گو کسی قدر غلط، دوسرا مشہور مورخ و سیاح و مصنف ابوالحسین علی بن الحسین صاحب کتاب مروج الذہب، یہاں متن میں جو مسعودی مقصود ہے یہ ایک تیسرا مسعودی ہے، اس کا نام ہے: محمد بن عبدالرحمٰن بن محمد مسعود تاج الدین الخراسانی المروزی البندھی المسعودی المتوفی ۵۸۴ھ ، یہ ایک شافعی فقیہ اور ادیب تھے اور انہی نے "شرح المقامات الحریریۃ" کے نام سے متن میں وارد کتاب لکھی تھی جو اب تک مخطوط ہے (ملاحظہ ہو خیرالدین الزرکلی کی الاعلام ۷/۶۴) وفیات الاعیان، ابن خلکان اور لسان المیزان، ابن حجر میں بھی اس کا ذکر ہے۔

اس تحقیق سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ متن میں وارد "المقامات" سے مقصود مقامات الحریری ہی ہے کہ کوئی صاحب یہ نہ فرما دیں کہ متن میں کوئی دوسری "مقامات" مقصود ہے۔

۳۔ ص ۳، حاشیہ نمبر ۷ | متن میں وارد ہے: لما فتح عمرو بن العاص قیسارية جب حضرت عمرو بن العاص نے قیساریہ فتح کیا) اب اس قیساریہ پر حاشیہ لکھتے ہوئے فاضل مصنف تحریر فرماتے ہیں:

"قوله: قيسارية" مدينة كبيرة عظيمة فى بلاد الروم كانت كرسى ملك بنى سلجوق ... الخ" (یعنی قیساریہ ایک بہت بڑا عظیم شہر بلاد روم (یعنی موجودہ ترکی) میں واقع ہے یہ بنی سلجوق کا پایۂ تخت تھا .... الخ)

حیرت کا مقام ہے کہ مولانا اعزاز علی صاحب کو یہ بھی نہ معلوم تھا کہ حضرت عمرو بن العاص کے زمانے بلاد الروم کا کوئی شہر بھی فتح نہیں ہوا، انھوں نے اس طرف کا رخ ہی نہیں کیا تھا، بلکہ انھوں نے فلسطین کی فتح میں حصہ لیا تھا

اور مصر فتح کیا تھا، اب اگر موصوف یاقوت کی معجم البلدان دیکھتے تو ان کو پتہ چلتا کہ اس نے ایک دوسرے قیساریہ کا بھی ذکر کیا ہے جو فلسطین میں ایک ساحلی شہر تھا اور یہی حضرت عمرو بن العاص نے سیدنا عمر کی خلافت میں فتح کیا تھا، دوسرا بلاد الروم (ترکی) میں واقع قیساریہ بہت بعد کو فتح ہوا، فلسطینی قیساریہ بھی قیصروم (بیزنطہ) کے نام پہ آباد ہوا تھا۔

۴۔ صفحہ ۳۰۹ حاشیہ نمبر ۱ | متن میں "عمدۃ القریۃ" کی مجلس کا ذکر ہے: "فاجابنا بمجلس عمدۃ القریۃ رجل"

تو اس "عمدۃ القریۃ" پر حاشیہ تحریر فرمایا گیا ہے "قریۃ شہیرۃ من قری مصر" یعنی یہ مصر کے گاؤں میں سے ایک مشہور گاؤں ہے۔

مصر میں اس نام کا کوئی گاؤں مشہور تو کیا غیر مشہور بھی نہیں بلکہ "عمدۃ" مصر کی مقامی عربی میں گاؤں کے مکھیا یا چودھری کو کہتے ہیں اور نئے زمانہ کی بیشتر عربی تحریر میں اس سے گاؤں کے مکھیا کے گھر اجتماع مراد ہے، جو لوگ مصر میں راقم السطور کی طرح رہتے ہیں یا مصری قصے پڑھتے ہیں انکے لیے یہ لفظ نامانوس نہیں۔

۵۔ صفحہ ۱۰۰ حاشیہ نمبر ۹ | "باب اخ لہم تلک الملک" کے عنوان کے تحت ایک قصہ مذکور ہے، جو ملک شاہ سلجوقی کے عہد میں پیش آیا، اس قصہ میں تین کرداروں کا نام ہے، احمد بن مروان، شاعر عجمی بنام الغسانی اور ابن اسد، قصہ میں موجودہ ترکی کے جنوب میں واقع ایک قدیم اسلامی شہر میا فارقین کا بھی ذکر ہے جہاں پانچویں ہجری اور اس کے بعد ایوبی دور وغیرہ میں مستقل اسلامی سلطنتیں قائم رہی ہیں اور کبھی یہ مشہور قدیمی شہر دیار بکر میں واقع سلطنت کا بھی ایک حصہ رہا ہے۔

اس قصہ کے دو کرداروں کے بارے میں مصنف نے حاشیے لکھے ہیں، ایک ابن اسد پر (ص ۱۰۷) اور دوسرے ملک شاہ پر (صفحہ ۱۰۸) سلجوقی سلطان ملک شاہ پر جو تشریحی ہے (نمبر ۶) اس میں اس کا سنہ وفات ۴۸۵ھ بھی درج ہے، اس سے قبل مصنف نے پانچ سطور کا ایک حاشیہ ابن اسد پر رقم کیا ہے اب سطور بالا کی روشنی میں آپ اس حاشیہ کو دیکھیں تو یہ بالکل ہی بے محل اور غلط ہے۔ عربی میں یہ حاشیہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "یہ شیخ ابن اسد المصری ایک ہزل گو، خوش مذاق اور عیش و عشرت کا دلدادہ شاعر تھا وغیرہ وغیرہ اور ۷۳۸ھ میں اس کی وفات ہوئی"۔

اب حیرت کا مقام ہے کہ یہ شاعر جو آٹھویں صدی میں تھا، پانچویں صدی ہجری کے ایک واقعہ میں اور مصر سے ہزاروں میل دور میافارقین میں کیسے شریک ہو گیا؟ یہ سراسر غلط ہے، یہاں ابن اسد نہ تو کوئی ساتویں، آٹھویں صدی ہجری کا شاعر ہے، نہ وہ مصری تھا۔ مزے بات ہے کہ فاضل مصنف نے قصہ کے اصل کردار ایرانی شاعر غسانی پر نہ تو کوئی تشریحی نوٹ لکھا ہے اور نہ احمد بن مروان پر، حالانکہ یہ موخرالذکر ایک مشہور تاریخی شخصیت ہے جس کا ذکر ابن الاثیر کی مشہور تاریخ "الکامل" (حوادث ۴۵۳ھ) یا دارالکتب العربیۃ بیروت کی جلد ۸ ص ۹۱-۹۲ میں آیا ہے۔ یہ نصرالدولۃ احمد بن مروان الکردی ہے جو دیار بکر اور میافارقین وغیرہ میں واقع بنو مروان کی کردی سلطنت کا ایک مشہور حاکم تھا اور اس نے پچاس سال سے زائد عراق کی شمالی حدود میں واقع اس سلطنت کی شان و شوکت سے حکومت کی اور پھر اس کے بیٹے اور پوتے حکمراں رہے۔

ابن خلدون نے بھی اپنی تاریخ میں ان بنو مروان کی سلطنت کا ذکر کیا ہے جلد ۴ صفحہ ۴۱۳ تا ۴۱۸ طبع دارالفکر بیروت ۱۹۸۱ء اور زیر بحث شخصیت کو احمد بن مروان الکردی کے نام سے یاد کیا ہے۔

جس سیاسی چپقلش کا اس قصہ میں ذکر ہے، اس کی تفصیل ابن الاثیر اور ابن خلدون میں موجود ہے، یہ ۲۷۷ - ۲۷۸ھ کا واقعہ ہے، مگر مولانا اعزاز علی کی کتاب میں یہ واقعہ کسی غیر تاریخی کتاب سے لیا گیا ہے، کیونکہ اس میں اشخاص کا نام اور دیگر تاریخی تفصیلات درست مذکور نہیں، ابن الاثیر میں ابن اسد نام کسی شخص کا ذکر نہیں بلکہ ایک ابوالحسن کا ذکر ہے، ہوسکتا ہے یہ ابن اسد ہو، مگر یہ کوئی طالع آزما سیاسی شخصیت معلوم ہوتی ہے، کوئی شاعر نہیں جو مصر کا رہنے والا تھا اور جس کی وفات تقریباً ڈھائی سو سال بعد واقع ہوئی ہو۔

مصنف کی تاریخ سے بے خبری کی یہ ایک اور مثال تھی، حیرت یہ ہے کہ دیئے ہوئے قصہ میں موجود صریح قرائن اور خود اپنی ہی پیش کردہ ایک تاریخ سے تعارض بھی ان کو محسوس نہیں ہوتا، اب طلبہ اگر یہ غلط باتیں یاد کرلیں تو کس کا قصور ہے!

۶۔ صفحہ ۱۰۹ حاشیہ نمبر ۷، ۸ | عبداللہ بن سوار اور ربیع الحاجب سے ایک قصہ نقل فرماتے ہیں "قولہ: عبداللہ لاندری من ھو" اور دوسرے حاشیہ میں رقمطراز ہیں "قولہ: الربیع لم یتیسر لنا ترجمتہ"

جہاں تک عبداللہ بن سوار کا تعلق ہے مولانا کا اعتراف ناواقفیت تسلیم کہ وہ کوئی مشہور شخصیت نہیں، اگرچہ اس کا پتہ چلانا بھی کوئی مشکل بات نہیں تھی لیکن تعجب یہ ہے کہ ربیع جیسی خلیفہ ابوجعفر منصور کے حاجب جیسی مشہور شخصیت کا ترجمہ یا سوانح حیات نہ معلوم کرسکے جو الربیع الحاجب کے نام سے مشہور ہوگیا تھا اور وزیر کے بعد عباسی خلافت میں اہم ترین سیاسی و انتظامی شخصیت تھا اس کا تذکرہ تاریخ

کی ہر کتاب میں ہے اور وہ کتاب جس کا حوالہ بعض اوقات مصنف نے دیا ہے یعنی ابن خلکان کی وفیات الاعیان، اس میں اسی الربیع بن یونس الحاجب کا ذکر چھ صفحات میں ہے۔

اب جہاں تک عبد اللہ بن سوار کا تعلق ہے، اس کا ذکر ابن عبدوس الجشیاری المتوفی ۳۳۱ھ کی کتاب "الوزراء والکتاب" میں ہے اور یہ یحییٰ البرمکی کا کاتب تھا، یہ الربیع الحاجب کا معاصر اور مردان سیاست میں سے تھا۔

مولانا نے یہ قصہ ابن عبد ربہ کی العقد الفرید سے لیا ہے، یا کسی اور کتاب سے بہر حال العقد ۲/ ۱۸۶ میں مذکور ہے۔

۷۔ صفحہ ۱۱۲ حاشیہ نمبر ۳ | متن میں ایک قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے "روی عن الشیبانی قال: حدثنا محمد بن زکریا"

فاضل مصنف نے پہلے الشیبانی پر طویل حاشیہ تحریر فرمایا ہے اور اس کا سنہ وفات ۲۰۶ھ بتایا ہے اور پھر اس کے فوراً بعد محمد بن زکریا پر ایک طویل تر (۱۱ سطور) کا حاشیہ لکھا ہے جس میں محمد بن زکریا (ابوبکر الرازی الطبیب کا سنہ وفات ۳۱۱ھ بتایا ہے جو تقریباً صحیح ہے، بعض لوگوں نے ۳۰۱ھ بتایا ہے۔

اب غور طلب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک شخص جس کی وفات ۲۰۶ھ میں ہوئی ایک دوسرے شخص سے جس کی وفات ۳۱۱ھ میں ہوئی کس طرح روایت کر سکتا ہے؟ دونوں کی وفات میں ۱۰۵ سال کا فرق ہے، یہ جبھی ممکن ہے جب محمد بن زکریا کی عمر ایک سو پچیس سال رہی ہو، شاید کوئی مولوی صاحب یہ کہہ بیٹھیں تو ہم ان کی اطلاع کے لیے عرض کریں گے کہ اس ابوبکر محمد بن زکریا الرازی الطبیب

کی پیدائش ۲۰۵ھ کی ہے۔ یعنی یہ اس الشیبانی ابو عمرو بن اسحاق کی وفات کے ۴۵ سال بعد پیدا ہوئے تو وہ پھر کس طرح محمد بن زکریا سے روایت کر سکتے ہیں۔

یقیناً ان دونوں میں سے کسی کی شخصیت کا تعین حاشیوں میں غلط ہے۔

اسی صفحہ میں غالباً طباعت کی دو غلطیاں ہیں کہ پہلے حاشیہ میں اراجیز العرب کے بجائے "اراجین العرب" چھپا ہے اور علی بن ربن الطبیب کا نام علی بن زین چھپا ہے۔

۸۔ ص ۱۱۷ حاشیہ نمبر ۳ | میں "السہیلی" پر نوٹ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں "ہم کو اس کا ترجمہ نہیں مل سکا۔ حالانکہ السہیلی سیرت کی مشہور کتاب الروض الانف کا مصنف ہے، اس کا پورا نام ابوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ ہے، سنہ وفات ۵۸۱ھ ہے اور یہ اندلس کا باشندہ تھا اور اس نے رجال و سیرت پر اور کتابیں بھی لکھی ہیں اس کا ترجمہ ابن خلکان کی تیسری جلد میں موجود ہے اور الزرکلی کی الاعلام میں بھی۔

۹۔ ص ۹۱ حاشیہ نمبر ۱۱ | "تعلم السلاطین ....." کے عنوان کے تحت ایک قصہ ابن طاؤس کے بارے میں نقل فرماتے ہیں جس میں امام مالک بن انس ان ابن طاؤس کے ساتھ ابو جعفر المنصور عباسی خلیفہ کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں۔

مذکورہ حاشیہ میں ابن طاؤس کا سنہ وفات ۱۳۲ھ درست تحریر فرماتے ہیں۔ مگر یہ خیال نہیں آتا کہ یہ قصہ جو ابن خلکان کی وفیات الاعیان اور ابن عبدربہ کی العقد الفرید میں وارد ہے (مصنف نے غالباً العقد الفرید سے لیا ہے، ابن خلکان میں الفاظ کچھ کم ہیں) تاریخی طور پر غلط ہے، کیونکہ ابو جعفر المنصور کی خلافت ابن

طاؤس کی وفات کے چار سال بعد ۱۳۶ھ میں شروع ہوئی، ابن خلکان نے اس قصہ کو صیغہ شک یعنی روی سے بیان کیا ہے، جبکہ شیخ الاسلام امام ذہبی نے تاریخ الاسلام (وفیات سنہ ۱۳۲ھ) میں ابن خلکان میں وارد قصہ کی طرف صرف اشارہ کرتے ہوئے اس کو غلط بتایا ہے، یہ لکھکر کہ منصور کی خلافت سے قبل ابن طاؤس کا انتقال ہو گیا تھا۔

۱۰ صفحہ ۱۶۷، ۱۶۹ | متن کتاب میں سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے قصہ میں عمرو بن سعد بن وقاص کا نام لکھا گیا ہے، جو غلط ہے، صحیح نام جیسا کہ مستند کتب تاریخ طبری، خلیفہ ابن خیاط، ابن الاثیر، البدایہ والنہایہ وغیرہ میں درج ہے وہ عمر بن سعد بن وقاص ہے، یہ متن کی غلطی ہے، مصنف نے محسوس نہیں کی۔

۱۱۔ صفحہ ۲۰۶ | سب سے افسوسناک بات یہ ہے کہ موصوف نے عشرۂ مبشرہ میں سے ایک صحابی یعنی سعید بن زید بن عمرو بن نفیل کا نام نہ معلوم کس کتاب سے غلط نقل کیا ہے۔ یعنی سعید بن عبدالرحمٰن اور حاشیہ ۵ میں فرماتے ہیں "کذا فی مجمع البحار" اور پھر حافظ ابن عبدالبر کی کتاب الاستیعاب سے تفصیلی صحیح ترجمہ لکھتے ہیں۔ کتاب کے ناشر نے اس نام کے نیچے ایک جملہ کے فٹ نوٹ میں تصحیح کر دی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ موصوف نے ابن سعد، حافظ ابن عبدالبر، حافظ ابن حجر، ابن الاثیر جنھوں نے صحابہ پر تحقیق اور تفصیلی کتابیں لکھی ہیں ان کے اقوال اور سیرت نبویؐ پر دوسری تمام قدیم کتابوں کے اقوال کو چھوڑ کر اس جلیل القدر صحابی کے نام کے لیے ایک شاذ روایت کیوں اختیار کی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے، ان کا نام سعید بن زید بن عمرو بن نفیل ہی درست ہے۔ اس میں کسی

اختلاف کی گنجائش نہیں اور مجمع البحار کے ہندوستانی مصنف محمد بن طاہر فتنی سورتی کا وہ مقام نہیں جو مشہور و ثقہ عرب مورخین اور حفاظ حدیث کا ہے پھر انھوں نے ان عشرہ مبشرہ بالجنۃ جلیل القدر صحابی کی کنیت ابوالاعور کو نمایاں کر کے ایک طرح سے ان صحابی کی شان میں گستاخی کی ہے، قدیم و جدید عرب مصنفین ایسا نہیں کرتے، اُن کے تذکروں میں یہ کنیت آتی ہے، مگر نمایاں حیثیت سے نام کے ساتھ نہیں۔

یہ محض چند اہم اغلاط کی نشاندہی اور تصحیح ہے، کتاب میں اور بہت سے ایسے مقامات ہیں، دیوبندی علماء کا فرض ہے کہ وہ اپنی اس ادبی کتاب کے حواشی کی تصحیح کریں پوری طرح۔

ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ مصنف نے انتہائی مشہور شخصیات جیسے علمائے اربعہ پر تو تفصیلی حاشیے تحریر فرمائے ہیں، لیکن بہت سی غیر معروف شخصیات پر کوئی حاشیے نہیں لکھے جو کرنے کا کام تھا اور بہت سوں کے بارے میں بغیر کسی محنت کے لکھ دیا "ہم کو معلوم نہ ہو سکا"

کتاب میں ایک اہم نقص یہ ہے کہ مصنف نے جن شعرا کے کلام کے نمونے آخر میں دیے ہیں ان پر کوئی سوانحی نوٹ نہیں لکھے جو بہت ضروری تھے تاکہ معلوم ہوتا یہ کس دور کے شاعر تھے اور ان کا شعری ادب میں کیا مقام ہے۔

اخبار علمیہ

مدراس سے انڈین ریویو آف بکس جلد حال ہی میں شائع ہونا شروع ہوا ہے، اس میں موتھیا کے زیرادارت اس مفید کتابی خبرنامہ میں جدید انگریزی مطبوعات کے متعلق اطلاعات و معلومات کے علاوہ عمدہ تبصرے بھی شامل ہوتے ہیں، تازہ اشاعت سے معلوم ہوا کہ ٹیپو سلطان کے متعلق دو کتابیں 'دی ریل ٹیپو' اے بریف ہسٹری آف ٹیپو' اور دوسری 'دی ٹائیگرس آف میسور' اے بائیوگرافی آف ٹیپو سلطان اینڈ حیدر علی' شائع ہوئی ہیں، موضوع میں یکسانیت کے باوجود دونوں کتابوں سے ہندوستان کے دو مختلف و متضاد ذہن و مزاج کا عکس نمایاں ہے پہلی کتاب ایچ ڈی شرما کی ہے، انھوں نے ٹیپو سلطان کو ظالم، جابر مطلق العنان اور متشدد مسلمان حکمراں ثابت کرنے کے لیے واقعات و حقائق کو مسخ کر کے صریح کذب بیانی سے کام لیا ہے، انھوں نے حیدر علی کو انتہائی روادار، وسیع القلب اور اکبر ثانی بتا کر ٹیپو سلطان کو عین اس کی ضد قرار دیا ہے کہ وہ سیکولر تھا نہ قوم پرست اس کی غلطیوں اور شکست کا سبب محض اس کا مذہبی تعصب تھا، وہ جوش میں یہاں تک لکھ گئے کہ ٹیپو سلطان میدان جنگ سے فرار ہوتے ہوئے بزدلی کے عالم میں قتل کر دیا گیا' دوسری کتاب کرناٹک کے ایک عیسائی مورخ پرکیسی فرینڈس کے قلم سے ہے، انڈین ریویو کے تبصرہ نگار کے الفاظ میں انھوں نے ایک سچے اور غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سوانح قلبند کیے ہیں، منگلور کے ہزاروں عیسائیوں کی گرفتاری اور سرنگا پٹم میں انکی جلاوطنی کے واقعہ کا تجزیہ واقعات کے پس منظر میں کرنے کے بعد انھوں نے لکھا کہ ان عیسائیوں کی باغیانہ روش اور غدارانہ سازش ہی ان کی اس سخت سزا کا موجب بنی، ٹیپو سلطان اگر متعصب ہوتے تو وہ اپنے محل اور عظیم الشان جامع مسجد کے زیر سایہ سری رنگا ناتھا کے مندر کی اجازت کبھی نہ دیتے، پرکیسی نے شرما جی کے بالکل برعکس ٹیپو سلطان کو قوم و وطن کے لیے شہید ہو جانے والا بتایا ہے، ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ خوشی کی بات ہے کہ انڈین ریویو کے تبصرہ نگار نے جعل اور اصل کے فرق کو نمایاں کر دیا ہے۔

ع۔ ص۔

وفیات

محدث العصر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی

محدث العصر مولانا حبیب الرحمن الاعظمی عرصہ سے موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار تھے، راقم ۲۳ فروری کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر مولانا مختار احمد ندوی حفظہ اللہ کی دعوت پر کلیۃ فاطمۃ الزہرا کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے مئو گیا تو مولانا الاعظمی کی عیادت کے لیے بھی حاضر ہوا لیکن ڈاکٹروں نے ملنے جلنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی، میری خواہش پر صاحبزادہ محترم مولانا رشید احمد صاحب نے دید و زیارت کا موقع مہیا کر دیا لیکن اس وقت محدث کبیر نہ بات چیت کرتے تھے اور نہ آنکھیں کھولتے تھے، چند روز بعد مولانا رشید احمد صاحب نے خط سے اطلاع دی کہ اب بھی وہی کیفیت ہے بلکہ صحت مزید خراب ہوتی جا رہی ہے، میں پھر عیادت کے لیے جانا چاہتا تھا کہ ۱۱ رمضان المبارک کو حادثہ جانکاہ کی اطلاع آگئی۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

محدث العصر نے طویل عمر پائی اور مصروف علمی زندگی گزاری، وہ ۱۳۱۹ھ میں پیدا ہوئے، اختر حسن تاریخی نام تھا۔ گھریلو تعلیم کے بعد انھوں نے مئو سے ملحق قصبہ بہادر گنج کے مدرسہ میں داخلہ لیا جہاں مولانا عبدالغفار عراقی کے بھائی مولانا ابوالحسن عراقی سے کسب فیض کرنے کے بعد مظہر العلوم بنارس میں داخلہ لیا حصول تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند کا سفر دوبار کیا مگر دونوں بار طبیعت خراب ہو جانے کی وجہ سے واپس

اخبارِ علمیہ

مدراس سے "انڈین ریویو آف بکس" مجلہ حال ہی میں شایع ہونا شروع ہوا ہے، ایس موتھیا کے زیرادارت اس مفید کتابی خبرنامہ میں جدید انگریزی مطبوعات کے متعلق اطلاعات و معلومات کے علاوہ عمدہ تبصرے بھی شامل ہوتے ہیں، تازہ اشاعت سے معلوم ہوا کہ ٹیپو سلطان کے متعلق دو کتابیں "دی ریل ٹیپو" اے بریف ہسٹری آف ٹیپو" اور دوسری "دی ٹائیگرس آف میسور" اے بائیوگرافی آف ٹیپو سلطان اینڈ حیدر علی شایع ہوئی ہیں، موضوع میں یکسانیت کے باوجود دونوں کتابوں سے ہندوستان کے دو مختلف و متضاد ذہن و مزاج کا عکس نمایاں ہے۔ پہلی کتاب ایچ ڈی شرما کی ہے، انھوں نے ٹیپو سلطان کو ظالم، جابر مطلق العنان اور متشدد مسلمان حکمراں ثابت کرنے کے لیے واقعات و حقائق کو مسخ کرکے صریح کذب بیانی سے کام لیا ہے، انھوں نے حیدر علی کو انتہائی روادار، وسیع القلب اور اکبر ثانی بتا کر ٹیپو سلطان کو بعین اس کی ضد قرار دیا ہے کہ وہ سیکولر تھا نہ قوم پرست اس کی غلطیوں اور شکست کا سبب محض اس کا مذہبی تعصب تھا، وہ جوش میں یہاں تک لکھ گئے کہ ٹیپو سلطان میدان جنگ سے فرار ہوتے ہوتے بزدلی کے عالم میں قتل کردیا گیا" دوسری کتاب کرناٹک کے ایک عیسائی مورخ پرکیسی فرینینڈس کے قلم سے ہے، انڈین ریویو کے تبصرہ نگار کے الفاظ میں انھوں نے ایک سچے اور غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے سوانح قلمبند کیے ہیں، منگلور کے ہزاروں عیسائیوں کی گرفتاری اور سرنگا پٹم میں انکی جلا وطنی کے واقعہ کا تجزیہ واقعات کے پس منظر میں کرنے کے بعد انھوں نے لکھا کہ ان عیسائیوں کی باغیانہ روش اور غدارانہ سازش ہی ان کی اس سخت سزا کا موجب بنی، ٹیپو سلطان اگر متعصب ہوتے تو وہ اپنے محل اور عظیم الشان جامع مسجد کے زیر سایہ سری رنگا ناتھا کے مندر کی اجازت کبھی نہ دیتے، پرکیسی نے شرما جی کے بالکل برعکس ٹیپو سلطان کو قوم و وطن کے لیے شہید ہوجانے والا بتایا ہے، ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ خوشی کی بات ہے کہ انڈین ریویو کے تبصرہ نگار نے جعل اور اصل کے فرق کو نمایاں کردیا ہے۔

ع۔ ص۔

وفیات

محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی

محدث العصر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی عرصہ سے موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار تھے، راقم ۲۳ فروری کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر مولانا مختار احمد ندوی حفظہ اللہ کی دعوت پر کلیۃ فاطمۃ الزہرا کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے مئو گیا تو مولانا الاعظمی کی عیادت کے لیے بھی حاضر ہوا لیکن ڈاکٹروں نے ملنے جلنے پر سخت پابندی لگا رکھی تھی، میری خواہش پر صاحبزادۂ محترم مولانا رشید احمد صاحب نے دید و زیارت کا موقع مہیا کر دیا لیکن اس وقت محدث کبیر نہ بات چیت کرتے تھے اور نہ آنکھیں کھولتے تھے، چند روز بعد مولانا رشید احمد صاحب نے خط سے اطلاع دی کہ اب بھی وہی کیفیت ہے بلکہ صحت مزید خراب ہوتی جا رہی ہے، میں پھر عیادت کے لیے جانا چاہتا تھا کہ ۱۱ رمضان المبارک کو حادثہ جانکاہ کی اطلاع آگئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ہ

محدث العصر نے طویل عمر پائی اور مصروف علمی زندگی گزاری، وہ ۱۳۱۹ھ میں پیدا ہوئے، اختر حسن تاریخی نام تھا۔ گھریلو تعلیم کے بعد انھوں نے مئو سے ملحق قصبہ بہادر گنج کے مدرسہ میں داخلہ لیا جہاں مولانا عبدالغفار عراقی کے بھائی مولانا ابوالحسن عراقی سے کسب فیض کرنے کے بعد مظہر العلوم بنارس میں داخلہ لیا حصول تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند کا سفر دوبار کیا مگر دونوں بار طبیعت خراب ہوجانے کی وجہ سے واپس

چلے آئے اور دار العلوم مئو ہی میں مولانا کریم بخش سنبھلی کی خدمت میں رہ کر دورۂ حدیث مکمل کیا، فراغت کے بعد یہیں درس و تدریس کی خدمت پر مامور ہو گئے، پھر مئو کے دوسرے بڑے مدرسہ جامعہ مفتاح العلوم سے وابستہ ہوئے اور اس کے صدر مدرس بھی رہے، یہاں سے علیحدہ ہوئے تو خود المعہد العالی مرقاۃ العلوم کی داغ بیل ڈالی جو اب مئو کے بڑے مدرسوں کی صف میں آ گیا ہے۔

مولانا کا اصل مشغلہ درس و تدریس تھا، ان کے بے شمار تلامذہ اس برصغیر میں پھیلے ہوئے ہیں جن میں مولانا محمد منظور نعمانی اڈیٹر الفرقان اور مفتی ظفیر الدین صاحب بھی ہیں۔ تاہم تحریر و تصنیف کا کام بھی وہ برابر انجام دیتے رہے اور انہیں اس کا اچھا سلیقہ اور عمدہ ذوق تھا، حدیث و اسماء الرجال ان کا خاص فن تھا اور اس پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، مخطوطات سے بھی انہیں بڑا شغف تھا، ان کا اہم اور شاندار کارنامہ احادیث کی بہت سی ان نادر کتابوں کی اشاعت ہے جو مخطوطہ ہونے کی بنا پر اہل علم کی دسترس سے باہر تھیں، مولانا نے ان کو ان کے مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ، تصحیح و تعلیق اور مفید حواشی کے ساتھ شایع کرکے اصحاب علم و تحقیق پر بڑا احسان کیا، انھوں نے جن کتابوں کو ایڈٹ کیا ہے ان پر عالمانہ مقدمے بھی لکھے ہیں جن میں مصنف کے حالات و کمالات کے علاوہ ان موضوعات پر پہلے اور بعد میں لکھی جانے والی کتابوں کا تذکرہ کرکے زیر اشاعت کتاب کی اہمیت و عظمت دکھائی ہے، حواشی و تعلیقات میں مختلف نسخوں کے فرق و اختلاف اور متن میں درج آیتوں اور حدیثوں کی تخریج، رجال و اسناد کی تحقیق، مشکل و غریب الفاظ اور مشکلات حدیث کی تشریح کی گئی ہے، دوسری مشہور و متداول کتابوں کی حدیثیں

سے زیر نظر کتابوں کی مطابقت یا اختلاف کو ظاہر کرکے ان کی صحت و خطا کا فیصلہ کیا ہے، شروع میں مخطوطہ کے بعض صفحوں کا عکسی فوٹو اور متعدد فہرستیں دے کر استفادہ و مراجعت کو آسان کر دیا ہے، اس طرح کی جو کتابیں مرتب کی ہیں ان کے نام یہ ہیں:۔

مسند حمیدی، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، کتاب السنن (حافظ سعید بن منصور) کتاب الزہد والرقائق (عبداللہ بن مبارک) مجمع بحار الانوار (ملا محمد بن طاہر پٹنی) الحاوی علی رجال الطحاوی وغیرہ۔

آخرالذکر رجال طحاوی پر خود مولانا کی بلند پایہ علمی و تحقیقی تصنیف ہے۔

اردو میں بھی مولانا کی متعدد تصانیف ہیں جو اکثر ردو مناظرہ میں ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

(۱) اعیان الحجاج (دو جلدیں) (۲) نصرۃ الحدیث (۳) الاعلام المرفوعہ (۴) رکعات تراویح۔

مولانا سلیس، شگفتہ، پر مغز اور حشو و زوائد سے پاک اردو لکھتے تھے جو ماقل و ماول کا نمونہ ہوتی تھی،

مستقل کتابوں کے علاوہ انھوں نے معارف اور برہان میں متعدد محققانہ مضامین بھی لکھے ہیں، ان میں سے اکثر میں کسی مصنف یا مقالہ نگار کی فروگزاشتوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور یہ بڑے بیش قیمت ہیں جن سے علمی و تحقیقی کام کرنے والے بے نیاز نہیں ہو سکتے اس لیے معارف میں چھپنے والے ان کے مضامین کی ایک فہرست دی جاتی ہے۔

حبّی و سابا طہ (جلد ۱۲ عدد ۴) دو متبرک اجازت نامے (جلد ۴۰ عدد ۶)

تخریج زیلعی (جلد ۶۴ عدد ۱) الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ (جلد ۶۶ عدد ۲) مبارق الازہار کس کی تصنیف ہے (جلد ۴۷ عدد ۱) پورب کی چند برگزیدہ ہستیاں (جلد ۴۷ عدد ۴ و ۵) قاضی الرشید بن زبیر غسانی، اسوانی مصری مصنف الذخائر والتحف (جلد ۸۰ عدد ۶) دینور و مشائخ دینور (جلد ۹۶ عدد ۴) ابو عبید کی غریب الحدیث (جلد ۱۰۰ عدد ۴) غریب الحدیث (جلد ۱۰۱ عدد ۲) فہرست مخطوطات عربیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور (جلد ۱۲۳ عدد ۴)

مولانا متبحر عالم اور بلند پایہ محدث تھے اور اس حیثیت سے ہندوستان ہی نہیں بلکہ عرب ملکوں میں بھی وہ بے نظیر تھے، فقہ حنفی پر بھی انکی وسیع نظر تھی جس کی تائید و حمایت میں پیش پیش رہتے تھے۔

لگن اور خاموشی سے علم و مذہب کی خدمت ہی مولانا کا مشن تھا اور اسی سے ان کو طبعاً مناسبت بھی تھی لیکن ان کا رجحان آزادی و اتحاد کی تحریک کی طرف رہا اور وہ کانگریس اور جمعیۃ علمائے ہند سے عملاً وابستہ بھی تھے، ۱۹۵۲ء میں مئو کے حلقہ سے کانگریس نے انہیں اسمبلی کے لیے اپنا امیدوار بنایا جس میں وہ کامیاب ہوئے اس زمانہ میں اسمبلی کی ممبری باوقار سمجھی جاتی تھی تاہم مولانا جیسے علمی آدمی کو اس سے کوئی مناسبت نہیں تھی اس لیے ان کا زیادہ وقت ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں گزرتا تھا اس سے فائدہ اٹھاکر ندوہ کے ارکان نے انہیں درس حدیث کی خدمت تفویض کردی جس کو وہ بلا معاوضہ انجام دیتے رہے۔ مگر دوبارہ انتخاب میں امیدوار ہونا پسند نہیں کیا، مولانا کی طویل علمی و تحقیقی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند نے ۱۹۸۳ء میں انہیں صدر جمہوریہ کا ایوارڈ عطا کیا تھا۔

سیاست میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے مسلک سے قریب ہونے کی بنا پر مولانا اسعد مدنی سے بھی انکو عزیزانہ تعلق تھا، چند برس قبل امارت شرعیہ ہند نے انکو امیرالہند منتخب کیا تھا، بیعت و اجازت کا تعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے تھا، مولانا محمد احمد پرتاپگڈھیؒ سے بھی انکے دوستانہ تعلقات تھے اور دونوں بزرگ ایک دوسرے کے فضل و کمال کے معترف تھے، دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلما کے رکن تھے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی انکے بڑے عظمت شناس تھے، دارالمصنفین آتے تو مولانا سے ملاقات کے لیے مئو بھی تشریف لے جاتے۔ شروع ہی سے مولانا اعظمی کا تعلق دارالمصنفین سے بھی تھا جو آخر تک قائم رہا، حضرت سید صاحب ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور اپنی بعض تحریروں کو اشاعت سے پہلے انکے پاس بھیجتے اور ان کے مشورے کے مطابق ان میں ردوبدل بھی فرماتے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم بھی انکا بڑا اکرام کرتے۔ چند برس قبل انکو دارالمصنفین کی وقف کمیٹی کی رکنیت پیش کی گئی تو انھوں نے اس کو بخوشی منظور کر لیا۔

مولانا اس برصغیر ہی نہیں پوری اسلامی دنیا میں اپنے علمی و دینی کارناموں کی وجہ سے مشہور و مقبول تھے، انھوں نے کئی مسلم ملکوں کا علمی سفر بھی کیا تھا۔ عرب ممالک کے ممتاز فضلا سے انکے روابط تھے، شیخ عبدالفتاح غدہ انکے بڑے مداح تھے، شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا لاہور بھی انکے بڑے قدرداں تھے، ایک دفعہ وہ دارالمصنفین تشریف لائے تو مولانا سے ملنے مئو بھی گئے۔

اپنے وطن میں مولانا کو جو مقبولیت حاصل تھی اس کا اندازہ انکے جنازہ سے ہوا جس میں شرکت کے لیے دارالمصنفین سے راقم اپنے رفیق کار مولوی محمد عارف عمری اور مولوی احتشام علی ندوی

کے ساتھ لگ گیا تھا، مئو کے ہر گلی کوچہ میں آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے، ہم لوگ بڑی زحمت سے مولانا کی قیام گاہ (پٹھان ٹولہ) پہنچے لیکن دید و زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ ریلوے کے بڑے اور وسیع میدان میں جنازہ کی نماز کا اہتمام کیا گیا تھا، مولانا ہی کے ایک ہم نام اور ان سے اہل تعلق مولوی حبیب الرحمٰن ندوی کی معیت میں ریلوے میدان گئے، جہاں اتنے لوگوں نے نماز جنازہ ادا کی جن کی تعداد کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکا البتہ بعض لوگوں کو جب یہ کہتے سنا کہ مئو میں ابھی تک کسی کے جنازہ میں نہ اتنا بڑا مجمع ہوا تھا اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے تو ہم نے بھی اپنے دل میں کہا یہ اس عہد کے امام زیلعی اور ملا علی قاری کا جنازہ ہے جن کی زبان و قلم ہمیشہ احادیث کی شرح و ترجمانی اور ان کی مشکلات و غوامض کو حل کرنے میں مصروف رہے ہیں اور جن کا وجود گرامی علوم نبویؐ کی خدمت و فروغ اور نادر و نایاب کتب احادیث کی طبع و اشاعت کے لیے وقف رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ عالم آخرت میں علم و دین اور احادیث نبویؐ کے اس خادم کے مراتب و درجات کو بلند کرے آمین۔

"ض"

کرنل بشیر حسین زیدی

ابھی مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی موت سے آنسو خشک نہیں ہوئے تھے کہ ۲۹ مارچ کو کرنل بشیر حسین زیدی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کا خاندان سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور پنجاب کے علاقہ کلانور میں قیام پذیر ہوا، شہاب الدین غوری کی افواج کے سپہ سالار قطب الدین ایبک نے دہلی کو اپنا پایۂ تخت بنایا تو درباری روابط کی بنا پر اس خاندان کے لوگوں نے بھی دار الحکومت سے قریب ضلع مظفر نگر میں موضع سنبھل ہیڑہ اور اس کے آس پاس کے مواضعات میں توطن اختیار کیا، اسی

خانوادے کے ایک بزرگ سید عمر نے موضع گکرولی کو آباد کیا، زیدی صاحب ان کی بارہویں پشت میں تھے۔

یہ خاندان سادات باہرہ (روشن) کے نام سے مشہور ہوا جو تبدیل ہوکر سادات بارہہ ہوگیا، یہ لوگ اپنے علوے نسب اور مکارم اخلاق کے علاوہ ہر دور میں شجاعت وبہادری کے لیے بھی ممتاز سمجھے جاتے تھے، مغلوں کے زمانے میں سادات بارہہ بلند مناصب پر فائز ہوئے اور اپنی سیاسی طاقت کی وجہ سے اورنگزیب کے بعد کے طوائف الملوکی دور میں بادشاہ گر کہلاتے تھے، بلگرام کے سادات بھی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کو حیدرآباد میں بڑا عروج نصیب ہوا۔

سید بشیر حسین زیدی کی ولادت ۳۰ جولائی ۱۸۹۸ء کو قصبہ چھانسا (ضلع دہلی) میں ہوئی جہاں انکے والد سید شوکت حسین بحیثیت سب انسپکٹر پولیس ملازم تھے، زیدی صاحب اسکول اور کالج کی تعلیم دہلی میں حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۹ء کے اواخر میں کیمبرج گئے، ۲۳ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کرکے گھر آنے لگے تو حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔

وطن پہنچ کر انھوں نے میرٹھ میں وکالت کرنے کا ارادہ کیا جس کے بہت کچھ انتظامات بھی کر لیے تھے لیکن انگلستان کے قیام میں وہ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کے بہت قریب ہوگئے تھے جو اس زمانہ میں وہیں تھے اور اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے، زیدی صاحب ان سے اپنے آیندہ کے پروگرام کے بارے میں کچھ مشورے کے لیے علی گڑھ آئے تو انھوں نے انکے علی الرغم انہیں علی گڑھ یونیورسٹی اسکول کی ہیڈ ماسٹری کا تقرری نامہ تھمادیا۔

مارچ ۱۹۳۰ء میں اسکول کی ذمہ داری سے سبکدوش ہوکر پھر انھوں نے وکالت کرنے کا ارادہ کیا لیکن نواب رضا علی خاں والی رامپور نے انکو اپنی ہائی کورٹ کا جج مقرر کردیا، ۱۹۳۶ء میں وہ ریاست کے مستقل طور پر چیف منسٹر ہوئے جس پر اس کے انڈین یونین سے انضمام ۱۹۴۹ء تک برقرار رہے۔

دوسری جنگ عظیم میں اور ریاستوں کی طرح رامپور نے بھی حکومت ہند کو فوجی امداد دی لیکن دوسری ریاستوں کے برخلاف رامپور بٹالین کا خرچ بھی ریاست کے خزانے سے ادا کیا گیا، اسی زمانے میں زیدی صاحب ریاست کی فوج میں اعزازی کرنیل بنائے گئے اور دوران جنگ انگلستان کی حکومت نے انہیں سی۔آئی۔ای کا اعزاز بھی دیا۔

۱۹۳۷ء میں بیگم قدسیہ سے انکی شادی ہوئی جو زندگی بھر انکی ہمدم و ہمساز اور شریک و مشیر بنی رہیں۔

۱۹۴۷ء میں زیدی صاحب حکومت ہند کی دستور ساز اسمبلی کے رکن مقرر ہوئے اور ریاست کے نمائندے کی حیثیت سے پارلیمنٹ کے رکن ہوئے ۱۹۵۱ء میں مجلس اقوام متحدہ میں ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے گئے اور ۱۹۵۲ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر ہردوئی سے لوک سبھا کے ممبر چنے گئے، ۱۹۵۶ء میں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں اس عہدہ سے سبکدوش ہونے کے بعد نظام ٹرسٹ کے ٹرسٹی مقرر کیے گئے اور ۱۹۶۴ء میں راجیہ سبھا کے ممبر ہوئے، اسی سال حکومت نے ایک خیر سگالی وفد مسلم ممالک بھیجا جس کی سربراہی زیدی صاحب نے کی۔ ۱۹۷۰ء تک راجیہ سبھا کے ممبر رہے، اسی زمانہ میں جامعہ نگر میں انھوں نے اپنا

نجی مکان تعمیر کرایا اس وقت سے یہی گھران کا مسکن تھا کہ پیام اجل آگیا اور اب جامعہ ملیہ کے قبرستان میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بغل میں مجیب صاحب اور عابد صاحب کے ساتھ محو خواب ہیں۔

زیدی صاحب کی پوری زندگی قومی خدمت اور سیاسی، تعلیمی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں گزری، انکے دل میں قوم و ملک کی خدمت کا جذبہ شروع ہی سے موجزن تھا، اسکول اور کالج کی طالب علمی کے زمانہ ہی میں بعض قومی رہنماؤں سے انکی قربت ہوگئی تھی، ۱۹۱۸ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس دہلی میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی صدارت میں ہوا تو یہ اس میں رضاکار تھے۔

کالج کے استاذوں میں پروفیسر گھوش کے جذبۂ خدمت سے متاثر ہوکر انھوں نے خدمت خلق کو اپنا وظیفۂ حیات بنا لیا تھا، طالب علمی ہی میں اپنے ہم جماعت رگھونندن ہرن سے مل کر سوشل سروس لیگ قائم کی، ایک شبینہ اسکول کھولا جس میں غریبوں اور مزدوروں کے بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی، ایک ہاسپٹل وزیٹنگ گروپ اور ایک ریلوے اسٹیشن وزیٹنگ گروپ بھی قائم کیا تاکہ مریضوں کی تیمارداری اور تیسرے درجہ کے مسافروں کی مدد کی جائے۔

زیدی صاحب نے رامپور ریاست کے چیف منسٹر کی حیثیت سے اس کی فلاح و بہبود کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے، ان کے دور میں متاجری کی ظالمانہ اور غیر منصفانہ لعنت ختم ہوئی، اس کی تنسیخ پر جو ہنگامے اور مظاہرے ہوئے انہیں زیدی صاحب نے اپنے تدبر اور خوش انتظامی سے ختم کر دیا اور ریاست میں صنعت و حرفت کو فروغ دے کر خوشحالی اور فارغ البالی لادی۔

تعلیمی اصلاحات کی غرض سے خواجہ غلام السیدین کو ریاست کا تعلیمی مشیر مقرر کیا، اس میں پہلے صرف ایک ہائی اسکول تھا، زیدی صاحب کی کوشش سے ایک اور ہائی اسکول، ایک ڈگری کالج اور ایک گرلز ہائی اسکول قائم ہوگیا، دیہی دنیا میں دو ڈھائی سو کے قریب پرائمری اسکول کھلے، رضا لائبریری کو بھی ترقی دینے اور کارآمد بنانے کی تدبیریں کیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ان کو شروع ہی سے لگاؤ تھا، ریاست رامپور نے اس کی ترقی میں جس قدر بھی حصہ لیا وہ انہی کی دلچسپی کا نتیجہ تھا، ۱۹۴۶ء میں اس کی سلور جوبلی ہوئی تو اس کے مصارف کے لیے زیدی صاحب نے ریاست سے ایک لاکھ روپے نقد دلائے، تنبو، قناتیں اور سارے ساز و سامان بھی وہیں سے آئے تھے، جامعہ سے تعلق ہی کی بنا پر اس کے قرب میں اپنا مکان بنوایا۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انھوں نے اپنے تدبر اور حسن انتظام کے خوب جوہر دکھائے اور ان کے دور میں مختلف مفید اور تعمیری کام انجام پائے، مڈیکل کالج کی تجویز پرانی تھی مگر اس کو بروئے کار لانے کا سہرا انہی کے سر ہے، شعبۂ دینیات کو موثر اور فعال بنانے کی تدبیریں بھی کیں، عمارتوں کی تعمیر سے انکو بڑی دلچسپی تھی اور وہ علی گڑھ کے شاہجہاں کہلاتے تھے۔ مولانا آزاد لائبریری، پولی ٹکنک، اسٹاف کلب، فزکس لیباریٹری، جیولوجی لیباریٹری، آرٹس فیکلٹی، کشمیر ہوسٹل، وائس چانسلر لاج اور کینیڈی ہال کی خوبصورت اور عالی شان عمارتیں انکی یادگار ہیں، انہیں شجرکاری سے بھی دلچسپی تھی، شاندار عمارتیں اور تناور درخت لگواکر انھوں نے یونیورسٹی کو گل و گلزار بنا دیا۔

زیدی صاحب کو دوسرے علمی و تعلیمی اداروں سے بھی سروکار رہا، دارالمصنفین کے نہایت بہی خواہ اور مخلص کارکن تھے، اپنی دوراندیشی اور وسیع تجربات کی بنا پر نہایت مفید اور صحیح مشورے دیتے تھے، ہمیشہ اسے فائدہ پہنچانے کی فکر میں رہتے، پیرانہ سالی کے باوجود دارالمصنفین کے جلسوں میں شوق سے تشریف لاتے۔

زیدی صاحب کو فرقہ وارانہ تنگ نظری سے نفرت تھی، وہ ہندو مسلم اتحاد کے برابر حامی رہے، خود شیعہ تھے اور اپنے مذہبی خیالات میں پختہ تھے اور صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ لیکن شیعہ سنی اور ہندو مسلم کی تفریق کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے دوستوں میں ہر فرقہ و مذہب سے تعلق رکھنے والے ہوتے تھے ان کے دوست رگھونندن سرن ایک ہوائی حادثے میں فوت ہو گئے تو ان کے بچوں کے ساتھ سگے بھائیوں کی اولاد جیسا سلوک کیا، انکے ملازمین میں ہندو مسلمان دونوں تھے اور وہ ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرتے تھے، مسلم یونیورسٹی کے ہندو طلبہ کا خیال مسلمان طلبہ سے زیادہ رکھتے تھے۔

زیدی صاحب حکومت میں مقبول تھے ان کو بہت سے انعامات عطا کیے گئے اور مختلف کمپنیوں اور اداروں کے رکن بنائے گئے، پدم وبھوشن کا خطاب بھی حکومت نے دیا۔

زیدی صاحب ہر ایک سے لطف و شفقت کے ساتھ پیش آتے اور اس کے دکھ درد میں اس کی دلجوئی کو اپنا فرض خیال کرتے، بیوی، بچوں اور عزیزوں کے حقوق ادا کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے، بیوی پر پورا اعتماد کرتے گھر کی ساری ذمہ داری انہیں سونپ دی تھیں، ریاست کے معاملات میں بھی ان سے مشورے کرتے تھے، انھوں نے بیوی کو برابری کا درجہ دے رکھا تھا اور ان کی آزادی میں

کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتے تھے، زیدی صاحب کا نام علی گڑھ کے وائس چانسلر کے لیے تجویز ہوا تو بیوی کو اس سے شدید اختلاف تھا اور وہ اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے وہاں جانے کے تیار نہیں تھیں تاہم زیدی صاحب نے ملک و قوم کی خدمت سمجھ کر یہ ذمہ داری قبول کرلی مگر بیوی پر علی گڑھ جانے کے لیے کسی طرح کا دباؤ نہیں ڈالا۔

زیدی صاحب کا حلقۂ احباب وسیع تھا جس میں مخلصین کے علاوہ خود غرض قسم کے لوگ بھی شامل تھے جنھیں صرف اپنے مطلب سے کام ہوتا مگر زیدی صاحب سب سے خلوص اور اپنائیت سے پیش آتے تھے، وہ دوسروں کی خدمت اور دوستوں کی مدد کرکے خوش ہوتے تھے اور کبھی کسی کو یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ وہ اس پر کوئی احسان کر رہے ہیں بلکہ اسے اپنی سعادت سمجھتے کہ انہیں خدمت کا موقع ملا۔

زیدی صاحب کو کسی کی مخالفت کا خیال بھی دل میں نہیں آتا، بغض و عناد اور کینہ کپٹ سے ان کی طبیعت ناآشنا تھی، جو لوگ ان کی دشمنی اور عداوت پر کمربستہ رہے ان کو بھی انھوں نے معاف کر دیا، رام پور کے چیف منسٹر کی حیثیت سے انھوں نے جو اصلاحات کی تھیں ان سے ایک طبقہ میں بڑی برہمی تھی انڈین یونین میں ریاست کے انضمام میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، اس کی بنا پر ان لوگوں کو ان پر غصہ اتارنے کا موقع ملا، انھوں نے زیدی صاحب کے بھائی اور عزیزوں کا مکان لوٹا، نذرِ آتش کیا اور عزیزوں کو زدوکوب بھی کیا، اس بدامنی اور انتشار کو دور کرنے کے لیے انہیں فوج کی مدد لینی پڑی، مگر انھوں نے یہ سب انگیز کیا، کچھ ہی عرصہ بعد ملک میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے اور انہی مخالفین کے پانچ ہزار آدمی دہلی میں گھر گئے یہ لوگ فریاد کرتے ہوئے زیدی صاحب کے پاس

آئے وہ اپنی جان پر کھیل کر دہلی گئے اور اسپیشل ٹرین کا انتظام کر کے انہیں واپس لائے حالانکہ اس وقت دہلی میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جارہی تھی، بیگم نے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانے اور کہا مجھے ان سے بدلہ لینا ہے، وہ بولیں یہ کیسا بدلہ ہے، کہنے لگے کہ سیدوں کا بدلہ ایسا ہی ہوتا ہے۔

زیدی صاحب کے ملازمین ان کے گھر ہی کے افراد معلوم ہوتے تھے وہ ان کی ہر ضرورت وآسایش کا پورا خیال رکھتے، بعض ملازمین ان کی نرمی ومروت سے گستاخ ہوجاتے اور گھر گرہستی کے معاملہ میں ان کو فریب بھی دے دیتے مگر اسکی وجہ سے ان کے ساتھ زیدی صاحب کے رویے میں فرق نہیں آتا۔

زیدی صاحب ہماری قدیم تہذیب وروایت اور شرافت و وضعداری کی یادگار تھے، اب ایسے بامروت، خلیق، ملنسار، شائستہ، باوقار لوگ معدوم ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور انکی مغفرت فرمائے آمین!!

یادرفتگان

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے دور کے جن مشاہیر اور ممتاز اہل علم وقلم کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کیے ہیں یہ کتاب انکا مجموعہ ہے اس میں انکے اساتذہ، شیخ طریقت اور مختلف احباب ومعاصرین کا دلچسپ تذکرہ ہے مسلمانوں کے علاوہ بعض ہندوؤں کا اور انگریزوں کا ذکر بھی ہے۔ قیمت ۵۰ روپیے

بزم رفتگاں حصہ دوم

اس کتاب میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اپنے دور کے مختلف قومی وملی رہنماؤں اور متعدد مشاہیر اہل قلم کے بارے میں اپنے نقوش وتاثرات دلچسپ انداز میں قلمبند کیے ہیں۔

قیمت ۳۵ روپیے

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

رگ وید حصہ اول اور یجر وید حصہ اول مترجم پنڈت آشورام آریہ متوسط تقطیع، کاغذ کتابت طباعت، بہتر، مجلد، صفحات ۱۔ ۴۷۵ و ۲۔ ۳۴۴ دونوں کی قیمت پچاس روپیے، پتہ :۔ آریہ پرکاش ۱۵۹۴، سیکٹر ۔ سی، چنڈی گڑھ۔

وید ہندوؤں کی مقدس ترین کتابیں ہیں، ان کی تاریخ میں اختلاف ہے، چھ ہزار سال سے ایک ہزار قبل مسیح تک کی مناجاتوں کے ان مجموعوں کے جمع و ترتیب کی مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ تقریباً تین ہزار سال سے ان میں کوئی تحریف نہیں ہوئی، ان کی تاریخی صداقت سے قطع نظر ان کی اہمیت، قدامت اور تقدس کی بنا پر ان کے اردو ترجمہ کی ضرورت بھی تھی جس کو پورا کرنے کے لیے عرصہ ہوا غازی محمود دھرمپال نے یجر وید کا ایک اردو ترجمہ کیا اور اب پنڈت آشورام آریہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں، وہ آریہ سماجی ہیں، زیر نظر دونوں کتابیں ان کی محنت کا ثمرہ ہیں، مگر افسوس ہے کہ اس میں صرف رسم الخط بدلا ہوا ہے اور اصل الفاظ ہندی جوں کے توں باقی رکھے گئے ہیں جو عام اردو خواں طبقہ کے لیے ناقابل فہم ہیں، مترجم، سوامی شردھانند کے متبع اور انکی تعلیمات کے ترجمان ہیں، ان دونوں ترجموں میں تفسیری حواشی میں کثرت سے سوامی جی کے اقوال و خیالات کو نقل کیا گیا ہے، جابجا مترجم کے سیاسی خیالات کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے" مسلمانوں نے لکڑی کی جگہ پستکوں کو جلایا" (رگ وید ص۵۶) "بٹوارے کے وقت ۴ کروڑ مسلمان حکومت کی سخت غلطی سے یہاں رہ گئے ہیں جن کی تعداد اب دس کروڑ ہو گئی ہے، اور الگ نیا پاکستان بنانے کی سازشیں رچی جا رہی ہیں" (یجر وید ص۴۲) ایسے سطحی اور شرانگیز خیالات کو مقدس کتابوں میں درج کرنے کا کیا موقع تھا۔

ع۔ ص۔

جلد ۱۴۹ ۔ ماہ ذوقعدہ ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۹۲ء ۔ عدد ۵

مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

آزادی سے پہلے اور اس کے بعد کے ہندوستان میں بڑا فرق ہوگیا ہے۔ اگر یہ فرق خوش آیند ہوتا تو اس کا خیر مقدم کیا جاتا۔ اور ان لوگوں کی ستایش کی جاتی جو اس عرصہ میں ملک کے سیاہ و سفید کے مالک رہے ہیں۔ اور فخر سے کہا جاتا کہ انھوں نے اپنے تدبر، حسن انتظامی لیاقت، محنت اور خون پسینہ سے درخشاں ہندوستان کی تعمیر کی ہے۔ لیکن آزاد ہندوستان کی خوبی و خوش نمائی کے پہلو بہت کم ہیں اور اس کے حال زار اور بد نمائی کے رُخ گوناگوں ہیں۔ اس کی داستان کبھی فرصت سے سنی اور سنائی جائے گی۔ اس وقت تو صرف مسلمانوں کے تعلق سے بعض باتیں عرض کرنی ہیں، کیونکہ ہندوستان کے نئے نقشے میں انھی کی تصویر سب سے زیادہ دھندلی اور اس قدر بدلی ہوئی ہے کہ جیسے آج اپنی شکل بھی پہچانی نہیں جاتی مسلمانوں کی نئی نسل پرانی نسل سے بہت کچھ مختلف ہوگئی ہے۔ بعض گھرانوں کے دونوں نسلوں کے افراد کی تہذیب و معاشرت، رہن سہن، بول چال، مزاج و عادت، طور طریق وضع قطع، لباس پوشاک، فکر و عمل اور نظریہ و خیال میں اس قدر مغایرت ہے کہ یہ دو خاندانوں یا دو علاقوں اور دو قوموں کے افراد معلوم ہوتے ہیں۔ یہی نہیں نئی نسل کو اپنے دین و مذہب، عقائد و اعمال، اپنی تاریخ و تہذیب اور تمدن و کلچر سے کوئی واسطہ اور لگاؤ نہیں رہ گیا ہے۔ وہ اپنی روایات، قومی و ملی تشخصات، اپنی تعلیم و تہذیب اور زبان و ثقافت سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اس پر اپنی قوم و ملت سے زیادہ دوسروں کے مذہب و ملت کا اثر چھاتا جا رہا ہے۔ اس کا لہجہ، ٹون اور طرز گفتگو اتنا بدل گیا ہے کہ الناس علی دین ملوکھم کا مقولہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔

دینی و اخلاقی زبوں حالی اور تہذیبی و معاشرتی بحران ہی کی طرح مسلمانوں کی معاشی بدحالی

اور تعلیمی پس ماندگی بھی بڑھتی جارہی ہے۔ اور عملاً وہ ادنیٰ درجہ کے شہری ہوگئے ہیں، ملک میں نہ ان کی کوئی قدر و قیمت ہے اور نہ وزن و اہمیت، فسادات میں جان و مال کا ضیاع اور عزت و آبرو کا لوٹا جانا ان کا مقدر بن گیا ہے۔ وہ راتوں کی سیاہی کا کیا گلہ کریں جب دن ہی کالے ہوگئے ہیں۔ ارباب سیاست انھیں کھلونے دیکھ بہلانا اور الیکشن کے موقع پر ان کی زبانی ہمدردی کی دو چار دلفریب باتیں کہہ کر ان کا حساب چکانا چاہتے ہیں ظلمت ایام کی اس سازش میں جہاں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت، سیاسی تنگ نظری اور اکثریت کا تعصب اور جارحانہ رویہ شامل ہے، وہاں خود مسلمانوں کی بھی اپنی تعمیر و ترقی کے مسائل سے عدم دلچسپی، ان کے مذہبی و گروہی اختلافات، تعلیم سے محرومی، اس کی جانب سے سراسر بے توجہی اور ان کے سیاسی شعور و بصیرت کے فقدان کو بھی بڑا دخل ہے۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمان اپنے دین و مذہب، اپنی تاریخ و تہذیب اور اپنی روایات اور اصل خصوصیات کو ترک کرتے جارہے ہیں اور دوسری طرف ملک میں وہ نہایت بے اثر اور غیر اہم ہوگئے ہیں۔ اور یہ ایسا المیہ ہے جس پر واقعی ایمانی و اسلامی حرارت رکھنے والے اور ملی و قومی غیرت و حمیت میں سرشار، دردمند مسلمانوں کے دل جل کر کباب ہورہے ہیں۔ اور ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں ہیں۔ وہ حیران ہیں کہ جس قوم کا ماضی اتنا شاندار رہا ہو، جس کے ہاتھوں میں قوموں کی باگ ڈور تھی جس نے اپنے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سکہ دنیا پر بٹھا دیا تھا اور جس نے یورپ کو بھی علم و ہنر کی روشنی عطا کی تھی اور جس کے زریں کارناموں کی بدولت ہندوستان جنت نشان بن گیا تھا، آج وہ کیوں اس قدر بے حس و حرکت اور دوسروں کا لقمۂ تر بن گئی ہے ؎

وہ زمانہ کیا ہوا جب مری آہ میں اثر تھا ٭ یہی چشم خوں فشاں تھی یہی دل یہی جگر تھا

باوجودیکہ مسلمان ملک کی بالا دست قوم کے رنگ وروپ کو اختیار کرتے جارہے ہیں. اور اکثریت کی چھاپ روز بروز ان پر گہری ہو رہی ہے۔ اور وہ اس کی خوشنودی کے لیے اپنی خودی و خودداری ترک کرتے جارہے ہیں. پھر بھی وہ معتوب ہیں اور ساقی کی نگاہیں ان کی طرف سے پھری ہوئی ہیں اور ان کے حصہ میں درد تہ جام بھی نہیں ہے، آئے دن انھیں غداری اور قوم و وطن فروشی کے طعنے سننا پڑتے ہیں. کبھی ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی دھمکی انھیں دی جاتی ہے اور کبھی ان سے اپنے پرسنل لا کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے. کبھی مسجدوں کو اکثریت کے حوالے کرکے ان کو مندروں میں بدل دینے پر زور دیا جاتا ہے. کبھی قومی دھارے میں ضم ہو جانے اور اپنا بھارتیہ کرن کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے. کبھی عرب و ایران اور مکہ و مدینہ کی طرف نظر اٹھانے کے بجائے کاشی و متھرا کے گن گانے کی فرمائش کی جاتی ہے. اور کبھی محمد عربی فداہ ابی وامی صلی اللہ علیہ وسلم کا طوقِ غلامی نکال کر اکثریت کے پورجوں کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال لینے اور قرآن مجید کے بجائے وید اور گیتا سے رہنمائی حاصل کرنے کا اپدیش دیا جاتا ہے۔ آخر ؎ اس غم کی تلافی کیا ہوگی، اس درد کا درماں کیا ہوگا۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل ذہنی و فکری ارتداد کے دہانے پر پہونچ گئی ہے۔ اور وہ اپنی حالت تبدیل کرنے اور غفلت و مدہوشی ترک کرنے کے لیے تیار نہیں دکھائی دیتی. لیکن اب بھی اس قوم میں خال خال وہ افراد نظر آتے ہیں. جو اشکِ سحرگاہی سے وضو اور دعائے نیم شبی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں، اسی سے امید ہے کہ ہند میں سرمایۂ ملت محفوظ رہے گا. لیکن اس کے لیے قوم کو بیدار کرنے کی مہم چلانا ہوگی اور فکر و تدبیر اور تگ و دو کو بڑھانا ہوگا ؎

نوا را تیز تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی

مقالات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں
مدینہ کے یہود

از مولوی بلال عبدالحیٔ حسنی ندوی صاحب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس زمانہ میں ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تھے اس وقت وہاں دو طرح کے یہودی پائے جاتے تھے ایک وہ جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل سے تعلق رکھتے تھے، دوسری قسم ان یہودیوں کی تھی جن کا نسلی تعلق حضرت یعقوبؑ سے نہیں تھا بلکہ انھوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا تھا، آگے معلوم ہوگا کہ اس قسم کے یہودیوں کی تعداد بہت کم تھی تاہم بعض قبائل بنوانیف و بنومرید وغیرہ کے بارے میں تاریخی طور سے یہ ثابت ہے کہ وہ یہودی ہوگئے تھے۔

نسلی یہودیوں کی مدینہ منورہ میں آمد کا زمانہ اور اس کے اسباب

مدینہ میں یہود کے سکونت پذیر ہونے کے زمانے اور یہاں آکر ان کے آباد ہونے کے اسباب و محرکات کے بارے میں مورخین و محققین کا بڑا اختلاف ہے، علامہ سمہودی تاریخ مدینہ کے مشہور عالم ہیں ان کی مشہور تصنیف وفاء الوفا اس موضوع پر ایک اہم مرجع خیال کی جاتی ہے، وہ کلبی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ یہود مدینہ منورہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں آباد ہوچکے تھے، انھوں نے یاقوت حموی

کے حوالہ سے بھی اسی طرح کا قول نقل کر کے اس رائے کو مرجح قرار دیا ہے۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں :۔

"حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے ساتھ حج کیا، واپسی میں جب یہ لوگ مدینہ سے گزرے تو انھوں نے اس کو ان اوصاف کا حامل پایا جو نبی آخر الزماںؐ کے مسکن کے بارے میں تورات میں بیان کیے گئے تھے، اس کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہیں سکونت اختیار کرلی" (وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ جلد ۱ ص ۱۵۷)

یہود کو تورات سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ایک نبی مبعوث ہونے والا ہے جو اس سرزمین میں قیام پذیر ہوگا جو حروں سے گھری ہوئی ہے اور جس میں کھجور کے باغات ہیں، اُس وقت مندرجہ ذیل چار جگہوں پر یہ خصوصیات منطبق ہوتی تھیں تیما، خیبر، فدک اور یثرب[1]، ابن النجار نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے مگر ان کے یہاں فدک کا ذکر نہیں ہے[2]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فلسطین میں آباد یہودیوں کو ان خصوصیات کی جامع سرزمین کی تلاش رہا کرتی تھی، اس سلسلہ کی دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں جن میں حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں یہودیوں کے مدینہ میں آباد ہونے کا تذکرہ موجود ہے۔

پہلی روایت یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کے لوگوں کو جن مقامات پر غزوات کے لیے بھیجا ان میں یثرب بھی تھا۔ اس وقت یہاں عمالقہ آباد تھے، حضرت موسیٰؑ نے تاکید کی تھی کہ جس قبیلہ پر بھی فتح حاصل ہو اس کے ہر ہر فرد کو قتل کر دیا جائے، غلبہ پانے کے بعد انھوں نے ایسا ہی کیا لیکن ایک خوب رو اور قد آور نوجوان کے

---

[1] المدینہ فی العصر الجاہلی، الدکتور الخطراوی [2] اخبار المدینہ لابن النجار ص ۱۰۰-

بارے میں وہ متردد ہوئے اور اس کے معاملہ کو حضرت موسیٰؑ سے مشورے کے لیے موقوف رکھا لیکن جب یہ لوگ واپس آئے تو ان کی وفات ہو چکی تھی، بنو اسرائیل کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا اس کھلی نافرمانی کے بعد تم لوگ یہاں نہیں رہ سکتے۔ لشکر کے لوگوں نے ان کا بگڑا ہوا تیور دیکھا تو باہمی مشورہ سے مفتوحہ علاقوں میں جانے اور وہیں بود و باش اختیار کر لینے کا فیصلہ کیا، اس طرح یہ لوگ مدینہ منورہ میں آباد ہو گئے[1]۔

ڈاکٹر نعمان اعظمی ندوی نے اپنی تازہ ترین کتاب مجتمع المدینہ میں اس واقعہ کا ماخذ تورات کے سفر سموئیل اول کو قرار دیا ہے[2]۔

گو یہ روایت قطعی الثبوت نہیں تاہم اس بارے میں صریح و صحیح روایت کی عدم موجودگی میں اس سے صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔ دوسری روایت جو زبیر بن بکار کی سند سے مورخین نے نقل کی ہے وہ یہ ہے :۔

حضرت موسیٰ و ہارون (علیہم السلام) حج کرنے گئے اور مدینہ منورہ سے گزرے تو وہاں کے یہود سے ان کو خوف محسوس ہوا چنانچہ یہ دونوں راہ بچا کر احد تشریف لائے، وہاں حضرت ہارونؑ پر سکرات کا عالم طاری ہوا تو حضرت موسیٰؑ نے ان کے لیے لحد تیار کی اور حضرت ہارونؑ سے کہا کہ آپ کا وقت قریب ہے تو حضرت ہارونؑ اٹھے اور لحد میں داخل ہوئے اور ان کی روح قبض کر لی گئی اور حضرت موسیٰؑ نے قبر پر مٹی ڈالی[3]۔

---

[1] اخبار المدینہ لابن النجار ص ۹ و ۱۰ والمدینہ فی العصر الجاہلی ص ۷۰، علامہ سہیلی نے اغانی کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے مگر اسے ضعیف قرار دیا ہے (الروض الانف ج ۲ ص ۱۷ طبع جمالیہ مصر) [2] ص ۳۵ [3] عمدۃ الاخبار ص ۱۹ وغیرہ۔

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں یہود حضرت موسیٰؑ کے عہد ہی میں آباد ہو گئے تھے چنانچہ بعض مورخین کا رجحان اسی طرف ہے لیکن بعض دوسرے مورخین کا رجحان اس کے برعکس ہے، مشہور مورخ علامہ طبری کا خیال ہے کہ یہود بخت نصر کے مظالم سے تنگ آکر مدینہ منورہ میں آباد ہوئے تھے[1] علامہ سہیلی کی بھی یہی رائے ہے[2]، ڈاکٹر محمد طنطاوی ان مختلف روایات کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہودی جب رومیوں کے مظالم سے تنگ آگئے تو مدینہ منورہ آکر آباد ہوئے اور یہ پہلی صدی عیسوی کا واقعہ ہے اسی موقف کو ڈاکٹر جواد علی نے اپنی کتاب تاریخ العرب قبل الاسلام میں اختیار کیا ہے[3]۔ اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی نے بھی اسے ایک تاریخی حقیقت بتایا ہے:-

"اس تاریخی حقیقت کو ترجیح حاصل ہے کہ یہود کی اکثریت جزیرۃ العرب میں عموماً اور شہر یثرب میں خصوصاً پہلی صدی مسیحی میں آئی مشہور یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتا ہے: " ۷۰ء میں جب رومی جنگ کے نتیجہ میں فلسطین اور بیت المقدس برباد ہو گئے اور یہود دنیا کے مختلف علاقوں میں بکھر گئے تو یہود کی بہت سی جماعتوں نے بلاد عرب کا رخ کیا جیسا کہ خود یہودی مورخ جوزیفس کہتا ہے جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھا اور عربی مآخذ بھی اس کی تائید کرتے ہیں"[4]

بعض کا خیال ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں یہود مدینہ

---

[1] تاریخ الامم والملوک ج ۲ ص ۳۸۱ [2] الروض الانف ج ۲ ص ۱۶ [3] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۷۰ و ما بعد [4] نبی رحمت ص ۱۶۲۔

آسے اور بعض نے حزقیال کے دورِ حکومت میں مدینہ میں ان کے اور یہود کے بود و باش اختیار کرنے کا ذکر کیا ہے انھوں نے ۷۰۱ قبل مسیح سے ۶۹۰ ق م تک حکومت کی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں :۔

۱۔ مدینہ منورہ میں حضرت موسیٰؑ سے بہت پہلے عمالقہ آباد تھے جو بڑی قوت و شوکت کے مالک تھے۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں کچھ یہودی بھی یہاں آئے۔

۳۔ بخت نصر نے جب بیت المقدس کو تاراج کیا اور یہودیوں پر مظالم ڈھائے تو مدینہ میں یہودیوں کی آبادی میں مزید اضافہ ہوا اور انکی قوت بھی بڑھی۔

۴۔ پہلی صدی مسیحی میں رومیوں کے دردناک مظالم سے تنگ آکر یہود یہاں بڑی تعداد میں آباد ہوئے اور انھوں نے یہاں کی آبادی دوسری قوموں کو مغلوب کرکے بڑا اثر و اقتدار حاصل کیا، دور دور تک ان کی بستیاں پھیل گئیں اور یہاں کی معیشت پر ان کا پورا قبضہ ہو گیا اور تعلیمی و تمدنی حیثیت سے بھی ان کو بڑا عروج حاصل ہوا۔

عرب کے یہود یہودیت ایک دعوتی مذہب تھا لیکن اپنے ناخلف متبعین کی وجہ سے یہ نسلی مذہب بن گیا تھا اور اس کو تبلیغ و دعوت سے سرے سے کوئی واسطہ نہیں رہ گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ مدینہ میں یہود کے غیر معمولی اثر و رسوخ کے باوجود ان کے مذہب کو بڑی محدود تعداد میں عربوں نے اختیار کیا تھا، پہلے گزر چکا ہے کہ صرف دو تین قبائل ہی نے من حیث القبیلہ یہودیت اختیار کی تھی، ان کے علاوہ بعض اشخاص نے انفرادی حیثیت سے بھی یہ مذہب اختیار کیا تھا جیسے کعب بن اشرف جس کا تعلق قبیلہ طے سے تھا۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ جن لوگوں نے یہودی مذہب اختیار کیا تھا انھوں نے یہود کی دعوت وتبلیغ کے نتیجہ میں اسے قبول نہیں کیا تھا بلکہ اس کے کچھ اندرونی اسباب تھے، ایک سبب تو یہودیوں کا علمی وتمدنی دباؤ تھا دوسرے سبب کا ذکر سنن ابی داؤد کی اس روایت میں ملتا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

> "مدینہ میں دستور تھا کہ عورت کے بچہ نہ ہوتا تو وہ نذر مانتی کہ اگر اس کے بچہ پیدا ہوا اور وہ زندہ رہا تو وہ اس کو یہودی بنائے گی چنانچہ جب بنونضیر جلاوطن کیے گئے تو ان میں انصار کے بہت سے بچے موجود تھے اس لیے وہ کہنے لگے کہ ہم اپنے بچوں کو نہیں جانے دیں گے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی کہ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ: ۲۵۶) دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں"۔ (سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد باب الاسیر یکرہ علی الاسلام)

یہاں اس بات کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ایک طرف تو بعض مورخین کا خیال یہ ہے کہ کوئی بھی عرب قبیلہ من حیث القبیلہ یہودی نہیں ہوا جیسا کہ ابتدا میں گزرا مگر دوسری طرف بعض مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ مدینہ اور اطراف مدینہ میں کوئی نسلی یہودی نہیں تھا بلکہ یہاں کے تمام باشندے عرب تھے۔ یعقوبی کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے[1] لیکن نہ اس کی کوئی واضح دلیل موجود ہے اور نہ ہی قرآنی سیاق اور واقعات وشواہد سے اس کی تائید ہوتی ہے بلکہ قرآن مجید کا انداز تخاطب

---

[1] المدینہ فی العصر الجاہلی ص ۲۷، ۳۰، بعض نے یہی قول علامہ حموی کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن علامہ سمہودی نے ان کا جو قول وفاء الوفا میں نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔

اس کے برعکس ہے چنانچہ وہ مدینہ کے یہود کو بھی بنی اسرائیل کہہ کر خطاب کرتا ہے جو اس کی واضح دلیل ہے کہ وہ نسلی یہود ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوگا کہ وہ سب کے سب نسلی یہود تھے اور ان میں کوئی بھی عرب نہ تھا اسلیے کہ روایات اور واقعات اس کا ساتھ نہیں دیتے اور یہ بات قرآنی سیاق کے خلاف بھی نہیں ہے اسلیے کہ بنی اسرائیل کے خطاب میں یہود کی اکثریت کی رعایت مدنظر رکھی گئی ہے کیونکہ عرب کے یہودیوں کی تعداد تو بہت ہی کم تھی۔

مدینہ منورہ کے یہودی قبائل علامہ سمہودیؒ کی تحقیق کے مطابق یہودی قبائل کی تعداد ۲۰ سے زیادہ تھی، جمہور مورخین بھی اسی کے قائل ہیں لیکن بعض نے ۱۲ اور بعض نے اس سے کچھ کم یا بیش تعداد لکھی ہے، جن مورخین نے کم تعداد بتلائی ہے انھوں نے بطون کو اصل قبیلوں میں ضم کردیا ہے اور جنھوں نے تعداد زیادہ بتلائی ہے انھوں نے بطون کا الگ سے ذکر کیا ہے۔ راقم کو جن بطون کا نام ل سکا ان کا بھی ذکر کردیا ہے اس طرح قبائل کی تعداد ۳۵ تک پہنچ گئی ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) **بنوانیف**۔ عربی قبیلہ ہے قبار میں ان کا قیام تھا۔

(۲) **بنوالقُصیص**۔ یہ بھی بنوانیف کے ساتھ قبا ہی میں مقیم تھے۔

(۳) **بنو قریظہ**۔ یہ یہود مدینہ کے تین بڑے قبیلوں میں سے ایک تھا اس کا قیام حرّہ قریظہ میں وادی مہزور کے سرے پر تھا جو مدینہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے۔

(۴) **بنو عمرو**۔ یہ عربی قبیلہ ہے اور بنو قریظہ کے ساتھ ہی مقیم تھا۔

(۵) بنو ھدل یہ بھی بنو قریظہ کے ساتھ ہی مقیم تھے بعض مورخین نے اس کا نام بنو بہدل لکھا ہے۔

(۶) بنو نضیر مدینہ کے یہود کے تین اہم قبیلوں میں سے ایک یہ بھی تھا، اس کا مسکن نواعم میں وادی مذینیب کے انتہائی حصہ پر زہرہ میں تھا جو مدینہ کے جنوب مشرق میں واقع ہے اسی وادی میں کعب ابن اشرف کا مشہور قلعہ بھی تھا جو قبیلہ طے سے تھا اور جس کے والد نے یہودیت کو اختیار کر لیا تھا[1]۔

(۷) بنو فریذ (۸) بنو ماسکہ بعض مورخین نے اسکو بنو ماسلہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔

(۹) بنو محمم (۱۰) بنو معاویہ یہ مدینہ کے مشرق میں آباد تھے۔

(۱۱) بنو زعورا (۱۲) بنو زید اللات

(۱۳) بنو قینقاع یہ بھی یہود کے تین اہم قبیلوں میں سے ایک ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا[2] علامہ ابن حجرؒ اور سمہودی نے اسے حضرت یوسفؑ کی اولاد بتایا ہے، یہ قبیلہ صنعت اور زرگری میں مشہور تھا اس کا مسکن وادی بطحان میں تھا[3]

(۱۴) بنو حجر اس کا قیام زہرہ میں تھا جس کو اس وقت مدینہ کا سب سے بڑا علاقہ بتایا جاتا ہے

(۱۵) بنو ثعلبہ اس کا مسکن بھی زہرہ تھا، عبداللہ بن صوریا جس کو تورات

---

[1] آثار المدینۃ المنورۃ ص ۱۵۴ [2] وفاء الوفاء ج ۱ ص ۱۶۴ وسیرۃ ابن ھشام ج ۱ ص ۵۱۵ [3] السیرۃ النبویۃ للعلامہ دحلان الشافعی علی ھامش السیرۃ الحلبیۃ ص ۲۔

کا بڑا عالم بتایا جاتا ہے اسی قبیلہ کا تھا اور فطیون[1] بھی اسی قبیلہ سے ہوا کرتا تھا۔

(۱۶) **یہود جوانیہ** شمالی مدینہ میں احد کے قریب ایک جگہ کا نام ہے یہیں اس قبیلہ کا قیام تھا۔

(۱۷) **بنو عکوہ** (۱۸) **بنو مرابہ**۔

(۱۹) **یہود راتج** علامہ سمہودی کی رائے یہ ہے کہ یہ یہود بنو النجار ہیں جو راتج منتقل ہو گئے تھے۔ (۲۰) **یہود ثیرب**۔

(۲۱) **بنو ناعصہ** ابن النجار نے اس کو ناعصہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ شعب حرام میں ان کا قیام تھا، جیسا کہ ڈاکٹر خطراوی کا خیال ہے لیکن علامہ سمہودیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ بھی بنو انیف کے ساتھ قبا ہی میں مقیم تھے۔ شعب حرام والی روایت کو انھوں نے مرجوح قرار دیا ہے[2]۔

(۲۲) **یہود زبالہ**
(۲۳) **یہود غنابس**
(۲۴) **یہود والج**

علامہ سمہودیؒ نے ان کا تذکرہ کیا ہے جو مختلف علاقوں میں مقیم تھے[3]۔

(۲۵) **یہود بنو لقمعہ**
(۲۶) **بنو غرابہ**

ان دونوں قبیلوں کا ذکر دسویں صدی کے شیخ احمد بن عبدالحمید عباسی نے اپنی کتاب عمدۃ الاخبار میں کیا ہے[4]۔

---

[1] فطیون عبرانی لفظ ہے جو ہر اس شخص کا لقب ہوتا تھا جو یہود کا سردار ہو (الروض الانف ج ۲ ص ۲۴) [2] وفاء الوفاء ص ۱۶۵ [3] ایضاً [4] عمدۃ الاخبار ص ۱۹۔

(۲۷) بنو الحارث ابن اسحاق نے بنو الحارثہ کے نام سے اپنی سیرت میں اس کو یہودی قبائل میں ذکر کیا ہے[1] یہ شمال مشرق میں وادی قناۃ کے جنوبی حصہ میں مقیم تھے۔

(۲۸) بنو عوف
(۲۹) بنو ساعدہ
(۳۰) بنو النجار
(۳۱) بنو جشم
(۳۲) بنو اوس

ابن اسحاق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جس عہدنامہ کا ذکر کیا ہے اور جس کو آپؐ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمانے کے بعد لکھوایا تھا اس میں ان قبائل کا ذکر بطور یہود کے موجود ہے۔

(۳۳) بنو جفنہ یہ بنو ثعلبہ کے بطون میں سے تھا۔

(۳۴) بنو شطبیہ سیرت و تاریخ کی کتابوں میں اس کو بھی یہودی قبائل میں درج کیا گیا ہے۔

(۳۵) بنو زریق بدبخت لبید بن اعصم کا تعلق جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا اسی قبیلہ سے تھا۔

سیل عرم کے بعد مدینہ میں اوس وخزرج کی آمد اور یہود پر ان کا غلبہ یہود مدینہ میں اسی اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے اور ان کو وہاں پورا غلبہ حاصل تھا کہ ملک یمن میں سیل عرم کا مشہور واقعہ پیش آیا جو درحقیقت وہاں کے باشندوں پر ایک عذاب تھا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

فَاَعْرَضُوْا فَاَرْسَلْنَا پھر دھیان میں نہ لائے پس چھوڑ

---

[1] سیرت ابن ھشام ج ۱ ص ۱۷۶ -

عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ (سبا:۱۶) دیا ہم نے ان پر نالہ زور کا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیوی نعمتوں سے مالا مال اور ان کے لیے ہر طرح کے عیش و تنعم کا سامان مہیا کیا تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ	اور رکھی تھی ہم نے ان میں اور
الْقُرَى الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا	ان بستیوں میں جہاں ہم نے
قُرًى ظَاهِرَةً (سبا:۱۸)	برکت رکھی ہے بستیاں راہ پر نظر آتیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِي مَسْكَنِهِمْ	قوم سبا کو تھی ان کی بستی میں نشانی،
آيَةٌ جَنَّتَانِ عَنْ يَمِينٍ وَ	دو باغ داہنے اور بائیں، کھاؤ
شِمَالٍ كُلُوا مِنْ رِزْقِ رَبِّكُمْ	روزی اپنے رب کی اور اس کا
وَاشْكُرُوا لَهُ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ	شکر کرو، دیس ہے پاکیزہ اور
وَرَبٌّ غَفُورٌ (سبا:۱۵)	رب ہے گناہ بخشتا۔

اہل سبا کے سلسلہ وار سرسبز و شاداب علاقے تھے انہیں ہر طرح کی راحت کا سامان مہیا تھا اور وہ بالکل مامون تھے لیکن انھوں نے اللہ کی اس عظیم نعمت کی قدر نہ کی اور ان نعمتوں سے اکتا کر کہنے لگے:

رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا	پھر کہنے لگے، اے رب فرق ڈال
(سبا:۱۹)	ہمارے سفر میں۔

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو تاخت و تاراج کر دیا:

وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا:۱۹) اور چیر کر کر ڈالا ٹکڑے۔

اس سیلاب میں بے شمار لوگ ہلاک ہوئے اور قوم سبا کا شیرازہ بکھر گیا اور جو باقی بچے ان میں سے کچھ حجاز کی طرف آئے یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں[1]۔ حجاز آنے والوں میں ایک شخص ثعلبہ بن عمرو تھا جس کے دو فرزند تھے ایک کا نام اوس اور دوسرے کا خزرج تھا ان کی اولاد مدینہ میں آباد ہوئی۔ یہ لوگ ایک مدت تک تو یہود سے علٰحدہ زندگی بسر کرتے رہے پھر ان کا زور و اثر دیکھ کر بالآخر ان کے حلیف بن گئے[2]۔ ایک عرصہ تک یہ حالت باقی رہی لیکن اسی دوران اوس و خزرج کا قبیلہ پھیلتا گیا اور اسکو ایک طرح کی قوت حاصل ہو گئی اس سے یہود کو خطرہ محسوس ہوا چنانچہ انھوں نے معاہدہ فسخ کر دیا اور یہودی امرا نے اوس و خزرج پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے شروع کر دیے[3]۔ ایک بدکار و ظالم یہودی امیر فطیون[4] نے تو یہ حکم جاری کیا تھا کہ جو لڑکی بیاہی جائے پہلے وہ اس کے شبستان عیش میں آئے، یہودیوں نے تو اس حکم کو گوارا کر لیا لیکن انصار نے سرتابی کی اس زمانے میں ان کا امیر مالک بن عجلان تھا اپنی بہن کی شادی کے دن وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ وہ اس کے سامنے سے بے پردہ گزری مالک کو غیرت آئی اور گھر واپس آکر اس نے اپنی بہن کو سخت تنبیہ کی اس پر اس نے کہا کہ جو کل ہونے والا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے، دوسرے دن حسب دستور جب مالک کی بہن دلہن بن کر فطیون

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام ص ۱۱-۱۲ ج ۱ اور وفاء الوفا ج ۱ ص ۱۶۶ اور اس کے بعد

[2] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۵۹ و اخبار المدینہ ص ۱۳ [3] اخبار المدینہ لابن النجار ص ۱۳ [4] فطیون سے متعلق حاشیہ گذر چکا ہے کہ یہ یہودی امیر کا لقب ہوا کرتا تھا۔ الروض الانف ج ۲ ص ۴۴ [5] یہود بھی اس حکم سے مستثنیٰ نہ تھے۔

کی خلوت گاہ میں گئی تو مالک بھی زنانے کپڑوں میں ملبوس سہیلیوں کے ساتھ ہو لیا اور موقع پاکر فطیون کو قتل کر ڈالا، اس واقعہ سے انصار کے حوصلے بڑھ گئے اور انھوں نے یہود کی قوت کو توڑنا چاہا لیکن یہ تنہا ان کے بس کا کام نہ تھا اسلئے انھوں نے ملک شام سے مدد چاہی[1] یہاں ابو جبیلہ حکمراں تھا اور بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے تبع سے مدد چاہی تھی[2]۔ ابو جبیلہ نے اوس و خزرج کا ساتھ دیا اور ایک بھاری فوج لے کر آیا پہلے تو اوس و خزرج کے افراد کو بلا کر انعام سے نوازا پھر رؤسائے یہود کی دعوت کی اور ایک ایک کو قتل کر ڈالا[3]۔ اس طرح یہود کا زور ٹوٹ گیا اور اوس و خزرج نے از سر نو قوت حاصل کر لی اس سے قبل ان کو اپنی کمزوری کی بنا پر یہود سے معاہدہ کی ضرورت پیش آئی تھی اور اب ان ہی قبائل سے خود یہود معاہدہ کرنے کے لیے مجبور ہوئے[4]، بنو نضیر اور بنو قریظہ کو تو شہر چھوڑ کر جانا اور اوس کی پناہ لینی پڑی، بنو قینقاع شہر ہی میں خزرج کی پناہ میں رہے اول الذکر دونوں قبیلوں سے ان کی ان بن تھی اور یہ قبیلہ ان سے قوت و سرمایہ داری میں بڑھا ہوا تھا[5]

---

[1] اخبار المدینہ ص ۱۳۱ [2] علامہ سمہودیؒ کا بیان ہے کہ اصل میں تو انھوں نے جبیلہ سے مدد مانگی تھی لیکن تبع نے بھی ساتھ دیا [3] یہ واقعہ وفاء الوفاء، سیرۃ النبی جلد اول مصنفہ علامہ شبلی نعمانیؒ اور دوسری کتب تاریخ و سیرت میں موجود ہے [4] بنی رحمت ج ۱ ص ۱۷۵ بحوالہ تاریخ العرب قبل الاسلام جلد چہارم [5] صاحب سیرت حلبیہ بنو قینقاع کے بارے میں لکھتے ہیں۔ اشجع قوم من الیہود واشجعہم (ج ۳ ص ۳۲۰) علامہ شبلیؒ نے بھی اپنی کتاب سیرۃ النبی ج ۱ کے صفحہ نمبر ۳۹۵ پر یہی بات لکھی ہے دوسرے مورخین اور سیرت نگار بھی یہی لکھتے ہیں۔

اوس وخزرج کا باہمی جدال وقتال یہودیوں کی اس پسپائی کے بعد اوس وخزرج ایک مدت تک امن وچین سے زندگی گزارتے رہے لیکن مکر وسازش یہود کی سرشت میں داخل ہے، ان کو اوس وخزرج کا اتحاد واستحکام ایک نظر نہیں بھاتا تھا اس لیے وہ دن ورات ان میں انتشار پیدا کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے گو خود ان کی صفوں میں بھی اتحاد نہ تھا تاہم وہ اپنی کوشش میں برابر لگے رہے بالآخر ان کی کوششیں رنگ لائیں اور وہ اوس وخزرج کے درمیان تفرقہ ڈالنے میں کامیاب ہو گئے چنانچہ ان میں جنگ وجدال شروع ہو گیا اور اس کا سلسلہ ایک سو بیس سال تک جاری رہا جنگ بعاث اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس میں ان کی معیشت کی بربادی کے علاوہ ان کے اہم ترین افراد بھی کام آئے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور انھوں نے اسلام قبول کیا تو اس عظیم نعمت کی بدولت اللہ نے انکے اندر الفت ومحبت پیدا کر دی ارشاد ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ	اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر
إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ	جب تھے تم آپس میں دشمن پھر الفت
بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ	دی تمھارے دلوں میں اب ہو گئے
بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (آل عمران ۱۰۳)	اسکے فضل سے بھائی۔

لیکن تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد بھی یہودیوں نے اپنی دسیسہ کاریوں میں کوئی کمی نہیں کی اور وہ برابر اوس وخزرج میں پھوٹ ڈالنے اور انہیں تباہ و برباد کرنے کی سعی وسازش کرتے رہے۔

یہود کا دینی ودنیاوی تفوق مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"یہ لوگ علوم انبیاء و معارف اولیاء کے حامل تھے، مالدار تھے، ساہوکار تھے ساتھ ہی ساتھ سفلی عملیات سحر و کہانت کے بھی بڑے ماہر تھے، حجاز کی آبادی میں اس دینی و دنیوی تفوق کی بنا پر اہمیت انہیں اس وقت اچھی خاصی حاصل تھی، مشرکین ایک طرف تو ان کے علم و فضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے تو دوسری طرف اکثر ان کے قرضدار بھی رہا کرتے تھے گویا دینی و دنیوی اکثر حاجتوں میں انہیں کو مشکل کشا جانتے تھے اور جیسا کہ عام قاعدہ ہے کہ منظم و قاہر قوموں کے تمدن سے کمزور اور غیر منظم قومیں مرعوب و متأثر ہو جاتی ہیں مشرکین عرب بھی ان سے متاثر تھے" (تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۸۶)

مولانا کے اس بیان سے یہود کی عظمت و برتری کا ایک اجمالی خاکہ سامنے آجاتا ہے، اب ان کی معاشی، اقتصادی، تعلیمی، ثقافتی، سیاسی و اجتماعی حالت کا جائزہ تفصیل سے لیا جاتا ہے۔

معاشی و اقتصادی حالت اوس و خزرج کی آمد سے پہلے زراعت و صناعت پر یہود کا پورا غلبہ تھا اور تجارت ہی ان کا خاص پیشہ تھا اور ان کے بعض افراد ممتاز تاجر کی حیثیت سے نہایت مشہور تھے چنانچہ سلام بن ابی الحقیق تاجر اہل الحجاز کہلاتے تھے۔ گیہوں، جو، کھجور اور شراب کی منڈیوں پر یہود ہی قابض تھے[1] اس لیے اقتصادی حیثیت سے ان کی حالت بہتر تھی، انصار غالب ہوئے تو زراعت پر ان کا قبضہ ہو گیا لیکن صنعت و تجارت اب بھی یہود ہی کے ہاتھ میں رہی[2]، اور زراعت کی کمی پورا کرنے کے لیے انھوں نے

---

[1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۹، [2] ان قبائل میں بنو قینقاع (بقیہ ص ۳۴۰ پر)

سودی قرضے دینے شروع کر دیے جس سے ان کو کافی آمدنی ہوئی۔

سیاسی استحکام کے باوجود اوس و خزرج کے معاشی عدم استحکام کے کئی اسباب تھے۔

پہلا سبب خود ان کی باہمی معرکہ آرائیاں تھیں جنھوں نے ان کو تباہ کرکے رکھ دیا اور جن کی وجہ سے یہودیوں کو پھر سر اٹھانے کا موقع ملا۔

دوسرا سبب یہود کی بدباطن فطرت ہے ان کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ وہ نہایت حریص و طماع اور ذخیرہ اندوز واقع ہوئے تھے اس کے مقابلہ میں عرب اپنے بدوی مزاج کی وجہ سے مستقبل کی فکر سے آزاد اور مال جمع کرنے کے معاملہ میں بے پرواہ تھے ان کی مہمان نوازی اور فیاضی ضرب المثل تھی اس لیے وہ اکثر یہود سے قرض لینے کے لیے مجبور رہتے تھے۔

تیسری وجہ زراعت کا پیشہ ہے جس میں عام طور سے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور انصار کا سارا دار و مدار اسی پر تھا اس بنا پر یہود کو انکے استحصال کا پورا موقع ملا اور سیاسی مغلوبیت کے باوجود انکی معاشی برتری قائم رہی۔

اقتصادیات پر تسلط کیوجہ سے یہود منڈیوں میں من مانی کرتے مصنوعی قلت پیدا کرکے چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی سے کام لیتے اسیلئے مدینہ کی اکثریت انکی دھاندلی سود خوری نفع اندوزی اور ان جیسی دوسری شرمناک حرکتوں کیوجہ سے ان سے نفرت کرنے لگی تھی لیکن یاد رہے کہ نفرت کا سبب انکے یہ گھناونے افعال تھے ورنہ اہل مدینہ کے نزدیک انکا ملی و دینی تفوق مسلم تھا۔ (باقی)

(بقیہ ص ۳۳۹) خاص طور سے زرگری کا پیشہ کرتے تھے اور چونکہ بہادری و شجاعت میں بھی وہ بڑھے ہوئے تھے اسلیے انکے پاس جنگی اسلحے کا ذخیرہ بھی رہتا تھا سیرۃ النبی ج ا ص ۳۹۵ ؎ بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۹۷۔

دارا شکوہ کے عارفانہ دعوے

از

ڈاکٹر عبدالرب عرفان، کامٹی

(۲)

حصولِ معرفت کا دعویٰ دارا شکوہ کی ملا شاہ سے پہلی ملاقات ۱۲ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کو ہوئی[۱]۔ اس پہلی ہی ملاقات میں وہ ان سے بیعت بھی ہو گیا۔ اس ملاقات کی روداد وہ یوں بیان کرتا ہے:

"پہلی بار جب یہ فقیر ان کی خدمت شریف میں پہنچا تو چونکہ انھوں نے مجھے کبھی نہیں دیکھا تھا، میرا نام پوچھا۔ میں نے کہا: فقیر۔ انھوں نے کہا: فقیر کا بھی ایک نام ہوتا ہے۔ میں نے کہا: حضرت پر ظاہر ہے۔ فرمایا: معلوم ہو گیا اور فقیر کا ہاتھ پکڑ کر پہلو میں بٹھا کر اس پہلی بار ہی میں اتنی زیادہ نوازشیں اور عنایتیں کیں جو خواب و خیال میں بھی نہ تھیں[۲]۔"

پھر دارا نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرنے کی غرض سے ملا شاہ کی یہ رباعی پڑھی:

آن گم شدہ باللہ خدا آگاہ است ۔۔۔ افتادہ یقین بدست ملا شاہ است
نرمک نرمک درآی و آہستہ بگو ۔۔۔ در گوش کسی کہ طالب اللہ است[۳]

۱؎ سکینۃ الاولیاء ص ۷۰ ۲؎ ایضاً ص ۷۷ ۳؎ ایضاً ص ۲ ـ ۱۶۱ ـ

(وہ گم شدہ، خدا کی قسم، خدا شناس ہے ، وہ بالیقین ملاشاہ کے ہاتھ آگیا ہے؛
چپکے چپکے آ (اور یہ بات) دھیرے سے کہہ ، اس شخص کے کان میں جو اللہ کا طالب ہے)
یہ سن کر ملاشاہ نے کہا: تمہارا مطلب یہ ہے اور تم اس کام کے لیے آئے ہو۔ دارا نے کہا:
درحقیقت اس مطلب کے سوا کوئی اور مطلب متصور ہی نہیں، اس کے سوا ہر کام
بے سود ہے۔ اس بات سے ملاشاہ بہت خوش ہوئے اور مزید عنایت کے ساتھ
فرمایا: "میں نے اس گم شدہ کو پالیا" اور کہا: "یہ رباعی بھی ہم نے کہی ہے":

آن کس کہ زروی صدق دولتخواہ است ، آخر و را بسوی دولت راہ است
دولت یعنی معرفت اللہ است ، این دولت در خانۂ ملاشاہ است[1]

(وہ شخص جو صدق دل سے دولت کا طالب ہے ، آخر اسکے لیے دولت کی جانب راہ ہے
دولت یعنی اللہ کی معرفت ہے ، یہ دولت ملاشاہ کے گھر میں (موجود) ہے)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس "گم شدہ" کو اپنے "دام عقیدت" میں اسیر کرنے کا منصوبہ
بنا کر ملاشاہ نے منقولہ بالا دونوں رباعیاں پہلے ہی کہہ رکھی تھیں۔ پہلی رباعی اپنے کسی
ایسے مرید کے توسط سے جسے دارا کا تقرب حاصل رہا ہوگا، اس تک پہنچا دی۔ پھر جب
وہ اچانک ان کی خدمت میں آپہنچا (یا کسی تدبیر سے پہنچا یا گیا) تو رسمی تعارف کے بعد
اس "گم شدہ" کی بازیافت کا اعلان فرما دیا۔ پھر دوسری رباعی سنا کر "دولت
معرفت" سے اپنا گھر معمور ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ دولت معرفت سے دارا کا دل
پل بھر میں کس طرح مالا مال ہوتا ہے، خود اسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"فقیر بے اندوہ محمد داراشکوہ کہتا ہے کہ چونکہ میں ہمیشہ بادشاہ مطلق اور مالک حقیقی

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۶۲۔

سے خواہش کرتا تھا کہ وہ مجھے اپنے دوستوں اور چاہنے والوں میں شامل کرلے اور اپنی معرفت کے جام سے ایک گھونٹ چکھا دے اور دل مراد کو پہنچا دے اور بغیر خود سے رہائی دلادے ..... اس عاجز کے سوال کو اس نے قبولیت بخشی جمعرات کے روز پچیس سال کی عمر میں، میں نیند میں تھا کہ ہاتف نے آواز دی اور چار بار کہا کہ جو چیز روئے زمین کے بادشاہوں میں سے کسی کو میسر نہیں ہوئی خدائے تعالیٰ نے تجھے عطا کی۔ بیدار ہونے کے بعد میں نے سوچا کہ اس طرح کی سعادت یقیناً معرفت ہوگی ...... اور میں ہمیشہ اس عظیم دولت کا طالب رہنے لگا یہاں تک کہ (خدا نے) مجھے ۱۲ ذی الحجہ ۱۰۴۹ھ کی رات جب میں پچیس سال کا تھا، اپنے دوستوں میں سے ایک کی خدمت میں پہنچا دیا اور اس عزیز کو مجھ پر اتنا مہربان کر دیا کہ کوئی شخص اس سے جتنا کچھ ایک سال میں پاتا تھا، میں نے پہلی رات میں پالیا اور جتنا کچھ ایک سال میں پاتا تھا مجھے ایک ماہ میں میسر آگیا اور اگر کوئی طالب کسی دوسرے (مرشد) کے پاس برسوں کی ریاضت اور مجاہدے کے بعد پاتا تھا، سو میں نے اس کے فضل سے ریاضت کے بغیر پالیا اور دفعۃً دونوں جہاں کی محبت میرے دل سے نکل گئی اور میرے دل پر فضل و رحمت کے دروازے کھل گئے اور میں جو چاہتا تھا اس نے مجھے دیا۔ اب اگرچہ میں اہل ظاہر ہوں لیکن ان میں سے نہیں ہوں اور ان کی بے خبری اور آفت کو جان گیا ہوں اور اگرچہ درویشوں سے دور ہوں مگر ان میں سے ہوں۔[1]"

اس دعوے کا تجزیہ | منقولہ بالا عبارت کا فقرہ "آنچہ ہیچ یکی از پادشاہان روی زمین

---

[1] سکینۃ الاولیا (تہران): ص ۶ - ۵۔

میسر نشدہ..." اس "معرفت" کی تخصیص کر رہا ہے جو دارا کو مطلوب تھی۔ اسے اپنی اس معرفت پر، جس کی حقیقت خود اس پر روشن تھی، قناعت کر کے اور ہندوستان کے تخت و تاج سے دست بردار ہو کر گھاٹے کا سودا کرنا منظور نہیں تھا۔ اس کی نگاہیں تختِ طاؤس پر مرکوز تھیں۔ اگر اس کے "دل سے دنیا کی دوستی نکل جانے" کے دعوے میں صداقت ہوتی تو وہ "کین جوئی" اور "تقابو طلبی" کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہ اپنے بھائیوں کی مہموں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا[1] اور نہ شاہجہاں کی علالت کے دوران اپنی بعض غیر دانشمندانہ اور خلافِ مصلحت حرکتوں سے ایسے حالات پیدا کرتا جو تخت نشینی کی خوں ریز جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتے۔ علاوہ بریں عبارت کے اختتامی جملے میں اس کا اصل مدعا یہ ہے کہ لوگ اسے ایک ایسی شخصیت تسلیم کر لیں جس کا ظاہر شاہی ہو اور باطن درویشی۔ اب اس پس منظر میں "پادشاہان روی زمین" کے ممتاز ناموں کو شمار کیجیے، ان میں حضرت سلیمانؑ اور حضرت یوسفؑ کے نام بھی نظر آئیں گے۔ کیا دارا کا یہ دعویٰ کہ "جو چیز روی زمین کے بادشاہوں میں سے کسی ایک کو بھی میسر نہیں، خدا نے اسے عطا کی" در پردہ ان پر اپنی فوقیت جتانے کے مترادف نہیں؟ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ انتہا پسند صوفیوں کے نزدیک معرفت کو نبوت پر برتری حاصل ہے[2]۔ اسکی

---

[1] شاہنواز خاں جسے عالمگیر دشمن مورخوں کی صفِ اول میں شمار کیا جاتا ہے، لکھتا ہے کہ دارا شکوہ "کین جوئی" اور "تقابو طلبی" کی خاطر اپنے بھائیوں کی مہموں کو ناکام بنانے کی کوشش کرتا تھا (ماثر الامرا، جلد اول: ص ۷۶۹) [2] نبوت پر معرفت کی برتری کے بالواسطہ اظہار کی غرض سے دارا اپنے پیر کا بیان کردہ یہ واقعہ نقل کرتا ہے کہ وہ (ملا شاہ) دریائے لاہور میں اپنا لباس دھو رہے تھے حضرت خضرؑ نمودار ہوئے، انھیں سلام کیا اور فرمایا: تو شغل میں مصروف ہے، لباس مجھے دے (بقیہ ص ۳۴۴ پر)

تائید دارا کے درج ذیل استفسار اور شیخ محب اللہ الہ آبادی کے جواب سے ہوتی ہے۔

دارا نے شیخ سے دریافت کیا:

"انبیای سابق را معرفت توحید بود یا نہ؟"[1] سابق نبیوں کو معرفت توحید حاصل تھی یا نہیں؟

شیخ نے جواب میں تحریر فرمایا:

"پوشیدہ نہ رہے کہ کمالِ معرفت جو صوفیوں کا ذوق ہے، مرتبۂ نبوت کے لیے لازم رہا ہو، یہ معلوم نہیں اور تمام نبی اس مرتبے سے از روی فضل بہرہ ور رہے ہوں، یہ بھی لازم نہیں۔ مگر تمام سابق انبیا اس مرتبے سے پوری طرح بہرہ ور نہ رہے ہوں، ایسا بھی نہیں ہے، لیکن یقین کے ساتھ یہ معلوم ہوا کہ ان کا نصب العین صفات کے حجابوں کے بغیر تجلی ذات تھی۔ انجام کار ان کے تابعین مرتبۂ توحید تک پہنچے ہیں[2]۔"

شیخ نے بڑے محتاط انداز میں اپنی بات کہی ہے مگر دارا کو اس میں نبوت پر معرفت کی برتری کا پہلو آخری جملے میں مل گیا۔ اس کا اصل مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ ان نبیوں کی مثالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے، جو منصب نبوت کے ساتھ ہی دنیاوی حکومت پر بھی فائز کیے گئے تھے، خود کو معرفت کی دولت سے بہرہ یاب اور اس دلیل سے ہندوستان کی حکومت کا سزاوار بلکہ حق دار ثابت کر سکے۔ چنانچہ ریاضت کے بغیر سلوک کے جملہ مراحل قابل صد رشک برق رفتاری[3] سے طے کرنے کی بات، اہل ظاہر کے لباس میں ہونے کے باوجود ان سے بریت کا اظہار

(بقیہ ص ۳۴۴) میں دعوی دیتا ہوں اور تو اپنا شغل جاری رکھ۔ ملا شاہ نے جواب دیا کہ وہ اپنا ذوق اور کام ایک ساتھ کریں گے (سکینۃ الاولیا: ص ۱۴۴) [1] رقعات عالمگیر، مرتبہ نجیب اشرف ندوی: ص ۲۶ [2] ایضاً

اور درویشوں سے دور رہتے ہوئے ان کے زمرے میں شمولیت کا دعویٰ اس کے بیان کے وہ پہلو ہیں جو اس کی نیت کے فتور کی صاف غمازی کرتے ہیں۔ اس خیال کی تائید میں داراشکوہ کے ایک سرپرست حاجی سید محمد رضا جلالی نائینی کا ایک بیان نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ موصوف، جنھوں نے داراشکوہ کے کم و بیش تمام آثار کو ڈاکٹر تاراچند کے اشتراک سے مرتب کر کے شایع کیا ہے، اپنی تحریروں میں جابجا اس کی حمایت فرماتے ہیں۔ کہیں اس پر عائد شدہ "الحاد و زندقہ" کے الزامات کے اندفاع میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کرتے ہیں، کہیں اس کے قتل کو سیاسی اقدام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود اس کے عارفانہ دعووں کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی وقت معرفت اور تصوف میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا کہ اپنے خاندان کے ظاہری مقام و جلال سے دل کو بے نیاز کر سکتا اور گوتم بدھ اور ابراہیم بن ادہم کی تقلید میں امیری اور حکمرانی سے چشم پوشی کر سکتا۔"[1]

یہ سکینۃ الاولیا کے مقدمے سے مقتبس عبارت ہے۔ اس سے مترشح ہونے والا تشکیک کا پہلو ظاہر کرتا ہے کہ فاضل مقدمہ نگار (جلالی نائینی) کو دارا کی بلند پایہ صوفی کی (خود ساختہ) حیثیت کو تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ انھوں نے درست فرمایا کہ وہ اپنے ذی قدر خاندان کے ظاہری مقام و جلال کی سطح سے کسی بھی وقت اونچا نہیں اٹھ سکا، مگر بہت سے عارفانہ دعووں سے بھی کبھی باز نہیں آیا۔ اس میدان میں وہ اپنے پیر و مرشد (ملا شاہ) سے بھی بازی لے گیا۔ اس کا درج ذیل دعویٰ ملاحظہ فرمائیں:

---

[1] سکینۃ الاولیا (مقدمہ مرتب): ص چہل و چہار

سلطان الاذکار کی تدریس دارا نے اپنے پیر کے پیر شاہ میانمیر کے ایک خادم نور محمد کے حوالے سے شاہ صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ جو "گشایش" کسی اور جگہ چالیس سال میں ہوتی ہے، غار حرا میں ایک سال میں ہو جاتی ہے[1]۔ رسالہ حق نما (سال تالیف ۱۰۵۶ھ) میں وہ لکھتا ہے کہ شیخ میانجیو (شاہ میانمیر) نے غار حرا میں پورے بارہ سال "سلطان الاذکار" کے شغل میں بسر کیے[2]۔ اس کے فیض سے انہیں "گشایش عظیم" کی دولت و سعادت نصیب ہوئی۔ انہیں یہ شغل بہت محبوب تھا اور وہ اپنے ارادت مندوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے مگر ایک سال سے پہلے کامیابی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اس کے برعکس دارا جن طالبوں کو "مشغول" کرتا تھا وہ دو چار ہی دنوں میں کامیاب و بامراد ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب دارا یہ بیان کرتا ہے :

"ایشان بکنایہ و اشارہ میفر	وہ اشارہ و کنایہ میں فرماتے تھے
مودند و من تبصریح می گویم و	اور میں صراحت کے ساتھ بیان
بی پردہ می نمایم"[3]	کرتا ہوں اور بے پردہ اظہار کرتا ہوں۔

لیلۃ القدر کی دریافت ممکن ہے قارئین یہ تصور فرمائیں کہ دارا نے "سلطان الاذکار"

---

[1] سکینۃ الاولیا : ص ۱۱۴ [2] مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ (مرتبہ جلالی نائینی) : ص ۴-۱۳۔ (شاہ میانمیر نے زندگی میں ایک بار بھی مکے کا سفر نہیں کیا۔ ان کے خادم نور محمد کی روایت کے مطابق ان کی راتیں غار حرا میں بسر ہوتی تھیں اور دن لاہور میں گزرتے تھے!! تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں سکینۃ الاولیا : ص ۴-۱۱۳ اور خزینۃ الاصفیا جلد اول، از مفتی غلام سرور : ص ۱۵۰۔ یہ نکتہ بطور خاص ملحوظ رہے کہ شاہ صاحب نے نور محمد کو یہ بات بتاتے ہوئے "رازداری" برتنے کی سخت تاکید کی تھی[3]۔ رسالہ حق نما، مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ : ص ۱۴۔

کا درس شاہ میاں میر سے ان کی حیات میں لیا ہوگا اور ایک سال میں بامراد ہوا ہوگا۔ ان کی اطلاع کے لیے مکرر عرض ہے کہ شاہ میاں میر سے دارا کی صرف دو ملاقاتیں ہوئیں۔ ۱۰۴۵ھ میں شیخ اپنے سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اس کے باوجود دارا کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہ شغل شاہ میاں میر ہی سے ان کی وفات کے تقریباً چھ سال بعد ۱۰۵۱ھ میں حاصل کیا اور وہ بھی صرف چند ثانیوں میں۔ یہ امر محال کیونکر ممکن ہوسکا، اسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"دوشنبہ ۲۸ رمضان المبارک ۱۰۵۱ھ کی رات میں خدا کی عنایت اور حضرت میاںجیو کی توجہ سے اس وقت جب رات کا ایک پہر باقی تھا، مجھے شب قدر مل گئی۔ میں شغل میں مصروف روبقبلہ بیٹھا ہوا تھا کہ مجھ میں ایک اضطراب پیدا ہوا۔ میں نے اٹھ کر جنبش کی لیکن دل بیدار اور بیقرار تھا۔ صبح کے قریب ایک بلند روضہ جو رفعت اور حسن تعمیر کے درجۂ کمال کو پہنچا ہوا تھا اور جس کے اطراف میں ایک باغ تھا، دکھائی دیا۔ میں جان گیا کہ حضرت میاںجیو کا روضۂ مبارک ہے۔ اندر جاکر میں نے دیکھا کہ بہت آراستہ روضہ ہے اور بیچ میں ایک قبر ہے لیکن حضرت میاںجیو قبر سے نکل کر گنبد کے باہر پاکیزہ لباس پہنے ہوئے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ جب ان کی نظر مبارک مجھ پر پڑی تو انتہائی بشاشت سے مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھا لیا اور عنایت فرمانے لگے اور میں ہر لحظہ ان کے مبارک ہاتھوں اور پیروں کو تھامنے، چومنے اور آنکھوں سے لگانے لگا۔ عنایت بسیار کے بعد انھوں نے بہت سی شیرینی دے کر میرا ہاتھ تھاما اور فرمایا: آ، میں تجھے اپنے ایک شغل کا درس دوں۔ انھوں نے میرا چہرہ برہنہ کر دیا

اور خود بر بےخود ہو گئے اور میری دونوں شہادت کی انگلیاں میرے دونوں کانوں میں اتنے دباؤ کے ساتھ داخل کیں کہ میں سراپا سلطان الاذکار ہو گیا اور آواز نے مجھ پر ہجوم کیا۔ انھوں نے مجھے سینے سے سینہ ملا کر آغوش مبارک میں لیا اور اس کے بعد (زمین پر) ڈال دیا۔ پھر میں بیخود ہو گیا مجھے ایک روحانی دوا ملی اور ایک ایسی بات منکشف ہوئی جو نہ تحریر و تقریر میں سماتی ہے نہ عبارات و اشارات میں۔ مطلب حاصل ہو گیا۔ لذت دوچند ہو گئی۔ کامیابی پر کامیابی نصیب ہوئی اور نزدیکی اور دوری کا فرق مٹ گیا[1]

منقولہ بالا دعوے کا تجزیہ اس واقعہ نما داستان کے تجزیے کے سلسلے میں درج ذیل نکتے بطور خاص غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں:

(۱) داراشکوہ نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ وہ رات جو اس کے لیے گوناگوں سعادتوں کی سوغات لے کر آئی تھی، کس جگہ بسر ہوئی تھی۔ آگرے یا لاہور کے کسی محل میں یا بحالت سفر پر تکلف شاہانہ سراوقات میں۔ تاریخ کے صفحات سے اس امر کا پورا ثبوت ملتا ہے کہ شاہجہاں سفر و حضر میں بیشتر اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ شاہجہاں ۲۷ رمضان ۱۰۵۱ھ کو کہاں تھا، ہم تاریخ کے اوراق پر نظر ڈالتے ہیں۔ پتا چلتا ہے کہ وہ وسط شعبان ۱۰۵۱ھ میں لاہور سے کانوواہن کی شکارگاہ کا رخ کرتا ہے۔ چونکہ یہ تفریحی نوعیت کا سفر تھا اس لیے منزل بمنزل قیام کرتے ہوئے اواخر شعبان میں کانوواہن پہنچا ہو گا۔ یکم رمضان کو کانوواہن میں شاہجہاں کی موجودگی کا ثبوت عنایت خاں کے "شاہجہاں نامہ"

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۵۰-۵۴۔

سے دستیاب ہوتا ہے[1]۔ اسی مقام پر سلخ رمضان کو مراد بخش بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا[2]۔ گمان غالب ہے کہ اس تفریحی سفر میں داراشکوہ شاہجہاں کی معیت میں رہا ہوگا اور ۲۷ رمضان کی شب کانو واہن میں بسر کی ہوگی۔

(۲) چونکہ اس نے لیلۃ القدر کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے، اس لیے اسکی بیان کردہ عجیب و غریب روداد کو درست مان لینے کی صورت میں اس پر یا اس کے کسی حصے پر خواب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ لیلۃ القدر سے استسعاد کی اولین شرط شب بیداری اور عبادت ہے۔

(۳) ہزار مہینوں پر فضیلت رکھنے والی یہ رات ماہ رمضان کے آخری عشرے کی طاق عدد والی تاریخوں میں سے کسی ایک تاریخ میں واقع ہوتی ہے۔ وثوق کے ساتھ اس رات کا تعین نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ اس کی کوئی ظاہری علامت نہیں ہوتی۔ خود اس سے مستسعد ہونے والا بھی اپنی سعادت اندوزی سے بے خبر رہتا ہے۔ لہذا داراشکوہ کا دعویٰ کہ "لیلۃ القدر را ...... دریافتم" اور وہ بھی صرف رات ہی نہیں، پہر کے بھی تعین کے ساتھ، کہاں تک قابل قبول ہے۔

(۴) ان واقعات کا تجزیہ بھی جن کی بنیاد پر داراشکوہ نے لیلۃ القدر کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے اس کی ژولیدگی خیال پر دلالت کرتا ہے۔ رات کے آخری پہر میں اسے ایک روضہ دکھائی دیا۔ اس نے فوراً جان لیا کہ وہ شاہ میانمیر کا روضہ تھا۔ بیان کے اس نقطے پر اس کا لہجہ صاف غمازی کر رہا ہے کہ شاہ میانمیر کی وفات کے بعد سے اس وقت تک ۔ کم و بیش چھے برس کے عرصے میں ۔ اسے ان کے روضے کی

---

[1] بادشاہ نامۂ عنایت خان انگریزی ترجمہ از بیگلی و دیسائی، آکسفورڈ: ص ۲۸۲ [2] ایضاً: ص ۲۸۳۔

زیارت نصیب نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ وہ روضے کی بلندی، اس کے حسن تعمیر اور اطراف وجوانب میں باغ کی موجودگی کا ذکر نہ کرتے ہوئے صرف یہ لکھتا کہ "روضۂ مبارکہ حضرت میاں جیو بنظر درآمد"۔ اس صورت میں تشکیک کا پہلو پیدا کرنے والے لفظ "دانستم" کے استعمال کی بھی ضرورت پیش نہ آتی۔

(۵) شاہ میاں میر کا اسے اپنے پاس بلانا، اس کا موصوف کے ہاتھ پیر کو چومنا اور آنکھوں سے لگانا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت وہ اپنے عنصری ہیکل میں تھے اور داراشکوہ کے الفاظ میں "قبر سے باہر نکل کر بیٹھے ہوئے تھے"۔ نیز اپنے روضے سمیت اس جگہ موجود تھے جہاں اس وقت داراشکوہ قیام پذیر تھا۔ (غالباً کانوواہن کی شکارگاہ میں!)

(۶) سلطان الاذکار کے فیض سے "گشایش" کی تمنا میں شاہ میاں میر کو بارہ سال تک، بروایت نور محمد صرف راتیں غار حرا میں گذارنی پڑیں (دن میں وہ اپنے اصحاب کے ساتھ لاہور میں موجود رہتے تھے!!) اس عظیم شغل کا مکمل درس انھوں نے آن واحد میں داراشکوہ کو اس طرح دیا کہ اس کی شہادت کی انگلیاں اسکے کانوں میں فشار کے ساتھ داخل کیں۔ صرف اس عمل سے وہ "تمام سلطان الاذکار" بن گیا!!!

شہزادے نے یہ نہیں بیان کیا کہ وہ منظر کتنی دیر بعد اور کس طرح نگاہوں سے روپوش ہوا۔ شاید "تمام سلطان الاذکار" بننے کے بعد اس پہ بے خودی طاری رہی ہوگی اور بعد کے واقعات پر توجہ دینے کا ہوش نہ رہا ہوگا۔

عالم ملکوت کا مشاہدہ | عالم ناسوت میں ایسے ملکوتی مناظر دیکھنے کا دعویٰ کرنے والا، بزعم خود، عالم ملکوت کے مشاہدے پر بھی قادر تھا۔ ایک دلچسپ دعوے میں

اس کی بصارت اور بصیرت کا عالم دیدنی اور سیاحان دشت معرفت و ولایت کے لیے باعث صد رشک ہے۔ اس دعوے کے پس منظر کے طور پہلے ایک حدیث قدسی کا مفہوم بیان کرتا ہے کہ: "ایزد سبحانہ و تعالیٰ نے جس شخص کو دنیا میں بصارت سے محروم رکھا ہے، آخرت میں اس کی آنکھوں کو اپنے نور سے روشن کرکے سب سے پہلے اپنے جمال کے دیدار سے مشرف کرے گا۔" آگے لکھتا ہے کہ اگر کسی شخص کو خدا کی عنایت سے یہ توفیق حاصل ہے کہ وہ اپنے نور ولایت و ہدایت کی ایک توجہ سے ظاہر اور باطن کے بے بصیرتوں کی آنکھیں روشن کر دے تو اس کے نزدیک اس طور پر حصول مطلب کی وقعت ہی کیا؟ اس کی بصیرت کو بصارت کی چنداں حاجت نہیں کیوں کہ جب دل کی آنکھ "بینا" ہو جاتی ہے تو اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ جاتی اور اگر بصیرت کے ساتھ بصارت بھی حاصل ہو تو وہ آنکھ پر عینک کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد لکھتا ہے:

"ایک دن میرے شیخ (ملا شاہ) نے مجھ سے فرمایا کہ آنکھ بند کر اور عالم غیب میں فلاں چیز کا مشاہدہ کر۔ میں نے کہا کہ میں آنکھ بند کیے بغیر اسے دیکھ رہا ہوں۔ انھوں نے میری تحسین و آفرین کی اور فرمایا کہ تو نے ٹھیک کہا۔ دل کی آنکھ صاف اور روشن ہو تو آنکھ بند کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور ظاہری آنکھ بند کیے بغیر عالم ملکوت کے تمام عجائبات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے[1]"

شاید ملا شاہ کو اپنے اس صاحب کشف و کرامات مرید کے حال و مقام کی کما حقہٗ خبر نہیں تھی، ورنہ آنکھ بند کرنے کا حکم تو درکنار، اس سے عالم ملکوت کے عجائبات

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۵۸۔

...آنکھوں سے بھی دیکھنے کی فرمائش نہ کرتے۔ وہ خود بھی ملا شاہ کے حکم "چشم را بپوش"
...میل میں شاید زندگی میں پہلی بار اس حقیقت سے آشنا ہوا کہ آنکھ بند کرنے میں
...صل قلبی سکون کے حصول اور رفع انتشار کی مصلحت پوشیدہ ہے۔[1]

...حیرت انگیز روحانی تجربہ | دارا شکوہ کی تصانیف سے اس امر کا وافر ثبوت فراہم
...تا ہے کہ وہ اپنے مرشد کے ارشادات کی تعمیل کے علاوہ اپنے طور پر بھی مختلف عجیب
...غریب مسائل پر غور کرتا اور نتائج کے استنباط کی کوشش کرتا تھا۔ یہ دیگر بات ہے
...اس کے مبینہ نتائج کی نوعیت کیا ہوتی تھی مگر ان کی صحت پر اس کا اصرار رہا کرتا
...کبھی کبھی اپنے اخذ کردہ نتائج کی تصدیق اور رفع شکوک کی غرض سے، جیسا کہ اس کی
...ریروں سے علم ہوتا ہے، روحانی تجربات بھی کرتا تھا۔ کبھی ملا شاہ کے مریدوں کے
...دل پر تصرف کرکے اور کبھی اپنے تئیں۔ اس نے اپنا ایک روحانی تجربہ ان الفاظ
...میں بیان کیا ہے :

"اکثر اس فقیر کے دل میں یہ بات گذرتی تھی کہ مرنے اور روح کے جسم سے جدا
ہونے کے بعد روح کو یہی حال، شعور، وجد، ذوق اور شغل حاصل رہے گا
یا نہیں؟ ایک بار میں نے دیکھا کہ میری روح جسم سے جدا ہوکر پورے وجد،
شغل اور ذوق کے ساتھ ہوا میں ایک قبر کے گرد بگولے کی طرح بلکہ اس سے
بھی زیادہ تندی اور تیزی سے چکر لگا رہی ہے اور اس حال میں مجھے جو شعور
حاصل تھا اسی طرح کا تھا بلکہ بہتر اور زیادہ پُر لذت تھا اور بے انتہا لطافت
حاصل کر چکا تھا اور جس شغل میں تھا اس سے زیادہ مشغول، خیالات سے خالی

---

[1] سکینۃ الاولیا : ص ۸۰۔

اور بے تعلق ہوگیا تھا۔ اس کے بعد روح آئی اور جسم میں داخل ہوگئی۔ داخل ہونے کے بعد اس دلی اطمینان اور ذوق کے آثار مجھ پر ظاہر تھے لیکن اس درجے کے نہیں معلوم ہوا کہ اس حال کو اس حال سے کوئی نسبت نہیں اور اولیا کے لیے موت کے بعد ترقی ہے اور کیوں نہ ہو کہ حق تعالیٰ ان کے حق میں فرماتا ہے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَاۗءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ[1] کہو ان لوگوں کو مردہ جو فنا ہوگئے ہیں وحدت حق میں، بلکہ وہ ابد تک کے لیے زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے اے لوگو! جو بقائے حق اور وجود مطلق میں باقی نہیں ہوئے ہو۔[2]

ع ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

داراشکوہ کے اس روحانی تجربے کا ماحصل، اس کا اخذ کردہ نتیجہ۔ "اولیا را بعد از ممات ترقی است" سے عبارت ہے جو اس کے ادعائے ولایت پر دلالت کرتا ہے۔ منقولہ بالا بیان میں اس نے آیت کریمہ کی جو تاویل کی ہے وہ بھی غور طلب ہے۔ یہ آیت ان شہیدوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے کفر و باطل کے خلاف جنگ کی اور اپنے خون سے دوحۂ اسلام کی آبیاری کی۔ اس کا اطلاق "کشتگان خنجر تسلیم" پر کیا جانا کہاں تک مناسب ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو مجال انکار نہیں ہوسکتی کہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو جس اسلام کی دعوت دی تھی اس میں خانقاہی تصوف کا تصور نہیں تھا۔ وہ دور کفر و ایمان کی باہمی آویزش اور کفار مکہ کے ساتھ مسلمانوں کی جنگوں کا دور تھا۔ ان محاربات میں

---

[1] نہ کہو ان لوگوں کو جو قتل کیے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ادراک نہیں کر سکتے۔ (قرآن مجید ۲/۱۵۴) [2] سکینۃ الاولیا: ص ۹۱۔

ن شہید ہو رہے تھے۔ لہذا زیر تبصرہ آیت کی تفسیر انہی حالات کی روشنی میں
نی چاہیے۔

نی یعنی معرفت | داراشکوہ کی تحریروں میں قرآنی آیات کی عارفانہ تاویلات کی متعدد
یں پائی جاتی ہیں۔ ایک مورد پر عبادت کو معرفت کا مترادف قرار دیتے ہوئے
ہے: "خلقت انسان برای عرفان است"۔ (انسان کی تخلیق کا مقصد معرفت ہے)
بیت: وَمَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ[1] نقل کرکے اس پر
لِیَعْرِفُوْنَ" کا اضافہ کرتا ہے اور اس کا ترجمہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"نیست ظہور انسان مگر برای	انسان کا وجود عرفان اور حقیقتِ
عرفان و حقیقت ایمان"[2]	ایمان کے سوا کسی اور مقصد کیلئے نہیں۔

عبادت کو معرفت سے تعبیر کرنے میں دارا اپنے مرشد ملا شاہ کا مقلد ہے۔ انھوں نے
دن فرمایا تھا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے ایک دن میں دس ہزار افراد کو
من" بنایا تھا اور انھیں "ایمان حقیقی" یعنی عرفان کے درجے تک پہنچایا تھا[3]۔ ملا شاہ کو
رس ان کے پیر شاہ میانمیر سے حاصل ہوا تھا جن کا (یا جن سے منسوب؟) یہ
دارا نے نقل کیا ہے:

"در نزد اہل شریعت شخصی بخواندن	اہل شریعت کے نزدیک کوئی شخص
کلمہ بعد از کفر مومن می گردد، اما	کفر کے بعد کلمہ پڑھنے سے مومن ہو جاتا
نزدیک اہل حقیقت ہیچ چیز	ہے لیکن اہل حقیقت کے نزدیک

---

[1] اور نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (قرآن مجید ۵۶/۵۱) [2] سکینۃ الاولیا: ص ۱۷۰ [3] ایضاً ص ۱۷۱۔

اور بے تعلق ہو گیا تھا۔ اس کے بعد روح آئی اور جسم میں داخل ہو گئی۔ داخل ہونے کے بعد اس دلی اطمینان اور ذوق کے آثار مجھ پر ظاہر تھے لیکن اس درجے کے نہیں۔ معلوم ہوا کہ اس حال کو اس حال سے کوئی نسبت نہیں اور اولیا کے لیے موت کے بعد ترقی ہے اور کیوں نہ ہو کہ حق تعالیٰ ان کے حق میں فرماتا ہے: وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ[1] نہ کہو ان لوگوں کو مردہ جو فنا ہو گئے ہیں وحدت حق میں۔ بلکہ وہ ابد تک کے لیے زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے اے لوگو! جو بقائے حق اور وجود مطلق میں باقی نہیں ہوئے ہو[2]

ع ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟

داراشکوہ کے اس روحانی تجربے کا ماحصل اس کا اخذ کردہ نتیجہ "اولیا را بعد از ممات ترقی است" سے عبارت ہے جو اس کے ادعائے ولایت پر دلالت کرتا ہے۔ منقولہ بالا بیان میں اس نے آیت کریمہ کی جو تاویل کی ہے وہ بھی غور طلب ہے۔ یہ آیت ان شہیدوں کی شان میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے کفر و باطل کے خلاف جنگ کی اور اپنے خون سے دوحۂ اسلام کی آبیاری کی۔ اس کا اطلاق "کشتگان خنجر تسلیم" پر کیا جانا کہاں تک مناسب ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتی کہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا کو جس اسلام کی دعوت دی تھی اس میں خانقاہی تصوف کا تصور نہیں تھا۔ وہ دور کفر و ایمان کی باہمی آویزش اور کفار مکہ کے ساتھ مسلمانوں کی جنگوں کا دور تھا۔ ان محاربات میں

---

[1] نہ کہو ان لوگوں کو جو قتل کیے جاتے ہیں اللہ کی راہ میں کہ مردہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم ادراک نہیں کر سکتے۔ (قرآن مجید ۲/۱۵۴) [2] سکینۃ الاولیا: ص ۹۱۔

مسلمان شہید ہو رہے تھے۔ لہذا زیرِ تبصرہ آیت کی تفسیر انہی حالات کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔

عبادت یعنی معرفت | داراشکوہ کی تحریروں میں قرآنی آیات کی عارفانہ تاویلات کی متعدد مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ایک مورد پر عبادت کو معرفت کا مترادف قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے: "خلقت انسان برای عرفان است"۔ (انسان کی تخلیق کا مقصد معرفت ہے) پھر آیت: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ[1] نقل کر کے اس پر "ای لیعرفون" کا اضافہ کرتا ہے اور اس کا ترجمہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"نیست ظہور انسان مگر برای	انسان کا وجود عرفان اور حقیقت
عرفان و حقیقت ایمان"[2]	ایمان کے سوا کسی اور مقصد کیلئے نہیں۔

عبادت کو معرفت سے تعبیر کرنے میں دارا اپنے مرشد ملا شاہ کا مقلد ہے۔ انھوں نے ایک دن فرمایا تھا کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے ایک دن میں دس ہزار افراد کو "مومن" بنایا تھا اور انھیں "ایمان حقیقی" یعنی عرفان کے درجے تک پہنچایا تھا[3]۔ ملا شاہ کو یہ درس ان کے پیر شاہ میانمیر سے حاصل ہوا تھا جن کا (یا جن سے منسوب ؟) یہ قول دارا نے نقل کیا ہے:

"در نزد اہل شریعت شخصی بخواندن	اہل شریعت کے نزدیک کوئی شخص
کلمہ بعد از کفر مومن می گردد، اما	کفر کے بعد کلمہ پڑھنے سے مومن ہو جاتا
نزدیک اہل حقیقت ہیچ چیز	ہے لیکن اہل حقیقت کے نزدیک

---

[1] اور نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو سوائے اس کے کہ وہ میری عبادت کریں۔ (قرآن مجید ۵۱/۵۶) [2] سکینۃ الاولیاء: ص ۱۷۰ [3] ایضاً ص ۱۷۱۔

علاج غفلت نمی کند[1] — کوئی چیز غفلت کا علاج نہیں کرتی۔

"غفلت" ضد ہے "معرفت" کی۔ اس قرینے سے "ایمان حقیقی" کی بھی ضد ہونی چاہیے (جیسے ایمان مجازی؟ یا کفر حقیقی؟)[2] دارا شکوہ یہ بھی لکھتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایمان حقیقی یعنی معرفت اور توحید ہی کی تبلیغ کے لیے جہاد فرمایا تھا۔[3] اس کا یہ بھی اصرار ہے کہ ہر شخص کا کسی نہ کسی سلسلۂ سلوک سے وابستہ ہونا لازم ہے جس طرح علم ظاہر کی تحصیل معلم کے بغیر نہیں ہو سکتی اسی طرح علم باطن کے لیے شیخ کی ذات ناگزیر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"تحقیق باید دانست کہ ہیچ کس	تحقیق کے ساتھ جاننا چاہیے کہ انبیا
جز انبیا علیہم السلام بی واسطۂ	علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص بے
شیخی خواہ بظاہر و خواہ اویسی،	واسطۂ شیخ، چاہے وہ ظاہری ہو یا
بحق جل و علا واصل نمی گردد	اویسی نوعیت کا، حق جل و علا سے
و از ضلالت خود بینی خلاص نمی	واصل نہیں ہوتا اور خود بینی کی ضلالت
شود"[4]	سے نجات نہیں پاتا۔

اس بیان کی رو سے وہ تمام کلمہ گو جو کسی سلسلۂ طریقت سے وابستہ نہیں "ایمان حقیقی" سے محروم قرار پاتے ہیں اور شاہ میاں میر کے بقول کلمۂ طیبہ پڑھ کر خدا کی وحدانیت اور رسول کے نبی مرسل ہونے پر ایمان لانے والے بھی اگر کسی شیخ کو واسطہ نہ بنائیں تو غفلت کی وادی کے رہ نورد ٹھہرتے ہیں۔

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۳۹ [2] دارا نے اپنے ایک خط بنام شاہ دلربا میں "اسلام مجازی" ترک اور "کفر حقیقی" اختیار کرنے کی بات تحریر کی ہے (رقعات عالمگیر مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی: ص ۲۲۲) [3] سکینۃ الاولیا: ص ۱۰ [4] ایضاً

ایمان کی قسمیں | "ایمان حقیقی کی حقیقت اور دیگر ایمانوں پر (جن کو شاہ میاں میر نے غفلت اور داراشکوہ نے ضلالت اور خود بینی کا نام دیا ہے) اس کی وجہ امتیاز جان لینے کے بعد دارا کی بیان کردہ ایمان کی تین قسموں۔ ایمان عوام، ایمان خواص اور ایمان اخص الخواص کی تعریفیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) خدا، رسولؐ، فرشتوں، سماوی کتابوں، رسولوں، حیات بعد ممات، بہشت، دوزخ اور خیر و شر کا اللہ کی جانب سے ہونے کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا ایمان عوام ہے۔

(۲) ایمان خواص یہ ہے کہ خدا کی صفات میں سے کوئی صفت دل پر تجلی کرے اور تمام اعضا اس کے تابع ہو جائیں، مثلاً حضرت موسیٰ ؑ کے دل پر خدا کی ایک صفت تجلی ہوئی تو انھوں نے کہا: تُبْتُ اِلَیْکَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ[1]۔ یعنی من اول کسانی ام کہ ایمان آوردہ اند۔" (میں ان لوگوں میں پہلا شخص ہوں جو ایمان لائے ہیں۔)

(۳) ایمان اخص الخواص کی شرط یہ ہے کہ انانیت زایل ہو جائے، تجلی ذات ہستی موہوم کو کمزور کر دے اور وہ زمان و مکان اور قرب و بعد کے امتیازات سے منزہ ہو جائے۔

بادی النظر میں موخر تعریف ایمان اخص الخواص کی وضاحت معلوم ہوتی ہے مگر دارا کا انانیت آمیز لہجہ صاف غمازی کر رہا ہے کہ وہ اپنا شمار اخص الخواص مومنوں میں کرتا تھا۔ اب تک اس کے جتنے دعوے بیان کیے جا چکے ہیں، اس

---

[1] توبہ کرتا ہوں میں تیرے پاس اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں (قرآن مجید ۷/۱۴۳)۔

علاج غفلت نمی کند۔[۱]	کوئی چیز غفلت کا علاج نہیں کرتی۔

"غفلت" ضد ہے "معرفت" کی۔ اس قرینے سے "ایمان حقیقی" کی بھی ضد ہونی چاہیے (جیسے ایمان مجازی؛ یا کفر حقیقی؟)[۲] دارا شکوہ یہ بھی لکھتا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ایمان حقیقی یعنی معرفت اور توحید ہی کی تبلیغ کے لیے جہاد فرمایا تھا۔[۳] اس کا یہ بھی اصرار ہے کہ ہر شخص کا کسی نہ کسی سلسلۂ سلوک سے وابستہ ہونا لازم ہے۔ جس طرح علم ظاہر کی تحصیل معلم کے بغیر نہیں ہو سکتی اسی طرح علم باطن کے لیے شیخ کی ذات ناگزیر ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"بتحقیق باید دانست کہ ہیچ کس	تحقیق کے ساتھ جاننا چاہیے کہ انبیا
جز انبیا علیہم السلام بے واسطۂ	علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص بے
شیخی خواہ بظاہر و خواہ اویسی،	واسطۂ شیخ، چاہے وہ ظاہری ہو یا
بحق جل و علا واصل نمی گردد	اویسی نوعیت کا، حق جل و علا سے
و از ضلالت خود بینی خلاص نمی	واصل نہیں ہوتا اور خود بینی کی ضلالت
شود۔"[۴]	سے نجات نہیں پاتا۔

اس بیان کی رو سے وہ تمام کلمہ گو جو کسی سلسلۂ طریقت سے وابستہ نہیں۔ "ایمان حقیقی" سے محروم قرار پاتے ہیں اور شاہ میانمیر کے بقول کلمۂ طیبہ پڑھ کر خدا کی وحدانیت اور رسولؐ کے نبی مرسل ہونے پر ایمان لانے والے بھی اگر کسی شیخ کو واسطہ نہ بنائیں تو غفلت کی وادی کے رہ نورد ٹھہرتے ہیں۔

---

۱ سکینۃ الاولیا: ص ۳۰ و ۲ دارا نے اپنے ایک خط بنام شاہ دلربا میں "اسلام مجازی" ترک اور "کفر حقیقی" اختیار کرنے کی بات تحریر کی ہے (رقعات عالمگیر مرتبہ سید نجیب اشرف ندوی: ص ۲۲۲) ۳ سکینۃ الاولیا: ص ۱۰ ۴ ایضاً ص ۰۰۔

ایمان کی قسمیں | "ایمان حقیقی کی حقیقت اور دیگر ایمانوں پر (جن کو شاہ میاں میر نے غفلت اور دارا شکوہ نے ضلالت اور خود بینی کا نام دیا ہے) اس کی وجہ امتیاز جان لینے کے بعد دارا کی بیان کردہ ایمان کی تین قسموں۔ ایمان عوام، ایمان خواص اور ایمان اخص الخواص کی تعریفیں ملاحظہ فرمائیں:

(۱) خدا، رسولؐ، فرشتوں، سماوی کتابوں، رسولوں، حیات بعد ممات، بہشت، دوزخ اور خیر و شر کا اللہ کی جانب سے ہونے کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا ایمان عوام ہے۔

(۲) ایمان خواص یہ ہے کہ خدا کی صفات میں سے کوئی صفت دل پر تجلی کرے اور تمام اعضا اس کے تابع ہو جائیں، مثلاً حضرت موسیٰؑ کے دل پر خدا کی ایک صفت تجلی ہوئی تو انھوں نے کہا: تُبْتُ إِلَيْكَ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُؤْمِنِينَ[1]۔ یعنی من اول کسانی ام کہ ایمان آوردہ اند۔ (میں ان لوگوں میں پہلا شخص ہوں جو ایمان لائے ہیں۔)

(۳) ایمان اخص الخواص کی شرط یہ ہے کہ انانیت زائل ہو جائے، تجلی ذات ہستی موہوم کو کمزور کر دے اور وہ زمان و مکان اور قرب و بعد کے امتیازات سے منزہ ہو جائے۔

بادی النظر میں موخر تعریف ایمان اخص الخواص کی وضاحت معلوم ہوتی ہے مگر دارا کا انانیت آمیز لہجہ صاف غمازی کر رہا ہے کہ وہ اپنا شمار اخص الخواص مومنوں میں کرتا تھا۔ اب تک اس کے جتنے دعوے بیان کیے جا چکے ہیں، اس

---

[1] توبہ کرتا ہوں میں تیرے پاس اور میں ایمان لانے والوں میں سب سے پہلا ہوں (قرآن مجید ۷/۱۴۳)۔

گمان [illegible] چھپاتے ہیں۔ ملا شاہ کی مریدی اب اس کی مجبوری بن گئی تھی کیونکہ خود اسی کے بقول انبیا علیہم السلام کے علاوہ کوئی شخص بے واسطۂ شیخ واصل الی الحق نہیں ہو سکتا، ورنہ اس کی رسائی تو بے واسطہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک تھی۔

رسول اکرمؐ کی روح طیبہ سے ملاقات اور استفسار

بعض عارفانہ مسایل کی وضاحت کے سلسلے میں بعض اوقات ملا شاہ کے ارشادات سے اس کی تشفی نہیں ہو پاتی تھی۔ ایسی صورت حال کے پیش آنے پر اس نے یا تو حضرت غوث الثقلینؒ اور شاہ میاں میر سے کبھی خواب اور کبھی بیداری کے عالم میں رجوع کرنے کا دعویٰ کیا یا حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کے لیے رابطہ قائم کرنے کا ادعا۔ اس نوعیت کا ایک حیرت انگیز "واقعہ" اسی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

"ایک بار مجھ فقیر کو رویت کے مسئلے میں ایک مشکل درپیش آئی تھی اور دل میں شبہ پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے آنحضرت (ملا شاہ) سے عرض کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ ان دو باتوں (؟[1]) میں سے ایک حل ہو گئی۔ دوسری جو جنت میں رویت کے بارے میں تھی اس سے دل کی تسلی نہیں ہوئی۔ مجھے یقین کے ساتھ معلوم تھا کہ میں نے جواب کو نہیں سمجھا ہے اور از روئے ادب اس بارے میں پھر سے سوال نہیں کر سکا...... جب میں ان کی خدمت سے اٹھا اور اس زایل نہ ہونے والے شبہے کو خاطر نشین کر لیا تھا، میں نے راستے میں سید کائنات سے مشرف ہو جوتا

---

[1] دو باتوں میں سے ایک کی صراحت نہیں کی ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح پر توجہ کی اور سرور کائنات کی روح پاک خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک روحوں کے ساتھ مجھ پر ظاہر ہوئی۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شبہے کے بارے میں سوال کیا۔ سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ تو اللہ تعالیٰ کو قادر جانتا ہے، وہ جس طرح چاہے گا موجوں کو اپنا دیدار کرا دے گا۔ اس جواب سے اسی وقت میری مشکلیں حل ہوگئیں اور شبہ رفع ہوگیا۔ جب میں دوسری بار ان کی (ملا شاہ کی) خدمت میں پہنچا اور یہ روداد بیان کی تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا: یہی بات تھی اور جس نے تمہیں یہ جواب دیا اسی نے مجھ سے بھی کہا۔ یہ جواب لکھنے کے لائق ہے، تم اسے ضرور لکھنا۔[1]

دارا شکوہ کے بیان کردہ اس "واقعے" کے بالاستیعاب جائزے سے بعض بڑے دلچسپ نتائج برآمد ہوتے ہیں جن سے نہ صرف دارا شکوہ کی نام نہاد عارفانہ شخصیت پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے بلکہ اس کے مرشد ملا شاہ کی روحانی اور عرفانی حیثیت بھی مشکوک ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اوسط درجے کی فہم و فراست رکھنے والا قاری بھی اگر اپنی قوت استدلال کو بروئے کار لائے تو اسے درج ذیل نتائج اخذ کرنے میں چنداں دشواری نہ ہوگی۔

(۱) دارا شکوہ کے بعض بیانات سے علم ہوتا ہے کہ ملا شاہ اس کے باطنی کوائف سے باخبر رہتے اور اس کے مافی الضمیر کو پڑھ لیا کرتے تھے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتا ہے:

"ایک روز ...... میرے دل میں یہ بات گزری کہ اس بار جب ان کی خدمت میں پہنچوں گا تو کہوں گا: فقیر آپ کی ہمسائیگی میں رہتا ہے اور امیدوار ہے...

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۰۵-۱۰۶۔

کہ عقبیٰ میں بھی آپ حق ہمسایگی بجالائیں گے۔ جب ان سے میری ملاقات ہوئی تو

بغیر اس کے کہ میں اظہار کرتا ۔۔۔ انھوں نے کہا: اے یار عزیز! میں عقبیٰ میں بھی تیری مدد

اور اعانت کروں گا۔"[1]

ایک اور مورد پر لکھتا ہے:

"فقیر کے دل میں یہ بات آئی کہ اولیائے سلف میں سے اکثر کے احوال و مقامات معلوم

اور کتابوں میں درج ہیں۔ حضرت آخوند کا حال و مقام میں نہیں سمجھا کہ کیا اور

کہاں تک ہے ۔۔۔ حضرت نے فوراً میرے دل کی بات سے باخبر ہو کر فرمایا: فقیروں

میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کا رتبہ اور مقام اس درجے پر پہنچا ہوا ہوتا ہے کہ

خدائے پاک و برتر نے ان کے بارے میں فرمایا: وہ مجھ سے سنتا ہے اور مجھ سے

دیکھتا ہے اور مجھ سے پکڑتا ہے اور مجھ سے چلتا ہے۔"[2]

ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملا شاہ ولایت کے اس مرتبہ و مقام پر فائز تھے کہ ان پر بی یسمع و بی یبصر و بی یبطش و بی یمشی کا اطلاق ہوتا تھا۔ ایسے واصل الی الحق عارف کے لیے کسی کے دل کی بات جان لینا بعید از امکان اور تعجب خیز امر نہیں۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ رویت در بہشت" (جنت میں دیدارِ الٰہی) کے بارے میں دارا کے سوال کا جواب دینے کے بعد وہ اپنے تئیں سمجھ بیٹھے کہ اس کو تشفی ہو گئی اور اس کے دل میں شکوک و شبہات کے پیدا ہونے کا نہیں بلکہ کا سا شبہ تک نہیں ہوا۔

(۲) رویت کے مسئلے پر ملا شاہ کا علم ناقص تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۶۰ [2] ایضاً: ص ۱۶۵۔

دارا شکوہ کا جواب دیا اور مسئلے کی وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات اس پائے کے مرشد کو زیب نہیں دیتی جس پائے کے عارف (بلکہ ولی) وہ دارا کی تحریروں میں نظر آتے ہیں۔

(۳) روحانی قوت اور باطنی صلاحیت کے اعتبار سے دارا شکوہ کو اپنے مرشد پر فوقیت حاصل تھی۔ زیر تبصرہ معاملے میں اس نے، بقول خود، اپنی روحانی قوتوں کو مجتمع کر کے اپنی توجہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک پر مرکوز کی، اور وہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کی ارواح کے ساتھ اس کی مشکل کشائی کو آموجود ہوئی (اور وہ بھی سرراہے!!!) جب کہ ملا شاہ اپنی دانست میں اپنے اس مرید خاص کو مطمئن کر کے مطمئن ہو بیٹھے۔

(۴) مبینہ واقعے کے بعد جب پہلی بار دارا شکوہ نے ملا شاہ سے ملاقات کی اپنی "کارگذاری" بیان کی تو شاہ صاحب نے "سن کر" خوشی کا اظہار کیا۔ وہ شہزادے کو پیش آنے والے اس "واقعے" سے لاعلم تھے ورنہ وہ اسے دیکھتے ہی مسرت کا اظہار فرماتے۔ اپنی لاعلمی کے باوجود دارا شکوہ کی "روداد" سننے کے بعد ان کا یہ فرمانا کہ "ہمین بود کسی کہ این جواب بشما گفتہ ربا ہم گفتہ" کیا معنی رکھتا ہے؟ مبینہ واقعے کو درست تسلیم کرتے ہوئے اگر فرض کر لیا جائے کہ اس قابل صد تعظیم و تکریم ہستی صلی اللہ علیہ وسلم نے ملا شاہ سے صرف مسئلے کے حل کا ذکر فرمایا تھا اور دارا شکوہ سے اپنی ملاقات کے حال کا اخفا کیا تھا تب بھی انسانی فطرت اور نفسیات سے زیادہ ملا شاہ کی مرید نوازی اور ان کی افتاد طبع کا تقاضا تھا کہ گفتگو میں پہل خود ان کی طرف سے ہوتی اور دارا کی لب کشائی سے پہلے وہ اسے مبارکباد دیتے ہوئے

اپنے بیان کردہ مفہوم کی اصلاح اور وضاحت کر دیتے۔ اس کے ساتھ ہی جس طرح اپنے حصولِ عرفان کا اعلان "بہ بانگ بلند" کیا تھا،[1] سید کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی فیض پذیری کا اعلان بھی "بہ بانگ دہل" فرما دیتے۔

(۵) دارا شکوہ کو ان کی تاکید اکید کہ "این خواب نوشتنی است" البتہ خواہید نوشت" بھی مصلحت سے خالی نہیں۔ اس بات کے مشتہر ہونے سے کم از کم عوام و خواص پر یہ تو ظاہر ہو گا کہ ملا شاہ سے ملاقات کے لیے ان کے گھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ اور "پنجہ در پنجۂ خدا دارم" کا دعویٰ کرنے والے ملا شاہ کو "پروای مصطفیٰ" نہ سہی مگر مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا شاہ کی پروا تھی۔ اس ناقابل یقین روایت کو دارا شکوہ کی ذہنی اپج کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس کی اس افسانہ طرازی میں ملا شاہ بھی شریک ہو گئے۔ وہ شہزادے کو متاثر اور اپنے بس میں کرنے کے ہر ممکنہ حربے کو آزما رہے تھے کیوں کہ وہ اس سے اپنے مسلک کی ترویج و اشاعت کا کام لینا چاہتے تھے اور اس سے آس لگائے بیٹھے تھے۔ گو انھوں نے سرمد کی طرح صاف اور واضح الفاظ میں اسے سلطنت کی بشارت نہیں دی تھی،[2] مگر وہ اپنے "صاحبقران ملی" کے بادشاہ بننے کا خواب ضرور دیکھ رہے تھے۔ خود دارا شکوہ بھی احمقوں کی جنت میں جی رہا تھا۔

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۴۲ [2] صوفی سرمد نے دارا شکوہ کو سلطنت کی بشارت دی تھی۔ (ریاض الشعراء والہ داغستانی مخطوطہ نمبر ۲۴۳، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ: ورق ۱۰۱ ب) بقول صاحب "نشتر عشق": "سرمدم اکثر عند الاذکار اظہاری نمود کہ آخر رجوع سلطنت بتو خواہد بود" (مخطوطہ نمبر ۲۴۴، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ: ص ۸۶۱)

دارا شکوہ نے یہ روایت کب وضع کی ہوگی، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ ملا شاہ کے حالات کی ترقیم کے دوران حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اپنی نسبتِ ارادت کا ذکر کرتے ہوئے وہ اپنی عمر اٹھائیس سال تحریر کرتا ہے[1]۔ پھر چند سطروں میں شاہ میانمیر کے الطاف و عواطف اور ایک طویل پیراگراف میں ملا شاہ سے "رخصتِ ارشاد و اجازتِ ہدایت" پانے اور اس سلسلے میں کلام اللہ سے تفاؤل کرنے کا حال بیان کرنے کے بعد منقولہ بالا روایت نقل کرتا ہے۔ چونکہ وہ سلخ صفر ۱۰۵۲ھ کو اپنی عمر کے اٹھائیس سال پورے کر چکا تھا اس لیے ظن غالب ہے کہ اسی سال اس نے یہ ناقابل یقین روایت وضع کی ہوگی۔

غیبی آواز کے مسموع ہونے کا ادعا

۱۰۵۵ھ میں وہ صوبہ الٰہ آباد کی نظامت پر فائز ہوا۔ اسکے ساتھ ہی بنارس کے پنڈتوں، جوگیوں اور سنیاسیوں سے اس کا رابطہ قائم ہوا۔ اس نے ان سے سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوؤں کے قدیم متون تک براہ راست رسائی حاصل کر لی۔ ویدانتی فلسفے کے مطالعے نے اس کے عقاید و افکار میں زبردست انقلاب برپا کیا مگر اس کے اظہار سے اپنے آپ کو حسنات العارفین کی تالیف (۱۰۶۲ھ - ۱۰۶۵ھ) تک باز رکھا۔ اس دوران وہ بدستور سلاسلِ اولیا میں سلسلۂ قادریہ کی افضلیت کا دم بھرتا رہا۔ اس نے ۸ رجب ۱۰۵۵ھ کو رسالۂ حق نما کی تالیف کا آغاز کیا اور ۱۰۵۶ھ میں اسے تکمیل کو پہنچایا۔ اسکی نہایتِ تالیف کے باب میں رقمطراز ہے:

"جمعہ، ۸ رجب المرجب سنہ ایک ہزار پچپن ہجری کی رات میں اس فقیر کے سر میں

---

[1] سکینۃ الاولیا: ص ۱۶۳۔

آواز دی گئی کہ اولیائے خدا کے سلسلوں میں بہترین قادری سلسلۂ عالی اور طریقت روشن ہے جو سرورِ عالم اور فخرِ بنی آدم ..... محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا عارفوں کے پیشوا اور واصلوں کے مقتدا ..... سید عبدالقادر جیلانی الحسنی الحسینی رضی اللہ عنہ تک، اور ان سے پہنچا مشائخ عہد میں سب سے بزرگ .... پیر دستگیر شیخ میر قدس اللہ روحہ تک اور ان سے بے واسطہ منتقل ہوا شاہ محققاں.... حضرت مولانا شاہ سلمہ اللہ بالبقاہ کو، اور ان سے بے واسطہ (منتقل ہوا) راقم حروف (داراشکوہ) کو، اور میں اسی رات اس رسالے کی ترتیب پر مامور ہوا جو ہدایت کی راہ کے طالبوں کو خدا کی راہ دکھانے کے بیان پر محتوی ہے[1]

اس بیان سے مستنبط ہوتا ہے کہ وہ خود کو ملا شاہ کی خلافت کا دعوے دار تصور کرتا تھا اور ارشاد و ہدایت کا منصب بھی ان کے حسب حکم سنبھال لیا تھا۔ رسالۂ حق نما کی ترتیب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

رسالہ حق نما کی جامعیت کا تعلی آمیز اظہار

رسالہ حق نما میں داراشکوہ نے سلوک کے مراحل کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ یہ چھے فصلوں پر مشتمل ہے۔ (۱) در بیان عالم ناسوت (۲) در بیان عالم ملکوت (۳) در بیان عالم جبروت (۴) در بیان عالم لاہوت (۵) در بیان ہویت رب الارباب (۶) در بیان وحدت وجود۔ ان فصلوں میں سے صرف فصل دوم مفصل ہے باقی فصلیں انتہائی مختصر۔ عالم لاہوت کا بیان صرف سات سطروں میں سمٹ گیا ہے۔ اس رسالے کی عارفانہ افادیت کے بارے میں اس کا دعویٰ ہے:

---

[1] رسالہ حق نما (مشمولہ منتخبات آثار داراشکوہ) تہران، ص ۳-۲۰۔

"جو کوئی کسی کامل کی صحبت کا شرف نہ پا سکا ہو اور اسے کامل معرفت حاصل نہ ہوئی ہو، اس رسالے کو پڑھے اور غور و فکر کی نظر سے دیکھے اور شروع سے آخر تک ایک ایک بات کو عمل میں لائے، امید ہے کہ وہ مطلب حاصل کرے گے توحید کے پاک مشرب کو کہ انسان کے کمال کی انتہا معرفت ہے، پالے گا اور اس مطلب کو جس سے اسلاف اور اخلاف کی کتابوں کے اوراق بھرے پڑے ہیں اور لوگ اسے سمجھ نہیں سکے، پا جائے گا اور فتوحات، فصوص، سوانح، لوائح، لمعات، لوائح اور تمام کتب تصوف کو سمجھے گا۔"[1]

شاہی میں درویشی کا ادعا | رسالۂ حق نما کو رشد و ہدایت کے نقطۂ نظر سے دارا نے غیر معمولی اہمیت کا حامل قرار دیا ہے۔ لیکن یہ اس کی اولین دو تصنیف سفینۃ الاولیا اور سکینۃ الاولیا کی بہ نسبت زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ حالانکہ دارا نے اس کی عارفانہ افادیت کا انتہائی شد و مد سے اظہار کیا ہے۔ چنانچہ اس رسالے کی تعریف میں خود ستائی کی مکمل آمیزش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اگر کسی مرد خدا کی نظر میں یہ رسالہ آجائے تو وہ داد دے گا کہ اس فقیر کے لیے اللہ تعالیٰ نے کس مرتبے کے دروازے کھولے ہیں اور ایسے لباس[2] کے باوجود فقر و معرفت کے دروازے اس کے لیے کھولے ہیں تاکہ دنیا والوں پر واضح ہو جائے کہ اس کے فضل کو سبب کی حاجت نہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے خواہ کسی لباس میں ہو، اسے اپنی طرف کھینچتا ہے اور یہ وہ دولت نہیں جو ہر کسی پر ظاہر ہو بلکہ اس درگاہ کے اس نیاز مند کے لیے مخصوص ہے"[3]

---

[1] رسالۂ حق نما (مشمولہ منتخبات آثار دارا شکوہ) تہران، ص ۱۲-۱۳ [2] مراد شاہانہ لباس [3] رسالۂ حق نما مشمولہ منتخبات آثار دارا شکوہ، ص ۴۔

انجام کار دل کی بات زبان پر آہی گئی۔ اس نے تصنیف و تالیف کا شغل اسی مقصد سے اختیار کیا تھا کہ لوگ اس کے (خود اپنے بیان کردہ) فضل و کمال اور حقیقت شناسی و خدا رسیدگی کے درجہ و مقام سے واقف ہو جائیں اور اس کی معرفت یابی اور ولایت مآبی کا اعتراف کر لیں۔ منقولہ بالا اقتباس کا فقرہ "آن را کہ میخواہد، در ہر لباسی کہ باشد، بسوی خود میکشد" صاف غمازی کر رہا ہے اس کی اس خواہش کی کہ لوگ اس کی ظاہری ہیئت، وضع قطع اور شاہانہ شان و شوکت نہ دیکھیں بلکہ اسکے باطنی کوائف پر (جن کا اظہار اس کے اعمال و اوصاف سے نہیں، صرف اس کی ناقابل یقین عارفانہ تعلیوں سے ہوتا ہے) نظر رکھیں اور دیکھیں کہ بظاہر شاہزادہ اور شاہجہاں کا ولی عہد ہونے کے باوجود خدا نے اس کے لیے ولایت اور الہیت کے کیا کیا دروازے کھول دیے ہیں۔ یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ شاہی میں درویشی کا اعزاز ہر کس و ناکس کے لیے نہیں، صرف اس "نیاز مند درگاہ" یعنی شاہزادہ محمد دارا شکوہ کے لیے "خاص" ہے۔

اس بیان کی روشنی میں اب شک و شبہ کی گنجایش نہیں رہی کہ دارا شاہی میں درویشی کا نہیں بلکہ ریاکارانہ درویشی میں "ہندوستان کی بادشاہت کا خواب" دیکھ رہا تھا۔ بادشاہت اول و آخر اس کا مدعا تھی اور درویشی کا مظاہرہ اس کے حصول کا وسیلہ۔

عربی ناول اور اسلامی موضوعات

از

جناب منظور احمد خاں صاحب

انیسویں صدی عیسوی میں عالم عرب میں جو ذہنی بیداری واقع ہوئی، اسکے نتیجہ میں عربی ادب کو کئی صدیوں کے جمود سے چھٹکارا ملا۔ اس جمود کا سلسلہ تیرہویں صدی عیسوی کے وسط سے شروع ہوتا ہے جب چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو نے خلافت عباسیہ کی بنیادیں ہلادیں۔ اس نے بغداد کے گوشہ گوشہ میں وحشت و بربریت مچادی تھی، علما کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا، عصمتوں کو پامال کیا، یہانتک کہ کتب خانوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ اس طرح عربوں اور عربیت کا شیرازہ چار صدیوں سے زیادہ مدت کیلئے بکھر گیا، علمی و ادبی سرگرمیاں تقریباً ختم ہوکر رہ گئیں۔ عالم عرب اسی کس مپرسی کی حالت میں پڑا ہوا تھا کہ مغربی استعمار نے اسے اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر سے اپنی شعبدہ بازیوں کا نشانہ بنانا شروع کیا۔

تاہم تاتاری استبداد اور مغربی استعمار کے انداز و طریقہ کار میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ تاتاری تہذیب و ثقافت سے نابلد اور مثبت انداز سے عاری تھے، جبکہ اہل مغرب کے یہاں سلب و ایجاب کے دونوں پہلو پائے جاتے ہیں۔ ایکطرف

انھوں نے عربوں کے سیاسی، سماجی اور انفرادی حقوق پر شب خون مارا لیکن دوسری طرف انہیں جدید علوم اور زندگی کے نئے وسائل و ذرایع جیسے صحافت و طباعت وغیرہ سے بھی روشناس کرایا گو اس کا مقصد عربوں کے بجائے خود اپنے سیاسی مفاد کا تحفظ تھا۔ اس لیے جبر و استبداد اور تہذیبی جارحیت پر مبنی مغرب کی یہ حکمت عملی ان کے لیے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکی، اس کے برعکس یہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک نئی جد و جہد اور کشمکش کی باعث بن گئی۔

جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ - ۱۸۹۷ء) وہ پہلے رہنما ہیں جنھوں نے یہ محسوس کیا کہ اسلامی اور عرب ممالک کی پسماندگی اور جمود کی اصل وجہ ایک طرف ان کی سیاسی و اقتصادی زندگی پر مغرب کا بڑھتا ہوا اثر و نفوذ ہے اور دوسری طرف وہابیت کا روز افزوں پھیلاؤ۔ افغانی نے اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے مصر کو اپنا مستقر بنایا، جو ان کے نزدیک دوسرے اسلامی و عرب ممالک کی نسبت پختہ شعور کا حامل تھا اس لیے وہاں بیرونی اثر و نفوذ کو ختم کرنے کی دعوت موثر ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مصری نوجوان بالخصوص ازہر کا پڑھا لکھا طبقہ عرب ممالک کے عام نوجوانوں سے زیادہ بیدار مغز تھا، اس بنا پر اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے زیادہ موزوں تھا جو افغانی نے اسلامی ممالک کی صفیں درست کرنے کے سلسلے میں دیکھا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ بعض ایسے ہونہار نوجوانوں سے متعارف ہوا جنھوں نے بعد میں مصر کی نشأۃ ثانیہ میں بڑا حصہ لیا۔ ان نوجوانوں میں مصر کے مفتی اعظم شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ - ۱۹۰۵ء) آزاد مصر کے

قائد اور عظیم رہنما سعد زغلول (۱۸۵۰ - ۱۹۲۷ء) اور جدید مصری فکر کے ایک حامل لطفی السید (۱۸۷۲ - ۱۹۶۳ء) شامل ہیں۔

افغانی نے الحاد و دہریت کو تمام ادیانِ عالم اور خصوصاً اسلام کے لیے ایک عظیم فتنہ قرار دیا۔ انھوں نے اپنی پوری توجہ دہریت کو بے نقاب کرنے میں صرف کی، یہ وہ زمانہ تھا جب پوری مغربی دنیا دہریت کا گیت گا رہی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے فارسی میں "رد دھریین" کے نام سے ایک کتاب رقم کی جسے بعد میں ان کے شاگرد رشید محمد عبدہ نے "رسالۃ الرد علی الدھریین" کے نام سے عربی میں منتقل کیا۔ اس کتاب کا مرکزی موضوع ڈارونیزم کی تردید ہے۔ اسی کے ساتھ ہی اس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ اسلام اور صرف اسلام ہی انسانی معاشرے کو امن و سلامتی کی ضمانت فراہم کرکے مادیت کو تباہی و بربادی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یونان جیسی عظیم سلطنت کے زوال کا حقیقی سبب مادی نظریہ سے اس کی وابستگی ہے۔

افغانی کے نزدیک حقیقی تہذیب وہ ہے جس کی بنیاد مادی ترقی کے بجائے مذہب اور علم پر رکھی گئی ہو۔ اسی طرح وہ اخوت، عقل اور آزادی پر مشتمل اسلامی معاشرت کو بغض، انانیت اور ظلم و جبر سے عبارت مادی اشتراکیت پر فوقیت دیتے ہیں۔ مصر کے قہوہ خانوں میں دیے گئے ان کے خطبات اور پیرس سے شایع کردہ رسالہ "العروۃ الوثقیٰ" کے پورے عالمِ اسلام میں دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ تحریکِ اصلاح جو جزیرۃ نمائے عرب اور برصغیر ہند میں سلفیہ کے نام سے مشہور ہوئی اور پھر الاخوان المسلمون

جو اسلامی اقتدار کی بحالی کی داعی ہے، دونوں افغانی کی سعی و جہد کا ثمرہ ہیں[1]
بالآخر وہ روشنی جسے لے کر افغانی مصر میں وارد ہوئے ہزاروں مسلمان نوجوانوں کے دلوں کو منور کر گئی۔ ان کے فاضل شاگرد اور ان کی جلاوطنی کے رفیق محمد عبدہ نے اس روشنی کو مزید پھیلانے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کیں۔ انھوں نے تعلیمی مراکز کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور ازہر جو عالم اسلام کے تعلیمی اداروں میں بہت ممتاز اور بے نظیر ہے کی طرف توجہ کی۔ انھوں نے اصلاح و تجدید اور دین کو اوہام و خرافات سے پاک کرنے اور مسلمانوں کو جدید تمدن سے روشناس کرانے میں بھی کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ استاد اور شاگرد کے درمیان محض طریقہ اور وسیلہ کا اختلاف تھا۔ افغانی کا واحد مقصد عالم اسلام کی وحدت و یکجہتی تھا جبکہ محمد عبدہ کی پوری توجہ دینی اور تعلیمی اصلاح پر مرکوز رہی[2]

محمد عبدہ کو ازہر کے طلبہ کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار کا بہترین موقعہ میسر آیا۔ انھوں نے ذہن و فکر کو ہر طرح کی تقلید سے نجات دلانے کا درس دیا، اور اس بات پر بڑا زور دیا کہ مسالک و مذاہب سے بالاتر ہو کر دین کو صحابہؓ اور تابعینؒ کی طرح سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے جدید سائنس سے استفادہ، اسرار کائنات کی تحقیق اور قوانین فطرت کے انکشاف کی مکمل طور سے دعوت دی، کیونکہ ان کے نزدیک اسلام سائنس کے ثابت شدہ حقائق کی

---

[1] ملاحظہ ہو جمال الدین افغانی، اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۴ء
[2] جرجی زیدان، مشاہیر الشرق، ج ۱، دار المکتبۃ الحیاۃ، بیروت، ص ۲۸۶۔

کسی بھی صورت میں مخالفت نہیں کرتا ہے[۱]

بدقسمتی سے جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی نشاۃ ثانیہ کی دعوت اس راہ پر قائم نہیں رہ سکی جس پر ان دونوں رہنماؤں نے اسے چلانے کی کوشش کی تھی، کیونکہ مغرب کی تہذیبی جارحیت نے رفتہ رفتہ پورے عالم عرب کو اپنی زد میں لے لیا اس جارحیت کا سب سے اہم مرکز وہ تعلیم گاہیں تھیں جن کی تاسیس سرکار اور کلیسا کی مشینریوں کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی اور جب ان کے فارغ شدہ طلبہ پورے شام، لبنان اور مصر کی صحافت پر قابض ہو گئے تو انھوں نے پڑھے لکھے عرب نوجوان طبقہ میں مغربی تہذیب اور مغربی فلسفۂ زندگی کی پوری پوری تبلیغ کی انھی لوگوں کے ذریعہ ناول پہلی بار عربی ادب میں پذیرائی حاصل کر سکا۔

طلبہ کے ان وفود نے بھی جدید عربی فکر و ادب پر گہرے نقوش چھوڑے جو حکومت مصر کی جانب سے فرانس، اور اٹلی وغیرہ میں حصولِ تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ گو ان کو بنیادی طور پر سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے کے مقصد سے بھیجا گیا تھا لیکن مغربی تہذیب کی پرفریب کشش نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس لیے اپنے ملک میں واپس آ کر وہ مغربی افکار و ادبیات کو اپنی زبان میں منتقل کرنے لگے[۲]

---

[۱] شوقی ضیف، الادب العربی المعاصر فی مصر، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۷۹ء، ص ۲۲۲ [۲]

HAMDI SAKUT, THE EGYPTIAN NOVEL & ITS MAIN TRENDS, DAR AL-MA'ARIF, CAIRO, 1971, PP. 2, 3.

نیز یہیں سے محمد عبدہ کی حریت پر مبنی اسلامی فکر اور مغربی افکار کے طلسم میں گرفتار لطفی السید اور قاسم امین (۱۸۶۵ - ۱۹۰۸ء) کے مادی اور سیکولر نظریات ایک دوسرے سے مخلوط ہونے لگتے ہیں۔ موخرالذکر لوگوں نے صحافت اور تعلیم کو مغربی رنگ میں رنگنے اور اسلامی اقدار کو کمزور کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ نامور مصری محقق و ناقد انور الجندی کی رائے میں یہی لوگ قدیم مصری یونیورسٹی میں مستشرقین کا تقرر کر کے اور پھر ازہر اور اہل ازہر پر حملے کر کے مغربی تہذیب اور بالخصوص فرانسیسی تہذیب کی بالادستی کی راہ ہموار کرنے کے ذمہ دار ہیں[1] قاسم امین پردہ، تعدد ازدواج اور طلاق پر پے در پے اعتراضات کی وجہ سے بدنام ہیں۔ انہیں آزادئ نسواں کا علمبردار بھی سمجھا جاتا ہے اور ان کے نزدیک اس آزادی کی پہلی سیڑھی مخلوط تعلیم ہے[2]

مغربی تہذیب کی جارحیت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ہونہار مسلم طلبہ کے اذہان کو مسموم کر کے اس نے انہیں اسلامی اقدار کا دشمن بنا دیا چنانچہ پہلے جامعہ مصریہ نے طلبہ کی ذہنی صفائی (BRAIN - WASH) کا کام انجام دیا، اور بعد میں اسی مقصد کے لیے یورپ میں مخصوص طرز کے ادارے قائم کیے گئے۔ جدید عربی ادب کی بلند پایہ شخصیت طٰہٰ حسین اسی سازش کا شکار ہو کر اس کے روح رواں بن گئے تھے[3] طٰہٰ حسین نے ۱۹۱۹ء میں فرانس سے واپسی پر صحافت،

---

[1] انور الجندی، محاکمۃ فکر طٰہٰ حسین، دار الاعتصام، ۱۹۸۴ء، ص ۸۰-۸۱. P. K.

[2] HITTI, HISTORY OF ARABS, MACMILAN & CO, LONDON, 1953 P. 755.

[3] انور الجندی، ص ۸۔

تعلیم اور ثقافت پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ ان تینوں میدانوں میں انھوں نے ڈیکارٹ کے فلسفۂ شک پر عمل پیرا ہوکر اسلامی تہذیب و ثقافت سے متعلق لوگوں کے اذہان میں طرح طرح کے شکوک پیدا کیے۔

دوسری جانب بیسویں صدی کے نصف اول میں رونما ہونے والے تغیرات نے ادباء و شعراء کی توجہ قوم و ملت کے مسائل سے ہٹا کر علاقائی مسائل کی طرف پھیر دیا۔ ان مسائل میں بلاد عربیہ کی عرب لیگ کی آزادی اور نقر و فاقہ کے خلاف مغربی افکار و نظریات کا سہارا لے کر جنگ شامل ہے۔ یہی وہ تحدیات تھے جن کا سامنا اسلامی فکر کو عصر جدید میں عالم عرب میں اس وقت کرنا پڑا جبکہ عربی ناول بلکہ پورا جدید عربی ادب ابھی ارتقائی مراحل طے کر رہا تھا۔

عصر جدید کے عربی و اسلامی فکر کے اس پس منظر سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی ناول میں اسلامی اثرات نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم بعض ناول نگاروں نے اسلامی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ چنانچہ طٰہٰ حسین نے ازہر کے علماء کے غیظ و غضب کو کم کرنے اور عام لوگوں کے ذہنوں سے خود مختلف مباحث میں پھیلائے ہوئے اپنے شکوک کے ازالہ کے لیے اسلامی موضوعات کو ناول کے سانچے میں پیش کیا۔ اسی طرح علی احمد باکثیر نے ناول کے پیرایہ میں کبھی اسلام اور مادیت کا موازنہ کیا اور کبھی اسلام کے تصور جہاد کو قاری کے سامنے پیش کیا۔[1]

---

[1] ان دونوں کے علاوہ کئی اور ناول نگاروں نے بھی اسلامی موضوعات پر قلم اٹھایا جن میں کمال گیلانی پیش پیش ہیں مگر بدقسمتی سے ہمیں ان کی تحریروں تک بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی رسائی حاصل نہیں ہوسکی۔

اس طرح عربی ناول نے جن اسلامی موضوعات کا احاطہ کیا وہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) سیرت نبویؐ (۲) سیرت صحابہؓ (۳) جہاد اور (۴) کیونزم اور اسلام کے درمیان کشمکش ۔

سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم | یہ موضوع آنحضورؐ کی حیات طیبہ سے لے کر آج تک برابر عرب ادبا و شعرا کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اختراعی ذہن کے مالک طٰہٰ حسین نے اسے کہانی کے سانچے میں ڈھالا اور "علی ہامش السیرۃ" نام کی ایک کتاب تالیف کی ۔ اپنے مقصد اور طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے طٰہٰ حسین کتاب کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں :

" میں نے اس کتاب میں نبی کریمؐ کے ظہور سے قبل عہد کے کچھ خرافات بیان کرنے کی کوشش کی ہے ۔ پھر میں نے آپؐ کی ولادت اور بچپن کے حالات بیان کیے ہیں اور میں اس سلسلہ کو جیل لومیتر سے مستعار لیے گئے عنوان یعنی " علی ہامش السیرۃ " کے تحت شائع کر رہا ہوں ، جس کا مفہوم ہے متعلقات سیرت نبویؐ ۔ یہ کتاب محض تخیل کی اختراع ہے ... میں نے اس میں چند دیو مالائی قصوں کی ماہیت پر اعتماد کرکے واقعات بیان کرنے اور (ناول کا) ڈھانچہ وضع کرنے میں پوری آزادی سے کام لیا ہے تاہم یہ ڈھانچہ نئے ذہنوں کا ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ قدیم تصورات کا محافظ بھی ہے۔[1]"

اس طرح طٰہٰ حسین وہ پہلے ادیب ٹھہرے جنہیں عربی ادب میں خرافات کا حامی ہونے کا "شرف" حاصل ہوا ۔ ان کے خیال میں لوگ خرافات کے مطالعہ میں

---

[1] ملاحظہ ہو : انور الجندی ، ص ۱۸۴ ۔

شدید میلان رکھتے ہیں۔ ان کا یہ استدلال اس امر پر مبنی ہے کہ یونان، روم اور مغرب کا ادب خرافات سے بھرا ہوا ہے۔ طٰہٰ حسین کو شکایت ہے کہ عربوں میں خرافات کی جانب میلان تقریباً مفقود ہے، وہ سیرت کو مشہور یونانی رزمیہ "ایلیڈ" کے ہم پلہ قرار دے کر ادبا کو اس سے دلچسپی لینے کی تلقین کرتے ہیں۔

طٰہٰ حسین نے سیرت نبویؐ کو دیومالائی قصوں اور خرافات جیسا قرار دے کر ناروا جسارت کی ہے دراصل سیرت نبویؐ پیغام الٰہی کا غیر منقسم حصہ ہے، جس کا مطالعہ دل لگی و تفریح کے بجائے ایمان کے اضافہ و ازدیاد کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس امر میں ذرا بھی شبہ نہیں ہے کہ اسلام ہر طرح کے خرافات کا سرے سے مخالف ہے، کیونکہ یہ باطل اوہام اور وسوسوں کی پیداوار ہیں، جبکہ اسلام کی بنیاد سراسر علم، یقین اور معرفت پر ہے۔ طٰہٰ حسین کے ناپاک عزائم اور منصوبوں کو خاک میں ملا دینے میں خود ان کے ہم خیال رفقا کا بڑا حصہ ہے، اس ضمن میں محمد حسین ہیکل کا نام سرفہرست ہے، انھوں نے ان کی مذکورہ بالا کتاب پر سخت اعتراضات کیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ طٰہٰ حسین عقل و منطق کے ذریعہ اپنی بات منوانے میں ناکام ہونے کے بعد دیومالائی قصوں پر اتر آئے ہیں۔ دوسرے محققین و ناقدین نے اس کتاب کو ان کی ممنوعہ کتاب "فی الشعر الجاھلی" کا ضمیمہ بتایا ہے[1]۔ ان ناقدین کی نظر میں اس کتاب کو "علی ھامش السیرۃ" کہنے کے بجائے "علی ھامش الشعر الجاھلی" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انور الجندی کا یہ خیال بالکل بجا ہے کہ اسلام سے متعلق طٰہٰ حسین کی دوسری کتابوں کی طرح

---

[1] انور الجندی، ص ۱۹۱۔

دمشق کی قامشی "مسیرۃ" بھی مغربی طرزِ فکر کی تقلید کا ثمرہ ہے، اس کا مقصد مسلمانوں کو اپنی اصل و اساس سے بیگانہ کرنا ہے، یہ یونان کی مشرکانہ فکر اور یہودی خرافات سے مغلوبیت کی آئینہ دار ہے۔

سیرت صحابہؓ | اس موضوع پر طٰہٰ حسین نے "الوعد الحق" کے نام سے ایک کتاب تالیف کی۔ جس کا مقصد بیکس و بے مددگار مسلمانوں کے اسلام لانے اور انکی زندگی کے مخفی واقعات و حالات کی عکاسی ہے، تاہم یاسرؓ بن عامر، انکی اہلیہ سمیہؓ اور ان کے فرزند عمار بنؓ یاسر کا ذکر پوری کتاب پر چھایا ہوا ہے۔ مؤلف نے اسلام کی نسبت سے ان نفوس قدسیہ کے جوش و ولولہ خیز واقعات بڑی صراحت سے پیش کیے ہیں[1]۔

جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں لوگوں کے سامنے اللہ کا پیغام پیش کیا تو ان پاکیزہ نفوس نے کلمۂ حق پر لبیک کہنے میں توقف و تامل سے کام نہیں لیا لیکن قریش کے سربرآوردہ لوگوں نے ان کی اس حق پسندی کو اپنے خلاف علانیہ بغاوت سمجھا اور ان کے درپے آزار ہوگئے، انھوں نے شمع رسالت کے پروانوں پر طرح طرح کے مصائب ڈھائے مگر اس کے باوجود قریش کے سرداروں کو ناکامی ہوئی اور ان کی ناقابل بیان اذیتیں صدق و صفا کی راہ پر چلنے والوں کا قدم ڈگمگا نہ سکیں بلکہ اس سے ان کا ایمان مزید راسخ اور عقیدہ پختہ ہوتا گیا

ع بڑھتا ہے ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

دراصل طٰہٰ حسین کی یہ کتاب مندرجہ ذیل آیتوں کی مکمل تفسیر ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو: طٰہٰ حسین، الوعد الحق، دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۸۱ء، ص ۴۲، ۴۳۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا
مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ
كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِهِمْ، وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ
دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى
لَهُمْ، وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ
بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا،
يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ
بِيْ شَيْئًا، وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ
ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ

(نور : ۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے
ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں
اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی
طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح
ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو
بنا چکا ہے اور ان کے لیے ان کے اس
دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا
جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند
کیا ہے اور ان کی (موجودہ) حالت
خوف کو امن سے بدل دے گا، بس
وہ میری بندگی کریں، میرے ساتھ
کسی کو شریک نہ کریں اور جو اس کے
بعد کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔

وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ
اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ
وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ
الْوٰرِثِيْنَ. وَنُمَكِّنَ لَهُمْ
فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ
وَهَامَانَ وَجُنُوْدَهُمَا

اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی
کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل
کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا
بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں
اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں
ان سے فرعون و ہامان اور ان کے

مِنْهُمْ مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جن کا انہیں ڈر تھا۔ (القصص: ۵-۶)

مولف نے ان آیات کو متعدد بار نقل کیا ہے اور اول الذکر سے کتاب کی ابتدا اور موخر الذکر سے اس کا اختتام کیا ہے۔

لیکن یہ کتاب بھی مصنف کے مخصوص طرز فکر کی آئینہ دار ہے اور اس میں انھوں نے صحابہؓ کرام کے اوصاف حمیدہ اور مومنانہ خصائل کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً وہ حضرت خبابؓ بن الارت کے بارے میں یہ خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے اپنے تقویٰ کا اظہار کر کے اپنے دو رفقاء حضرت بلالؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ پر اپنا تفوق ظاہر کیا، تدوین قرآن کے ضمن میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عثمان بنؓ عفان کے اختلافات کا ذکر کیا ہے جیسا کہ معلوم ہے حضرت عثمانؓ نے قرآن پاک کی جمع و تدوین کے لیے حفاظ صحابہؓ کی ایک کمیٹی تشکیل کی تھی جس کی صدارت حضرت زید بنؓ ثابت کو سپرد کی تھی۔ یہ کام انجام پا گیا تو خلیفہ نے پہلے سے مرتب تمام غیر سرکاری نسخوں کی تحریق کا حکم جاری کیا مگر امام ابو داؤدؒ نے عبداللہ بنؓ مسعود کی یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ اکثر کہا کرتے تھے "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ستر سورتیں سیکھیں اور زید بنؓ ثابت بچے تھے۔" اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ صدارت کے لیے حضرت ابن مسعودؓ اپنے کو حضرت زید بنؓ ثابت کے مقابلہ میں زیادہ اہل سمجھتے تھے۔ لیکن جب حضرت زیدؓ کو خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب وحی مقرر فرمایا تھا تو بھلا ان کی اہلیت پر کسی کو شک کرنے کی گنجایش ہی کہاں باقی رہ جاتی ہے[1] اور حضرت ابن مسعودؓ خلیفہ کے حکم کو

---

[1] مقالات شبلی جلد ۱ ص ۱۶ و ۱۷۔

کیسے نظر انداز کر دیتے ان کے لیے تنقید کرنے کا جواز کہاں باقی تھا جب کہ خلیفہ کے فیصلے کو پوری شوریٰ کی تائید حاصل تھی۔

مصنف نے بیت المال کے ہیرے کے سلسلے میں حضرت عمار بنؓ یاسر اور حضرت عثمان بنؓ عفان کے اختلافات کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کے اہل خانہ میں سے کسی نے اس ہیرے کو زیور بنا کر پہنا اور یہ بات پورے صحابہؓ میں مشتہر ہو گئی تو اکثر نے اسکے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ جب یہ بات خلیفہ کو معلوم ہوئی تو انھوں نے جمعہ کو منبر سے یہ اعلان کیا کہ انھوں نے جو کچھ بیت المال سے لیا ہے وہ اپنی ضرورت کے لیے لیا ہے آئندہ بھی کچھ لوگوں کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ایسا کرتے رہیں گے۔ اس اعلان پر جب حضرت علیؓ اور حضرت عمارؓ نے انہیں للکارا تو وہ حضرت علیؓ کی بات پر خاموش ہوئے لیکن حضرت عمارؓ کو گالی دی۔

حضرت عثمانؓ اور ان کے بعض معاصرین خصوصاً عمار بنؓ یاسر کے درمیان بعض اختلافات ضرور تھے، لیکن مصنف کی لغو بیانی اور حضرت عثمانؓ پر ان کی صریح تہمت سے کوئی صاحب علم اتفاق نہیں کرے گا، اس طرح کی نامناسب باتیں تو عام افراد کے بھی شایان شان نہیں ہیں چہ جائیکہ صحابۂ کرامؓ اور ایک خلیفہ برحق کی جانب ان کو منسوب کیا جائے جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "کامل الحیاء والایمان" کے مبارک لقب سے نوازا ہے۔

کتاب کا یہ آخری حصہ جس میں مشاجرات صحابہ کا تذکرہ ہے نہایت

قابل اعتراض ہے اس کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ نعوذ باللہ طٰہٰ حسین مذکورہ
بالا قرآنی آیات کا مذاق اڑا رہے ہیں، یہ حصہ مختلف فیہ مسائل پر مشتمل ہونے
کے علاوہ ناول کی تکنیک سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ کتاب کے نام "الوعد الحق"
کی رعایت سے مجبور و مظلوم مسلمانوں کی قبل از اسلام کی زندگی سے لے کر
امامت و سیادت پر ان کے فائز ہونے تک کے دور کو موضوع بحث بنایا جا سکتا
ہے۔ لیکن اختلافات اور اہانت صحابہ کے تذکرہ[1] سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف
خلافت و سیادت کے وعدہ پر مشتمل آیاتِ کریمہ کو کھلے عام جھٹلانا چاہتا ہے،
یا پھر وہ قاری کی توجہ اس کی طرف موڑ دینا چاہتا ہے کہ ان صحابہ کو حضرت
عثمانؓ کے ہاتھوں جس طرح ایذا رسانی اور بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا اسی
طرح کی ایذا وہ مشرکین مکہ کے ہاتھوں عہد جاہلیت میں بھی جھیل چکے تھے۔

جہاد | اس موضوع کو علی احمد باکثیر نے "وا اسلاماہ" نامی ناول میں لیا
ہے۔ یہ ناول ہلاکو خاں کے مصر پر حملہ اور سلطان مظفر قطز کی قیادت میں
مصریوں کے تاتاری سیلاب کے دفاع کے بیان پر مشتمل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ
جب ہلاکو نے عراق، شام اور ان کے مضافات فتح کرنے کے بعد سلطان مصر
کو دھمکیاں بھیجیں تو سلطان نے ان دھمکیوں کی کوئی پروا نہیں کی بلکہ اسکے
چار قاصدوں کو موت کے گھاٹ اتار کر ان کے سر قاہرہ کے زویلہ دروازے
پر لٹکا دیے اور خود اس سفاک دشمن کے خلاف فیصلہ کن معرکہ کی تیاری میں
لگ گیا۔ اس سلسلے میں اس نے مصر کی سرکاری فوج کے ساتھ ساتھ مجاہدین

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الوعد الحق، ص ۱۵۵-۱۵۹۔

اور عام رضاکاروں کی خدمات سے بھی پورا فائدہ اٹھایا جو سلطان کی دعوت جہاد پر لبیک کہہ کر صف بستہ ہوئے تھے۔ اس طرح سرفروشوں کا یہ گروہ ان تاتاری افواج سے جن کی دھاک تمام اقوام عالم کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی، نبرد آزما ہونے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں افواج کا آمنا سامنا مصر کے عین جالوت نامی مقام پر ہوا جہاں مصری مسلمانوں نے اس درندہ خصلت قوم کے دانت کھٹے کر کے رکھ دیے۔

یہی واقعات باکثیر کے مذکورہ بالا ناول کی بنیاد فراہم کرتے ہیں، جس کی صراحت اس کے مقدمہ میں بھی موجود ہے۔ لیکن جب آگے چل کر مولف کی پوری توجہ مظفر قطز کی شخصیت کی تصویر کشی پر مرکوز ہوتی ہے تو یہ واقعات ثانوی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس طرح باکثیر پر ناقدین کا یہ قول بالکل صحیح ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے ناول کے روح پرور اور جوش آفریں عنوان کے بجائے اس کے ہیرو کی طرف زیادہ توجہ دی۔ اسی طرح وہ مجاہدین اور رضاکار بھی ان کی بے توجہی کا شکار بن گئے جن کے متعلق بعض تاریخی ماخذ میں بتایا گیا ہے کہ ان کی تعداد سرکاری افواج سے کہیں زیادہ تھی اور یہ کہ انھوں نے اس فتح میں فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔[1]

کمیونزم اور اسلام کے درمیان کشمکش | علی احمد باکثیر کا مشہور تاریخی ناول "الثائر الاحمر" اس موضوع کا احاطہ کرتا ہے، جس میں وہ واشگاف الفاظ میں اس

---

[1] احمد ابراهيم الهواري، الرواية التاريخية في الادب العربي، دار المعارف، قاهره ۱۹۷۹ء، ص ۸۴۔

حقیقت کا اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ کمیونزم کا نظریہ اسلامی نظریہ حیات کے مقابلہ میں ناکام ثابت ہوگیا ہے۔ ایک طرف وہ یہ بات کوفہ میں مزدور طبقہ پر زمینداروں کے ظلم و استبداد کی تصویر کشی کر کے سامنے لاتے ہیں اور دوسری طرف وہ کمیونزم کے غیر فطری اور بالخصوص اسلامی طبیعت سے اس کے متصادم ہونے کو نمایاں کرتے ہیں۔

ناول کا ہیرو مزدور طبقہ کا فرد ہے جو اپنے علاقہ کے زمیندار کے مظالم کا نشانہ ہے زمیندار اسے معمولی اجرت دے کر اس کی جسمانی قوت کا استحصال ہی نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اس کی بہن کا بھی اغوا کرتا ہے۔ اس جابرانہ طرز عمل کے احتجاج میں وہ غنڈوں کے ایک گروہ سے جا ملتا ہے، جن کا کام مالدار طبقہ پر ڈاکہ ڈال کر مفلسوں کی جھولی بھرنا ہوتا ہے۔ دریں اثنا وہ کوفہ کے گرد و نواح میں کاشتکاروں اور مزدوروں کے درمیان اسماعیلی فرقہ[1] کے فروغ کی مہم میں بھی حصہ لیتا ہے یہاں تک کہ وہ "بطائح" کا علاقہ اپنے قبضہ میں کر لیتا ہے۔ تاہم اسے خلیفۂ وقت کے بھائی کے ہاتھوں شکست ہوتی ہے اور وہ مدۃ العمر روپوش ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جب نیا خلیفہ معتضد مصلح و داعیٔ اسلام برسر اقتدار آیا تو وہ ایک طرف سے فقیہ وقت ابو البقار کی اسلامی تشریع کی کافی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دوسری طرف اسلامی اصولوں کے نفاذ کا عملی خاکہ تیار کرواتا ہے۔ قدرتی طور پر عام لوگوں کے معاشی حالات

[1] یہ لوگ اسماعیل بن جعفر صادق کی امامت کے قائل ہیں، فاطمی خلیفہ مستنصر کے عہد تک
[illegible]

رفتہ رفتہ بہتر ہو جاتے ہیں اور ہیرو اسماعیلی فرقہ کی حمایت سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں کو نئے خلیفہ کی اطاعت کی ترغیب دیتا ہے۔

جدید مصری محقق حمدی سکوت کے مطابق جن اصولوں کی تجویز فقیہ ابوالبقاءؒ نے ناول میں پیش کی، بعد میں مصری معاشرہ میں ان کے دور رس اثرات مرتب ہوئے اور مصری حکومت نے ناول کی اشاعت کے چند سال بعد[1] انہیں پوری طرح نافذ کیا۔ ان اصولوں میں مثال کے طور پر ابوالبقاء کا یہ قول بھی شامل ہے کہ "حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ زمین کا مالیہ مقرر کرتے وقت اس کی زرخیزی اور حجم کا خیال رکھے اور یہ کہ صاحب زمین سے کسی بھی صورت میں مقرر کردہ مالیہ سے زیادہ رقم کا مطالبہ نہ کرے۔" یہ قول مصر کی زرعی اصلاح کی ایک دفعہ سے ملتا جلتا ہے جس کا نفاذ ۱۹۵۲ء کے فوجی انقلاب کے بعد عمل میں آیا[2]

مذکورہ بالا بیانات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عربی ناول نے اسلامی موضوعات کا اس قدر اہتمام نہیں کیا جس قدر اس نے معاشرتی، رومانی اور دوسرے موضوعات کا اہتمام کیا۔ ہمارے خیال میں عربی ناول میں اسلامی موضوعات کیلئے ایک وسیع میدان کھلا پڑا ہے، کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کے درمیان تفریق بالعموم اور عرب مسلمانوں کیلئے بالخصوص۔ جنکا عقیدہ راسخ ترین اور خالص ترین ہے۔ ناممکن ہے۔ چونکہ اسوقت پورا عالم عرب آمریت اور خلفشار کے دور سے گذر رہا ہے اور یہ کہ وہ اپنے ملی تشخص سے یکسر بیگانہ ہے ان حالات میں ادب اور بالخصوص ناول اسلامی افکار کی تبلیغ کا ایک موثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

---

[1] یہ ناول ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا
[2] HAMDI SAKUT, PP. 68. 69.

اخبار علمیہ

ادھر چند برسوں میں دنیا بھر میں علوم اسلامیہ کے عمدہ اور قابل قدر رسالوں اور مجلوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے، کوالالمپور ملیشیا کے ادارہ بیریٹیا پبلشنگ کی جانب سے شایع ہونے والا سہ ماہی مجلہ پیریوڈیکا اسلامکا Periodica Islamica اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، ڈاکٹر منور احمد انیس اور عبدالرحیم بن اسمٰعیل کی زیر ادارت اس مجلہ کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں مذہب، تاریخ، تہذیب، تمدن، معاشرت، اجتماعیات اور سیاسیات کے تعلق سے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق دنیا کے مختلف ملکوں کے اہم رسائل کے مضامین و مقالات کی تلخیص سلیقہ سے پیش کی جاتی ہے، رسالہ کے آخر میں مضمون نگار اور اشاعتی اداروں کا مکمل اشاریہ بھی درج کیا جاتا ہے، پہلے شمارہ میں لاطینی حروف میں طبع ۱۱۴ رسالوں کے مضامین کی تلخیص و اشاریہ موجود ہے، ان کو حالات حاضرہ، مطالعہ اسلامی، فلسفہ، تاریخ، سائنس، تکنولوجی، معاشیات، نسائیات، آرٹ، تعمیر، فلسطین، شرق اوسط اور جنوب ایشیا، افریقہ، مسلم اقلیتیں، بین الاقوامی امور اور بین المذاہب مطالعے کے عنوانوں کے تحت درج کیا گیا ہے مزید خوشی اس کی ہے کہ ادارہ نے عربی اور اردو رسائل کی تلخیص شایع کرنے کا بھی منصوبہ بنایا ہے۔

ادارہ مقتدرہ قومی زبان پاکستان کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان انگریزی اردو لغت کی تالیف کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے، اب ادارہ کے ماہانہ ترجمان

اخبار اردو کے تازہ شمارہ سے یہ خوش اثر خبر ملی کہ یہ لغت طبع ہوگیا ہے، گذشتہ چار برسوں سے زیر تالیف اس لغت میں تمام علوم و فنون کے الفاظ و اصطلاحات پر مشتمل تقریباً دولاکھ اندراجات ہیں، برطانوی انگریزی کے علاوہ امریکی انگریزی کے املا، معانی اور روزمرہ محاورات کو یکجا کرنے کی جدت بھی کی گئی ہے، ایک لفظ کے ایسے تمام معانی جمع کر دیے گئے ہیں جو مختلف مستند کتابوں میں استعمال کیے گئے ہیں، اسی طرح معانی کے ساتھ مترادفات بھی زیادہ سے زیادہ دیے گیے ہیں۔ لفظ میں موجود بنیادی تصور کی نشاندہی بھی کردی گئی ہے، لغت سے استفادہ میں سہولت کا خاص خیال رکھا گیا ہے مثلاً ایک لفظ کے معنی کیمیا اور طبعیات میں مختلف ہیں تو ان دونوں کے زیر عنوان الگ الگ معنی دیدیے گئے ہیں۔ کمپیوٹر کی کتابت میں بڑی تقطیع پر ۲۰۴۲ صفحات پر مشتمل اردو زبان میں اب تک کا یہ سب سے ضخیم لغت ہے پاکستانی سکہ میں اس کی قیمت ۹۹۰ روپیے ہے۔

گذشتہ دنوں رباط مراکش میں منعقدہ اسلامی دستکاری اور صنعت و حرفت کے متعلق ایک بین الاقوامی سیمینار کی خبر ملی تھی، اب معلوم ہوا کہ سیمینار کا خاص مقصد مسلم ممالک میں روایتی صنعتوں اور دستکاریوں کے بقا و تحفظ اور جدید طرز پر ان کی ترقی و فروغ پر غور و خوض کرنا تھا، یونیسکو، الیسکو، ورلڈ کرافٹ کاؤنسل کے نمایندوں اور بعض ممتاز بین الاقوامی اداروں کے ماہرین کے علاوہ انڈونیشیا، ایران، اردن، بحرین، برونی، بنگلہ دیش، پاکستان، ترکی، تیونس، دارالسلام، سعودی عربیہ، شام، فلسطین، گیانا، لبنان، ملیشیا، مراکش، مصر، نائیجیریا اور یمن کے مندوبین کی جانب سے ۴۳ مقالات پیش کیے گئے۔ کلیدی مقالہ

Livingcrafts in Islam, Past, Present And Future

تھا۔ اس کے علاوہ فن کے فروغ میں تکنیکی تعاون اور تکنولوجی کی منتقلی، معیاری صنعتی پیداوار کے مسائل، دستکاری کی ترقی اور معاشی و مالی پہلو اور روایتی حرفتوں کا تحفظ وغیرہ مقالے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سیمینار کی قراردادوں میں اولیت صنعتوں کی تعلیم و تربیت کو دی گئی اور قدیم و نفیس قدیم اسلامی مصنوعات کو مزید آب و تاب کے ساتھ پیش کرنے پر بھی توجہ دی گئی، مختلف ممالک کے ماہر دستکاروں کے تبادلۂ خیال اور تکنیکی تعاون اور مالی دشواریوں کے حل کے علاوہ اشتہار کے جدید ترین ذرائع نمائش اور میوزیم کے انعقاد پر بھی بحث ہوئی، اس موقع پر اسلامی صنعت و حرفت کے شاہکار نمونوں کی نمائش ہوئی اس میں ترکی سے انڈونیشیا تک کے ماہرین کی حیرت انگیز دستکاریوں کے عجیب نمونے دیکھنے میں آئے، سفال گری سے لے کر کپڑے، ریشم، قالین، چمڑے اور شیشے کے نمونوں نے نمائش کو ایک طلسم خانہ بنا دیا، بنگلہ دیش کے وفد نے ریشم کے کپڑے پر تاج محل کا زرنگار نقش پیش کیا جو نگاہ و دل کے لیے خاص کشش کا سبب بنا رہا۔ اسلامی فن صنعت پر چند تازہ مطبوعات بھی پیش کی گئیں۔

گذشتہ دنوں استنبول کی ایک دلچسپ نمائش میں عثمانی عہد کے آلات اوزان اور پیمایش کے آلات و ظروف کو پیش کیا گیا، عجیب عجیب برتن چمچے، طویل ترین بھی اور بہت مختصر بھی، جوہریوں کے آلات و ظروف کے علاوہ نظام اعشاری سے قبل، وزن کرنے کے عجیب و غریب آلات نے

کیل و وزن میں عثمانیوں کے انصاف پر شہادت فراہم کردی، نہایت پیچیدہ اور انتہائی نازک اور دقیق آلات اور کانسے اور پیتل کے وزن کرنے اور مہر کے کام میں آنے والے درہم لائق دید تھے، ان اوزان اور پیمانوں کو اسطرح سلیقہ سے پیش کیا گیا تھا کہ عہد سلیم اول سے عبدالحمید ثانی تک انکے ارتقا کا بھی اندازہ ہو جائے، ان ظروف کے طریقۂ استعمال کی تفصیلات بھی فراہم کی گئیں، نظام اعشاری سے ماقبل غلہ اور اجناس کے تبادلہ کی صورت میں جو طریقہ رائج تھا اس کو بھی واضح کیا گیا۔

"نو صدیوں کے اسلامی ہتھیاروں کے فوجی ورثہ پر ایک نظر" کے زیر عنوان، ریاض، سعودی عربیہ میں ایک دلچسپ نمائش بھی لائق ذکر ہے، اس میں آٹھویں صدی سے تیرہویں صدی تک مسلمان عسکریوں کے اسلحہ جات کو پیش کیا گیا ہے، تقریباً ۴۵۰ قسم کے ان ہتھیاروں کو دیکھ کر مسلمان فوجوں کی فتح و ظفر مندی کی پارینہ داستان پھر تازہ ہو گئی، کاش اس نمائش میں ٹوٹے ہوئے نیزوں اور خم شدہ تلواروں اور ..... عجیب و غریب اور نادر و منفرد ساخت کے ان ہتھیاروں کے پس منظر جوش و ولولہ کے نقوش بھی دیکھے جاتے، آرٹ، مصوری اور دوسرے فنون جمیلہ کی قدردانی کے اس دور میں اس قسم کی بامقصد نمائشوں کا آغاز تو ہوا۔

(ع۔ص)

معارف کی ڈاک

مکتوب پاکستان

مکرمی و محترمی مولانا اصلاحی صاحب! زید مجدہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ رفقائے دارالمصنفین سے بذریعہ "معارف" ملاقات تو ہمیشہ رہتی تھی البتہ فروری ۱۹۹۲ء میں دارالمصنفین کی زیارت پہلی دفعہ نصیب ہوئی تھی اور رات بھر قیام بھی رہا تھا۔ اس وقت آپ حضرات نے احقر کو جس محبت و مودت سے نوازا تھا وہ اب تک یاد ہے اور ان شاء اللہ ہمیشہ یاد رہے گا بلکہ میرے لیے تو باعث افتخار ہے۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

اس مرتبہ تو صرف شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری حفظہ اللہ کی عیادت مقصود تھی لیکن اعظم گڑھ آکر دارالمصنفین نہ آنا تو ناممکن ہے کیونکہ بد شعوری سے اسکا تذکرہ حسنہ حضرت والد صاحب مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی علیہ الرحمہ سے سنتے رہے اور حقیقت ہے کہ اس احاطہ میں آکر ایک قلبی سکون اور ایک گونہ احساس اپنائیت ہوتا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ اس علمی ادارہ کو سلامت رکھے اور تادیر اس شجرۂ طیبہ کا سایہ مسلمانوں پر قائم رکھے نیز اسکے بانی اور انکے متوسلین و تلامذہ کی کوششوں کو قبول فرماکر سرمایۂ آخرت بنائے۔ آمین ثم آمین۔

والسلام مع الاکرام

دعاجو
دعاگو } احمد شاکر

۲۵ فروری ۱۹۹۲ء

مکتوب راجستھان

اودی کلاں۔ راجستھان ۲۲ مارچ ۱۹۹۲ء

مکرم و محترم مولانا اصلاحی صاحب السلام علیکم

امید ہے کہ مزاج سامی بعافیت ہوں گے۔ راجگان کے ذریعہ انہدام مساجد کا معاملہ زیادہ ملتا نہیں۔ پھر میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی راجہ کی حیثیت ایک بڑے زمیندار سے زیادہ نہیں تھی اس لیے انہیں مسلم فرمانرواؤں کے مقابلے میں نہیں لایا جاسکتا ہے البتہ ہرش وردھن تک کے سمراٹوں کو مقابلہ میں لایا تو جاسکتا ہے لیکن اس زمانہ تک مساجد یہاں نہ تھیں ان تمام سمراٹوں نے دیگر مذاہب کے معابد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی اس کے ثبوت بہت ہیں جو شبلی اکیڈمی کے لٹریچر میں بھی مع اسناد موجود ہیں۔ [illegible] میں مہاراجہ الور نے شہر الور کی تمام مساجد کو منہدم کر دیا تھا۔ جامع مسجد کی جگہ آج Hope circle کے نام سے شاندار چوراہہ بنا دیا گیا ہے۔ اب بمشکل تمام میو حضرات نے ایک مسجد، مدرسہ اور مسلم ہوسٹل کی تعمیر کی ہے۔ لیکن حیرت ہے کہ جامع مسجد بھرتپور جسے فن تعمیر کے اعتبار سے چھوٹی شاہجہانی جامع مسجد کہہ سکتے ہیں بدستور موجود ہے۔ سکھ مظالم آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ رنجیت دیو والی جموں متوفی ۱۱۹۶ھ کے عہد میں مسلمانوں پر سخت مظالم ڈھائے گئے حتیٰ کہ مسلمانوں کو اذان دینے تک کی اجازت نہ تھی چنانچہ دل محمد دلشاد پسروری مرثیہ خواں ہے:

بسکہ منعت دریں شہر اذانِ جمعہ — نکند گوش کسے نالۂ بیکاراں را

گریہ ما نیست اثر در دلِ راجہ جموں — سبزہ بر سنگ نروید چہ کنہ یاراں را

موذیاں کردہ ہجوم اے شہ دولہ فریاد — تیغ گجرات بہتر یست دل آزاراں را

(پنجاب میں اردو ص ۲۸۲ از محمود شیرانی مطبوعہ [illegible] اترپردیش اردو اکاڈمی لکھنؤ)

رانا سانگا نے ناگور میں اور ہیموں بقال نے نارنول میں مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ اورنگزیب کی وفات کے بعد راجہ اجیت سنگھ نے جودھپور کی تمام مساجد کو مسمار کر دیا تھا۔

والسلام

عبدالروف خاں

باب التقریظ والانتقاد

تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ جلد اول تا چہارم

مرتبہ جناب سید تنظیم علی نقوی شایاں بریلوی مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی چاروں جلدوں کے مجموعی صفحات ۳۴۴۴، مجموعی قیمت ایک ہزار روپیے۔ فی جلد ۲۵۰ روپیے۔

اردو شعرا کے تذکرے ہر دور میں لکھے گئے ہیں، بعض تذکرے کسی ایک جگہ اور خاص علاقوں کے شعرا کے ذکر کے لیے مخصوص ہیں، یہ تذکرہ بھی اسی نوعیت کا ہے جس میں روہیلکھنڈ کے حسب ذیل سات اضلاع کے شعرا کا تذکرہ اور ان کا نمونۂ کلام دیا گیا ہے، بدایوں[۱]، بریلی[۲]، بجنور[۳]، پیلی بھیت[۴]، رام پور[۵]، شاہجہاں پور[۶] اور مرادآباد[۷]

یہ خطہ علمی، ادبی اور لسانی حیثیت سے ممتاز رہا ہے اور یہاں بڑے بڑے اہل کمال پیدا ہوئے ہیں۔ جناب سید تنظیم علی نقوی شایاں مرحوم کا تعلق بھی اسی مردم خیز علاقہ کے ضلع بریلی کے ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا ان کو شعر و ادب کا ذوق ورثے میں ملا ہے، ملازمت کی مشغولیت کے باوجود علم و ادب سے ان کا اشتغال برابر قائم رہا جس کا ثبوت یہ ضخیم تذکرہ ہے جو مصنف کی چالیس[۴۰] برسوں کی محنت کا ثمرہ ہے، اس کی اہمیت کے لیے یہی بات کافی ہے کہ یہ تقریباً ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل اور چار ہزار دو سو نواسی[۴۲۸۹] شعرا کا تذکرہ ہے، اس طرح کا عظیم الشان کام عموماً ادارے یا اہل قلم کی ایک جماعت انجام دیتی ہے لیکن جناب شایاں مرحوم کا

عزم و ولولہ اور ان کی ہمت اور لگن قابل ستایش ہے کہ انھوں نے اسے تن تنہا انجام دیا ہے۔ ان کی اس ادبی کاوش سے آیندہ تحقیقی کام کرنے اور اس سرزمین کی ادبی تاریخ لکھنے والے بے نیاز نہیں رہ سکتے، یہ ان کے لیے حوالہ و مرجع کا کام دے گی۔ لایق مصنف نے یہ اہم اور مشقت طلب علمی خدمت انجام دے کر آج کل کے آرام طلب اور سہولت پسند مصنفین کو بہت کچھ سبق دیا ہے۔

کتابوں کی تصنیف و تالیف سے زیادہ مشکل مرحلہ ان کی طبع و اشاعت کا ہوتا ہے، جناب شایان مرحوم اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ان کے بعد یہ ادبی سرمایہ ان کے علم دوست، جواں سال و جواں ہمت خلف الرشید جناب عظیم القدر کو ورثہ میں ملا، انھوں نے اس کو شایع کر کے روہیلکھنڈ کے بشیار غیر معروف اور گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے شعرا کو نئی زندگی بخش دی اور ان کے نام نیک کو ضایع ہونے سے بچا لیا، حقیقت یہ ہے کہ اس تذکرہ کی تالیف و اشاعت اردو کے شیدائیوں اور خصوصاً اس علاقہ کی ادبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

یہ ضخیم کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے، پہلی جلد صرف بدایوں کے شعرا کے تذکرے کے لیے مخصوص ہے، دوسری جلد میں بریلی اور بجنور کے شعرا کا ذکر ہے۔ تیسری جلد میں بالترتیب پیلی بھیت، رام پور اور شاہجہاں پور کے شعرا کا حال درج ہے اور چوتھی جلد مرادآباد کے شعرا کے ذکر کے لیے خاص ہے۔

لایق مرتب نے صرف اردو شعرا ہی کے تذکرہ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ عربی اور فارسی گو شعرا کا تذکرہ بھی کیا ہے بعض شعرا نے اردو اور فارسی دونوں میں

داد سخن دی ہے، ان کے تذکرہ میں ان کی یہ خصوصیت دکھائی گئی ہے لیکن عربی و فارسی گو شعرا کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ کتاب میں ہر دور کے شعرا کا تذکرہ ہے، اس طرح متقدمین، متوسطین اور متاخرین سب ہی شعرا کا ذکر اس میں آیا ہے اور زمانہ حال کے شاعروں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے، کتاب کی ترتیب تاریخی لحاظ سے کی گئی ہے، تاکہ شاعری کے عہد بعہد ارتقا کا اندازہ ہو اور پھر جن شعرا کا تذکرہ دیا ہے ان کے تلامذہ کا ذکر بھی کیا ہے، خواہ وہ کسی خطہ اور علاقہ کے ہوں۔ اس طرح اس میں ہندوستان کی اکثر جگہوں کے شعرا کا ذکر آگیا ہے۔

فاضل مولف نے پہلی جلد کے شروع میں بطور مقدمہ پہلے باب میں روہیلکھنڈ کے تاریخی و جغرافیائی حالات بھی کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔

مقدمہ میں قدیم عہد سے روہیلوں تک اس سرزمین میں بود و باش اختیار کرنے والی قوموں کے غلبہ و تسلط کی سرگزشت تحریر کی ہے اور ان کی اہم یادگاروں اور عمارتوں کے بارے میں بھی معلومات قلمبند کیے ہیں، اس حصہ کے حواشی بھی قدر و قیمت کے حامل ہیں جن میں قدیم اور ہجری دور سے لے کر مسلمانوں کے زمانے تک ہندوستان میں آنے والی قوموں، ان کے بادشاہوں اور مختلف خاندانوں کے حکمرانوں کے بارے میں مفید اور ضروری معلومات بیان کیے ہیں، اس طرح حبشی النسل، منگول، ڈراوڑ، آریہ، آریہ ادب، بودھ، جین اور مسلمان فرمانرواؤں اور متعدد حکمراں خاندانوں کا یہ مختصر مرقع بھی ہے۔

ہر ضلع کے شعرا کا تذکرہ مکمل کرنے کے بعد ان کے ناموں اور تخلص کے لحاظ سے اشاریہ بھی دیا ہے تاکہ مراجعت میں سہولت ہو۔

مصنف نے یہ سب مواد جمع کرنے اور ہزاروں شاعروں کے حالات یکجا کرنے میں جو کدوکاوش اور محنت و عرق ریزی کی ہے اس کا اندازہ کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، ان کو ہند و پاک کے بعض نامور فضلا نے جو خراج تحسین پیش کیا ہے اور کتاب کے بارے میں جو تاثرات لکھے ہیں، ابتدا میں اس کا بھی تذکرہ ہے اس سے بھی مصنف کی محنت اور ان کے کام کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اتنی طویل و ضخیم کتاب میں خوبیوں کے باوجود اگر کمی بھی رہ گئی ہے تو اس سے اس کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی ہے۔ یہاں چند کی نشاندہی اس لیے کی جارہی ہے تاکہ آیندہ اڈیشن میں تصحیح کر لی جائے۔

۱۔ کتاب کی ابتدا ضلع بدایوں کے عربی شعرا کے ذکر سے ہوئی ہے، اس میں سب سے پہلے مشہور محدث و لغوی حسن صغانی کا تذکرہ دیا گیا ہے گویا مصنف کے نزدیک ان کا وطن بدایوں تھا جو از روئے تحقیق صحیح نہیں ہے، مشہور فاضل مولانا عبدالحلیم چشتی نے پوری تحقیق سے صغانی کے بدایونی ہونے کی پُرزور تردید کی ہے (ملاحظہ ہو معارف جلد ۱۴۴ عدد ۱) راقم نے بھی اس بے اصل و غیر محقق قول کی مدلل تردید کی ہے (دیکھئے تذکرۃ المحدثین جلد سوم ص ۴ تا ۱۳) یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

۲۔ ص ۱۹۸ و ۱۹۹ پر بدایوں کے شعرا کے ضمن میں مرزا عبدالقادر بیدل دہلوی کا تذکرہ درج ہے لیکن اس کی وجہ و مناسبت سمجھ میں نہیں آئی، بیدل سے پہلے مولانا شاہ عبدالماجد ماجد بدایونی اور ان کے دو تلامذہ عاصم و واحد بدایونی کا ذکر تھا، ان میں اول الذکر ماجد بدایونی کے چھوٹے بھائی اور موخر الذکر ان کے فرزند تھے۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے ساتھ بیدل کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے جبکہ نہ وہ خود

بدایونی ہیں اور نہ کسی بدایونی کے شاگرد ہیں، ماجد شاہ کا زمانہ مصنف کے بیان کے مطابق ۱۸۸۷ - ۱۹۳۱ء اور بیدل کا ۱۶۴۴ - ۱۷۲۲ء ہے اس لیے بیدل کے ان کے شاگرد ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بیدل کے بعد ان کے شاگرد شیخ سعد اللہ گلشن اور ان کے تلامذہ خواجہ ناصر عندلیب دہلوی اور ولی گجراتی نیز ان دونوں کے بعض غیر بدایونی تلامذہ کا تذکرہ ہے جو ظاہر ہے غیر متعلق اور بے جوڑ ہے، اسی طرح بعض اور غیر متعلق اشخاص کا تذکرہ بھی ہے۔

۳۔ ص ۲۰۴ پر ولی گجراتی کا تذکرہ ہے، ان کا نام شاہ ولی اللہ لکھا ہے، یہ درست ہے کہ بعض تذکرہ نگاروں نے ان کا یہ نام بھی لکھا ہے مگر ان کے نام کے بارے میں ارباب تذکرہ کا اختلاف ہے اور ابھی تک محققین یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ ان کا اصل نام کیا تھا اس بنا پر شایاں صاحب کو قطعیت کے ساتھ ولی کا نام شاہ ولی اللہ لکھنا درست نہیں ہو سکتا، انہیں اس کے متعلق تذکرہ نگاروں اور محققین کے اختلاف کا بھی ذکر کرنا چاہیے تھا، جس شاعر کے شاہ ولی اللہ نام ہونے پر اتفاق ہے ان کا تخلص اشتیاق تھا، یہ سرہند میں پیدا ہوئے تھے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خانوادے سے تھے، ان کی نشو و نما دہلی میں ہوئی تھی۔

۴۔ ص ۱۰۱ پر مولانا شہاب الدین مہمرہ بدایونی کا تذکرہ ہے، اس ضمن میں فخر الملک عمید تولکی کا ذکر بھی آگیا ہے، راقم کو تولکی نسبت کے سلسلہ میں یہ عرض کرنا ہے کہ اس بارے میں تذکرہ نگاروں کا بڑا اختلاف ہے لیکن اس زمانہ کے مشہور فاضل محقق پروفیسر نذیر احمد نے قطعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ عمید کی صحیح نسبت لوکی ہے جو وطن کے بجائے حسب کی طرف ہے (ملاحظہ ہو معارف جلد ۱۱۷ عدد ۳ ص ۱۸۹ و ۲۴۲)

مصنف نے عمید کا سنہ بھی تحریر کیا ہے جو یہ ہے ۱۲۵۰ء/۶۴۸ھ، اب یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ سن ولادت ہے یا وفات؟ عام اہل تذکرہ نے سن ولادت ۶۵۵ھ بتایا ہے، لیکن موجودہ محققین کے نزدیک صحیح ۶۱۰ھ ہے۔

اگر مصنف نے ۶۴۸ھ کو سن ولادت مانا ہے تو انہیں اس کی تصریح کرنی چاہیے تھی۔ آگے انھوں نے اسی انداز سے امیر خسرو کا سنہ ۱۳۲۵ء/۷۲۵ھ تحریر کیا ہے، گو انھوں نے کوئی تصریح نہیں کی ہے مگر خسرو کا سن وفات ۷۲۵ھ ہے، کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ انھوں نے ۶۴۸ھ عمید کا سن وفات دیا ہے جو درست نہیں ہو سکتا لیکن اگر وہ سن ولادت ہے تو مصنف کو سنین کے بارے میں یکسانیت کا لحاظ رکھنا چاہیے تھا یعنی یا تو ہر شخص کے سن ولادت کا ذکر کرتے یا اس کے سن وفات کا۔ بہر حال جس کا بھی ذکر کرتے اس کی صراحت کر دیتے۔

۵۔ انتخاب اور نمونۂ کلام دینے میں بھی یکسانیت ملحوظ نہیں رکھی گئی ہے، چنانچہ بعض شاعروں کا کلام متعدد صفحوں پر مشتمل ہے، لیکن بعض کا نمونۂ کلام بہت کم دیا گیا ہے، ممکن ہے بعض شعرا کا کلام زیادہ دستیاب نہ ہوا ہو لیکن بعض معروف شعرا کا کلام تو متداول ہے پھر ان کا نمونۂ کلام دینے میں کیا مانع تھا، جیسے ماہر القادری (ص ۷۹) کا تذکرہ بھی مختصر ہے اور نمونتاً صرف ایک شعر دیا ہے، جبکہ متعدد معروف اور بعض غیر معروف شعرا کا کلام کئی صفحوں میں درج ہے، اس طرح کی کتابوں میں اولاً تو یکسانیت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ثانیاً کلام کا نمونہ کم سے کم دینا چاہیے تاکہ کتاب زیادہ ضخیم نہ ہو جائے۔

۶۔ شعرا کا تذکرہ قلم بند کرنے میں بھی اس اصول کو نظر انداز کر دیا ہے چنانچہ اکثر شعرا کا تذکرہ بہت مختصر ہے بلکہ بعض کا تو صرف نام اور تخلص لکھ دینے پر اکتفا کیا ہے، تلاش و تفحص کے بعد بھی جن شعرا کے حالات نہیں ملے ان کے بارے میں کم از کم اس کی وضاحت ہی کر دینی چاہیے تھی، ہمارے خیال میں اگر مزید کد و کاوش سے کام لیا جاتا تو چاہے ہر ایک کے نہ سہی لیکن اکثر کے بقدر ضرورت حالات مہیا ہو سکتے تھے، اگر آیندہ اڈیشن میں مصنف کے لائق فرزند اس کمی کو پوری کر دیں تو کتاب کی عظمت دو چند ہو جائے گی، بعض شعرا کا صرف تخلص درج ہے اور ان کے کسی قدر حالات اور نمونہ کلام بھی دیا ہے لیکن نہ ان کا نام لکھا ہے اور نہ ان کے سنین ولادت و وفات کا ذکر ہے (یہ کمی اکثر نظر آئی) جیسے گو ہری بدایونی (ص ۱۳۰) بہت سے معروف شعرا کا تذکرہ کئی صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، حالانکہ معروف شعرا کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے اس لیے ان کا مفصل تذکرہ قلم بند کر کے کتاب کی ضخامت بڑھانے سے کیا فائدہ؟

۷۔ کتاب میں عربی شعرا کا ذکر تو محض برائے نام ہے تاہم جن دو چار کا ذکر ہے، اردو اور فارسی شعرا کی طرح ان کے کلام کا نمونہ بھی پیش کیا جانا چاہیے تھا۔

۸۔ کتاب کی ترتیب بھی زیادہ ڈھنگ اور مناسب انداز سے نہیں کی گئی ہے، ترتیب کی ناہمواری قارئین کی الجھن کا باعث ہو گئی ہے، اسے بہتر بنانے کے لیے ضروری تھا کہ ہر شاعر کا تذکرہ الگ صفحے سے کیا جاتا اور اس کا نام سطر درمیان میں جلی لکھا جاتا پھر ذیلی عنوان کے تحت بقدر ضرورت اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس کے مختصر حالات اور کمالات تحریر کر کے دوسرے ذیلی عنوان

کے تحت نمونۂ کلام دیا جاتا۔ اس کے بعد تلامذہ کا بھی عنوان قائم کرکے نمبر وار ان کے حالات دو چار سطروں میں لکھ کر دو چار اشعار نموتاً پیش کر دیتے۔

۹۔ تحریر میں بھی ناہمواری اور ژولیدہ بیانی ہے، اس کو ماقل و مادل اور حشو و زوائد سے پاک ہونا چاہیے تھا جس کی ایک پختہ مشق اہل قلم سے توقع تھی ایک جگہ تحقیق کو مذکر لکھا ہے (حاشیہ ص۲)

۱۰۔ انتخاب اور نمونۂ کلام بھی زیادہ معیاری نہیں ہے، عموماً رطب ویابس ہر طرح کا کلام جمع کر دیا گیا ہے۔

۱۱۔ سرورق اور اس کے بعد کے اندرونی صفحہ پر جہاں کتاب کا نام لکھا ہے وہاں جلدوں کی صراحت کے ساتھ اس کو بھی تحریر ہونا چاہیے تھا کہ اس جلد میں کس جگہ کے شعرا کا تذکرہ ہے۔

۱۲۔ مصنف نے جا بجا مراجع و مصادر کا ذکر کیا ہے لیکن اس کا مکمل اہتمام نہیں کیا ہے، اس لیے بہت سی جگہوں پر حوالے درج نہیں ہیں، کتاب کے استناد کے لیے حوالے دیے جانے کا اہتمام ضروری تھا۔

ہمارا مقصد خوردہ گیری نہیں ہے، اس بنا پر مزید فروگذاشتوں سے قطع نظر کرتے اور اس کی درخواست کرتے ہیں کہ دوسری اشاعت میں ان کی تصحیح کر لی جائے۔

مطبوعات جدیدہ

الفرقان خصوصی اشاعت بیادگار حضرت مولانا مفتی نسیم احمد فریدی مرحوم مرتبہ جناب خلیل الرحمٰن سجاد ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ کتابت وطباعت، صفحات ۲۰۸، قیمت ۲۵ روپیے، پتہ : ماہنامہ الفرقان، نظیرآباد لکھنؤ۔

اردو کا ممتاز دینی مجلہ الفرقان تقریباً نصف صدی سے اپنے اصلاحی و مذہبی مضامین کے ذریعہ دین کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے، اس پورے عرصہ میں اسے ہندوستان کے اچھے اہل علم و قلم کا تعاون حاصل رہا، ان میں مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم کا نام نمایاں ہے، اس خاص نمبر میں مولانا مرحوم کے حالات و سوانح کا مرقع پیش کیا گیا ہے مولانا نے الفرقان کے مضامین میں حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی اور اکابر علمائے دیوبند کے حالات و افکار کی اشاعت کو اپنا خاص موضوع بنایا تھا، ان کی تحریروں میں جذبۂ باطن اور سوز دروں کی وجہ سے خاص حلاوت و جاذبیت اور تاثیر ہوتی ہے، ان کی ذاتی زندگی سادگی، تواضع اور منکسرالمزاجی کا نمونہ تھی، زیر نظر اشاعت میں مولانا کی سیرت و شخصیت کے ان مختلف پہلوؤں کو مختلف ممتاز اہل علم و قلم نے نمایاں کیا ہے، قطب الدین ملا نے مولانا مرحوم کے الفرقان میں شایع شدہ تمام مقالات کا اشاریہ مرتب کیا ہے، مولانا مرحوم کا ایک مضمون بھی درج ہے جو مولانا ابوالحسن زید دہلوی کی تصنیف "مولانا اسمٰعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان" پر مفصل تبصرہ ہے، ماہنامہ الفرقان نے یہ خاص نمبر شایع کرکے اپنے ایک بے لوث محسن کی قدرشناسی کا حق ادا کر دیا ہے۔

سوانح حضرت مولانا سید شاہ محمد امان اللہ قادری پھلواروی

از جناب ہلال احمد قادری پھلواروی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، خوبصورت کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۰۵، قیمت چالیس روپیے، پتہ: دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ علم و عمل اور رشد و ہدایت کا ایک مشہور مرکز ہے اس خانقاہ کے ارباب عرفان شاہ بدرالدینؒ، شاہ محی الدینؒ، شاہ قمرالدینؒ اور شاہ محمد نظام الدینؒ وغیرہ اپنی مذہبی، تبلیغی، ملی اور قومی خدمات کے لیے پورے ملک میں مشہور تھے، چند برس پہلے اس کے سجادہ نشین مولانا شاہ محمد امان اللہ قادریؒ کا انتقال ہوا تھا، زیر نظر کتاب میں ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ ان کے اخلاق اور سیرت و شخصیت کے پُر کیف واقعات جمع کیے گئے ہیں اور ان کی قومی و ملی خدمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے، مصنف ابھی نو عمر ہیں لیکن کتاب سے ان کے سلیقہ اور اچھے ذوق کا پتہ چلتا ہے، ایک حصہ میں صاحب تذکرہ کی بعض تحریروں کو جمع کر دیا گیا ہے، تعزیتی خطوط اور تحریروں کے علاوہ مولانا عبداللہ عباس ندوی کے شگفتہ قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے۔

وفیات مشاہیر پاکستان

از جناب پروفیسر محمد اسلم، متوسط تقطیع بہترین کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد صفحات ۳۲۱، قیمت ۱۰۰ روپیے، پتہ: مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، پاکستان۔

قدماء کے دور سے اب تک وفیات نگاری کا سلسلہ برابر جاری ہے زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، کئی برس سے فاضل مرتب نے قبروں اور مزاروں

کے الواح و کتبات کی مدد سے وفیات نویسی کا جو دلچسپ اور منفرد کام شروع کیا تھا اسکو
علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کا مجموعہ ہے اس میں انھوں نے
۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے ۱۴ اگست ۱۹۸۰ء تک وفات پانے والے پاکستانی مشاہیر کا احاطہ کیا ہے
انکا تعلق علم و ادب، فنون لطیفہ، سیاست یا اور کسی شعبۂ زندگی سے تھا، الواح مزار کے
علاوہ اخبار و رسائل اور دوسرے مستند حوالوں کی مدد سے جامع اختصار کے ساتھ انھوں نے
یہ جدید وفیات الاعیان مرتب کی ہے، حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے متعلق معلومات اسطرح
دیے گئے ہیں' سلیمان ندوی' علامۂ سید' مصنف سیرۃ النبی' مدیر ماہنامہ معارف اعظم گڈھ
ولادت ۱۸۸۴-۱۱-۲۲ دیسنہ (بہار) وفات ۱۹۵۳-۱۱-۲۲ اسلامیہ کالج، کراچی
(تذکرہ سلیمان مصنفہ غلام محمد) اس سے کتاب کی نوعیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے۔

اردو میں ادب اطفال ایک جائزہ ازجناب پروفیسر اکبر رحمانی، متوسط تقطیع
عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۱۶، قیمت ۳۵ روپئے پتہ:
ایجوکیشنل اکادمی' اسلام پورہ، جلگاؤں، مہاراشٹر۔

بچوں کی تعلیم و تربیت' انکے ذہن و مزاج کی تشکیل، انکی تدریس کے نفسیاتی اصول اور انکا
ادب' فاضل مولف کا خاص اور پسندیدہ موضوع ہے جس پر وہ اپنے علم و مطالعہ کے قیمتی تجربات
و احساسات کو اپنے رسالہ آموز گار میں برابر پیش کرتے رہتے ہیں، کچھ عرصہ پہلے انھوں نے آموزگار
کا ادب اطفال نمبر شائع کیا تھا، اب اس نمبر کو مزید فائدے کیلئے کتابی صورت میں شائع کیا ہے جو
پروفیسر ظ انصاری' پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر معین الدین، میرزا ادیب، ڈاکٹر اسد اریب
اور سعی بریمی وغیرہ اہل قلم کی تحریروں کا مجموعہ ہے، اس میں ادب اطفال کے فروغ اور اس راہ کی
مشکلات و مسائل کو دور کرنے کی مفید تدبیریں بتائی گئی ہیں خود فاضل مرتب نے اردو میں
بچوں کے ادب کا سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیا ہے یہ کتاب اردو کے تعلیمی حلقوں میں پذیرائی و قدردانی کی مستحق ہے۔
(ع۔ ص)

جلد ۱۵۰ ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ جون ۱۹۹۲ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

آہ! فرزند حبیب شبلی

قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل

نواب الحاج مولوی عبید الرحمن خان شروانی کئی برس سے علیل تھے۔ ان کی زندگی کے معمولات میں فرق آگیا تھا، کمیٹیوں میں شرکت کے لیے سفر سے معذور ہو گئے تھے۔ بڑھاپے اور عمر طبعی کو پہونچ جانے کی وجہ سے ضعف و نقاہت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ راقم کو گذشتہ سال دو بار عیادت و زیارت کی سعادت میسر آئی تھی۔ اور دونوں دفعہ بڑھتی ہوئی کمزوری اور معذوری کو دیکھ کر خیال ہوا تھا کہ یہ چراغِ سحر بجھا ہی چاہتا ہے۔ بالآخر ۸ مئی کو صاحبزادہ والا تبار پروفیسر ریاض الرحمن خان شروانی کے تار سے یہ المناک خبر آہی گئی جس نے پھر اس ارشاد ربانی کی ایک بار تصدیق و توثیق کردی کہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ

دارالمصنفین کی بنا و تاسیس میں علامہ شبلیؒ اور ان کے متعدد اعزہ کی طرح نواب مولوی عبید الرحمن خان شروانی کے خاندان کا بھی بڑا حصہ تھا۔ ان کے والد ماجد نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم علامہ شبلی کے حبیب لبیب تھے۔ جب علامہ کے دل و دماغ پر دارالمصنفین ہی کا خیال چھایا رہتا تھا تو اس کے متعلق سب سے زیادہ انھی سے مراسلت و مکاتبت رہتی تھی۔ علامہ شبلی کی وفات کے بعد یہی ربط و تعلق دارالمصنفین کی جانب منتقل ہو گیا

تھا جس کے مدۃ العمر وہ رکن رکین اور صدر نشین رہے، دار المصنفین کے پہلے صدر نشین مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ہوئے، مولانا حمید الدین فراہی کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۴۹ھ میں وہی اس کی مجلس ارکان کے بھی صدر بنے، دوسروں سے علامہ کے تعلقات میں آتار چڑھاؤ ہوتا رہا لیکن ایک نواب صدر یار جنگ ہی کی ایسی ذات تھی جن سے عمر بھر اخلاص و مودت میں کمی نہیں آئی، ایک دفعہ مولوی عبید الرحمٰن خاں شروانی نے فرمایا تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مولانا شبلی مرحوم سے میرے والد مرحوم کے کتنے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے گویا متمم بن نویرہ کے بقول :-

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ　　　من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

علی گڑھ کا ممتاز و معزز شروانی خاندان بہلول خاں لودی کے دور میں ہندوستان آیا اور سپہ سالاری کے منصب پر فائز ہوا، اسی زمانہ میں اس خاندان کے دو اشخاص علی گڑھ میں آباد ہوئے جنکی اولاد مدت تک زمیندار رہی، درمیان میں جاٹ گردی کیوجہ سے زمینداری چھوڑ کر جلا وطن رہنا پڑا لیکن کچھ عرصہ بعد اسی خاندان کے ایک بزرگ باز خانصاحب اپنی آبائی ریاست پر قبضہ کر کے بھیکم پور میں آباد ہوئے، انکو بڑا عروج نصیب ہوا، انکے پیر و مرشد نے انہیں دوبارہ بھیکم پور میں متوطن ہونے کا حکم دیا، انکے ایک بیٹے خاں زماں صاحب کے بیٹے محمد تقی خانصاحب مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے والد بزرگوار تھے، باپ نے بیٹے کے نام پر حبیب گنج کو آباد کیا جو بھیکم پور سے کچھ فاصلہ پر واقع ہے، یہیں ربیع الاول سنہ ۱۲۹۵ھ مطابق اگست ۱۸۷۸ء میں نواب عبید الرحمٰن خاں شروانی پیدا ہوئے جو نواب صدر یار جنگ کے خلف الرشید تھے۔ وکفی بہ فخرا۔

نواب عبید الرحمٰن خاں شروانی حصول تعلیم کے لیے مدرستہ العلوم کے اسکول میں داخل ہوئے اور [illegible]ء میں عربک کالج دہلی سے انٹرنس پاس کیا [illegible]ء میں ایف اے میں علی گڑھ میں داخلہ لیا مگر والد ماجد کے حیدرآباد تشریف لیجانے کی وجہ سے ریاست اور خاندان کی ذمہ داری انہیں سنبھالنی پڑی اس لیے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا، عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی ان کو گوناگوں ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑا کئی برس تک آنریری اسپیشل مجسٹریٹ رہے، ۲۳ء میں صوبے کی آئین ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور پھر مسلسل ممبر منتخب ہوتے رہے ۴۵ء میں پہلی دفعہ انہیں الکشن میں مقابلہ کرنا پڑا تو مخالف امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہوگئیں، ان سے زیادہ طویل عرصے تک شاید ہی کوئی اسمبلی کا ممبر رہا ہو، ان کی قومی خدمات کی بنا پر ۱۹۲۸ء میں حکومت نے انہیں خاں بہادر کا خطاب دیا، مسلم لیگ کی آل انڈیا ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے اور صوبہ کی زمیندار ایسوسی ایشن کے نائب صدر اور علی گڑھ کی زمیندار اسمبلی کے صدر چنے گئے، صوبہ کے بورڈ آف اگریکلچر کی پلاننگ کمیٹی اور پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے ممبر اور صدر مقرر ہوئے چھ سال تک انٹرمیڈیٹ اور ہائی اسکول کے تعلیمی بورڈ کے اور تین سال تک یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے ممبر رہے۔

شروانی صاحب کی دلچسپی اور سرگرمی کا خاص محور مسلم یونیورسٹی تھی جس سے ان کا ذمہ دارانہ تعلق ۱۸ء ہی میں قائم ہوگیا تھا جو اب وفات کے بعد جاکر ختم ہوا ہے، پہلے وہ اس کے فاونڈیشن کمیشن کے رکن ہوئے، ۳۲ء میں کورٹ اور ایگزیکیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے چار بار وائس چانسلر اور تین بار خازن مقرر ہوئے، ۴۸ء سے اب تک انھوں نے پرو چانسلر کے عہدے کو زینت بخشی، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے بھی وہ برابر وابستہ رہے، اس کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر اور خازن رہے، کانفرنس کے کئی جلسوں کی استقبالیہ کمیٹی کے

صدر ہوئے، ۱۹۴۹ء میں اپنے والد مرحوم کی جگہ اس کے سکریٹری مقرر ہوئے، چند برس تک
ان کی ادارت میں کانفرنس گزٹ شایع ہوتا رہا، یونیورسٹی سے کبھی انھوں نے ایک حبہ کا
بھی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اس کے لیے ہمیشہ اپنی دولت، محنت، وقت اور قابلیت کی
قربانی دی، ۱۹۵۳ء میں وہ یونیورسٹی کے خازن ہوئے، اس وقت اس عہدہ کی تنخواہ
پانچ سو روپیہ ماہوار تھی مگر انھوں نے یہ کام حسبۃً للہ انجام دیا۔

مرحوم کو یونیورسٹی سے غیر معمولی جذباتی لگاؤ تھا، وہ اس کو ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے
بڑا سرمایہ اور قیمتی متاع سمجھتے تھے، ان کے خیال میں یونیورسٹی نے مسلمانوں میں تعلیم کو فروغ
دیکر ملک میں انکے وزن و وقار میں اضافہ کیا ہے، وہ فرماتے تھے کہ اس کے لیے سرسید
علیہ الرحمہ کو بہت کچھ طعن و تشنیع سننا پڑی، یہاں تک کہ انکی تکفیر بھی کی گئی لیکن آج انہی لوگوں
کی نسلیں اس سے فائدہ اٹھا رہی ہیں، یونیورسٹی سے ان کو ایسا عشق تھا کہ اس پر جب بھی
کوئی آنچ آئی تو وہ بیقرار ہو گئے، اس کو مجروح کرنے کی جو کوشش و سازش کی گئی اُسے وہ ناکام
بنانے میں لگ گئے، یہاں شر پسند لوگ کوئی فتنہ و ہنگامہ برپا کرتے تو وہ کرب و اذیت میں
مبتلا ہو جاتے، جب اس کا اقلیتی کردار ختم کیا گیا تو اس کو بحال کرنیکی مہم میں پیش پیش رہے۔

علی گڑھ کے بعد ان کو دار المصنفین اور دار العلوم ندوۃ العلماء سے خاص لگاؤ تھا، دونوں کے
رکن رکین تھے اور بڑی پابندی سے ان کے جلسوں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے تھے، وہ
دار المصنفین کی متعدد کمیٹیوں کے ممبر تھے اور اسے اپنے تجربات اور بزرگانہ مشوروں سے
پورا فائدہ پہنچاتے، ان کی رائے کا بڑا وزن محسوس کیا جاتا تھا، کبرسنی کی وجہ سے جب یہاں
آنے میں ان کو دشواری ہونے لگی تو ان کی سہولت کے خیال سے جناب سید صباح الدین
عبد الرحمن صاحب لکھنؤ اور دہلی میں جلسے کرتے اور کبھی کبھی ان کو لینے کے لیے آدمی بھی بھیجتے

دارالمصنفین سے ان کو ایسا والہانہ تعلق تھا کہ جب بھی ملاقات ہوتی تو یہاں کے ایک ایک شخص کی خیریت دریافت کرتے اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں واقفیت حاصل کرتے، اگر اس کے بارے میں کوئی ناخوشگوار بات سنتے تو بہت بے چین ہو جاتے، ادھر اس کی ایک تشویشناک بات سے بہت پریشان اور متردد رہتے تھے، دارالمصنفین کے لیے ان کا وجود بڑا سہارا تھا افسوس اب وہ ختم ہو گیا اور دارالمصنفین اپنے ایک بہت مخلص ہوا خواہ سے محروم ہو گیا، مولانا شبلیؒ سے فرط تعلق کی بنا پر شبلی کالج کو بھی بہت عزیز رکھتے تھے، انہیں مسلمانوں کے تمام اداروں سے ہمدردی تھی اور وہ سب کی مدد بھی کرتے تھے، دارالعلوم دیوبند، اسلامیہ کالج اٹاوہ، مزمل اسلامیہ انٹر کالج سکندرہ راؤ اور جامعہ اردو علی گڑھ وغیرہ سے ان کا باضابطہ تعلق تھا۔

مرحوم صوم و صلوٰۃ اور اوراد و وظائف کے پابند اور بخیر شخص تھے، سفر میں بھی تلاوت قرآن شب بیداری اور سحر خیزی کے معمول میں فرق نہ آنے دیتے، جوانی ہی میں حج و زیارت کی سعادت حاصل کر چکے تھے، تدین، تقویٰ اور دینی غیرت و حمیت ان میں بدرجہ اتم تھی، اخلاص بے لوثی ہمدردی، دردمندی، شفقت و مروت، نرمی و ملاطفت، عفو و حلم، ضبط و تحمل، خوش خلقی، مہمان نوازی تواضع اور انکسار ان کی سرشت میں داخل تھا، تہذیب و شرافت، سنجیدگی و شائستگی، متانت و وقار، وضعداری، رکھ رکھاؤ اور سیرت کی پختگی واستواری کا مجسم نمونہ تھے، بڑے مرتب، ہر کام میں اعتدال پسند، نہایت چاق و چوبند اور وقت کے بہت پابند تھے، بے سلیقگی اور نظم و ضبط کی خلاف ورزی کو پسند نہیں کرتے تھے، وہ رئیس تھے اور امارت و تنعم میں ان کی پرورش ہوئی تھی لیکن رعونت نخوت، تمکنت اور گھمنڈ کا شائبہ بھی ان میں نہ تھا اور کسی کو اپنی ریاست و امارت کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے، فروتنی کا یہ حال تھا کہ اپنے ملازمین اور صاحبزادگان کو بھی آپ کہکر

مخاطب کرتے تھے، طبیعت میں بڑی خودداری اور استغنا تھا، مال و جاہ کی ہوس کبھی دامنگیر نہیں ہوئی، خودنمائی، خودستائی اور شہرت و نمود سے نفرت تھی، گھر پر خدمت گزاروں کی کمی نہیں تھی لیکن اپنا ضروری کام خود ہی کر لیتے تھے، اپنے خوردوں کو بھی اپنی خدمت کا موقع نہیں دیتے تھے، بڑھاپے اور معذوری کے باوجود کسی سے کام لینا گوارا نہیں تھا، ہر طبقہ کے لوگ ان سے ملنے آتے تھے اور سب سے بشاشت سے ملتے اور یکساں انداز سے پیش آتے نہ کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر اس کی ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے اور نہ کسی کو چھوٹا سمجھ کر اس کی تحقیر اور دلآزاری کرتے، بڑے معاملہ فہم تھے، بہت جلد ہر مسئلہ کی گہرائی میں پہنچ جاتے اور اس کا حل ڈھونڈھ لیتے، نہایت مردم شناس تھے کوئی شخص ان کو دھوکا دے کر نہ ان سے غلط کام لے سکتا تھا اور نہ ناجائز سفارش کرا سکتا تھا، وہ خود بھی علی گڑھ یونیورسٹی کے معزز عہدوں پر متمکن رہے لیکن اپنے اعزہ اور خاص متعلقین کو بھی ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا، کسی نظام میں خلل انداز ہونا اور کسی شخص پر غلط دباؤ ڈالنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔

شروانی صاحب نے اپنی خاندانی روایات کو قائم رکھنے اور اپنے والد مرحوم کے متروکات کو ان کی اصلی حالت میں باقی رکھنے کے لیے سعی بلیغ کی اور حسن تدبیر سے اپنی زمین جائداد اور مکانات کو بھی بچایا، ان میں بھی اپنے والد ہی کی طرح ایسی صحیح مذہبیت اور راسخ العقیدگی تھی جس میں تعصب اور نفرت کا شائبہ نہ تھا، ان کو بھی مختلف الجہات اور متضاد خیالات رکھنے والے افراد سے تعلقات کو نبھانے کا اچھا سلیقہ تھا، جس سے جس نوعیت کا تعلق قائم ہو جاتا وہ پتھر کی لکیر بن جاتا، اختلاف خیال اور اختلاف مذاق سے ہرگز اس میں کمزوری نہ پیدا ہونے دیتے، صبح کی تفریح میں جہاں جانے اور بیٹھنے کا معمول

بن جاتا اس کو بخشگی سے قائم رکھتے، مرحوم اعظم گڈھ تشریف لاتے تو صبح کی ڈاک کے بعد میری قیام گاہ پر تشریف لاکر ہلکا ناشتہ اور چائے پیتے، وہ جب بھی اعظم گڈھ آئے تو اس معمول کے مطابق انھوں نے میری عزت افزائی فرمائی، دراصل وہ اپنے والد مرحوم کی سیرت و اخلاق کی تمام خوبیوں اور کمالات کی جیتی جاگتی تصویر اور الولد سر لابیہ کی مکمل مثال تھے، میں علی گڑھ جاکر اگر کبھی ان کے دولت کدہ پر قیام نہ کرتا تو ان کو تکلیف ہوتی جس کو کبھی کبھی ظاہر بھی کر دیتے، افسوس اب وضعداری، شرافت، تہذیب اور شائستگی کا یہ نمونہ بھی دیکھنے کو نہیں ملے گا، بار الہا تو نے اپنے اس نیک بندے کو دنیا میں جو عزت و مقبولیت بخشی تھی، عالم آخرت میں بھی اسے وہی اعزاز و کامرانی بخش اور اس کی نیکیوں کے بدلے میں اسے جنت نعیم عطا فرما آمین برحمتک یا ارحم الراحمین۔

انشاء اللہ ان سطور کی اشاعت کے وقت راقم اس مقدس سرزمین پر ہوگا جس کی زیارت کی تمنا ہر مسلمان کو بدو شعور ہی سے ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے اپنے خاص فضل و کرم سے اس کا سامان کر دیا، اس نے میرے جن دوستوں اور کرم فرماؤں کو اس کا وسیلہ بنایا ان سب کو جزائے خیر دے۔

افسوس ۲۳ مئی کو شبلی کالج کے سابق استاد جناب محمد مجید زبیری کا علی گڑھ میں انتقال ہو گیا، ریٹائر ہونے کے بعد وہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کے اصرار پر دارالمصنفین کے شعبۂ انصرام سے وابستہ ہوئے، اپنی نیکی، بھلمنساہت، صلح پسند طبیعت اور ایمانداری و دینداری کی وجہ سے ہر طبقہ میں مقبول و محترم تھے، صحافی و شاعر بھی تھے تقریباً دو سال قبل سخت بیمار ہوئے، علاج کے لیے اپنی صاحبزادی کے پاس علی گڑھ چلے گئے اور وہیں سے سفر آخرت اختیار کیا، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور پس ماندگان کو صبر

مقالات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں

مدینہ کے یہود

از مولوی بلال عبد الحی حسنی ندوی صاحب

(۲)

تعلیمی وثقافتی حالت بلاد عرب کے یہود کی زبان عربی تھی لیکن اس میں کسی حد تک عبرانی کی بھی آمیزش ہو گئی تھی اس لیے کہ انھوں نے عبرانی زبان کا استعمال پوری طرح ترک نہیں کیا تھا بلکہ عبادات اور دینی اصطلاحات میں وہ عبرانی ہی کو استعمال کرتے تھے[1] عربوں کے نزدیک وہ علمی و تعلیمی حیثیت سے ممتاز تھے اور باوجودیکہ یہود سے اوس وخزرج کی مستقل کشمکش رہتی تھی تاہم انہیں بھی یہود کے علم و فضل اور دینی واقفیت کا اعتراف تھا۔

یہود کے مختلف تعلیمی مراکز بھی قائم تھے جہاں ان کے دینی و دنیوی امور اور شرعی احکام کی تعلیم کے علاوہ ان کے انبیاء کے حالات و تاریخ پڑھنے اور پڑھانے کا اہتمام کیا جاتا تھا، یہ مراکز مدارس کے نام سے موسوم کیے جاتے تھے جو صرف درس و تعلیم ہی کے لیے مخصوص نہیں ہوتے تھے بلکہ ان میں اجتماعی و سیاسی امور

---

[1] مکہ والمدینہ فی الجاهلیۃ وعهد الرسول ص۲۰۳۔

و مسائل کے بارے میں بھی مشورے ہوتے تھے یہ مراکز علمائے یہود کے زیر نگرانی اپنی خدمات انجام دیتے تھے جن میں اہم نام عبداللہ بن سلام کا تھا جن کو بعد میں اللہ نے نعمت اسلام سے مشرف فرمایا۔ دوسرا نام عبداللہ بن صوریا کا لیا جاتا ہے جن سے زیادہ بڑا عالم اور توراۃ میں درک رکھنے والا ان کے زمانہ میں کوئی دوسرا شخص نہیں تھا[1] علامہ ابن اسحاق فرماتے ہیں لم یکن فی زمانہ اعلم بالتوراۃ منہ[2]

بعض صحیح احادیث میں بھی ان مراکز کا ذکر اور اس کا ثبوت موجود ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان میں تبلیغ و دعوت کی غرض سے تشریف لے جایا کرتے تھے، صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

بینما نحن فی المسجد اذ	اس اثنا میں کہ ہم لوگ مسجد میں تھے
خرج علینا رسول اللہ	کہ ہمارے پاس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
صلی اللہ علیہ وسلم فقال	تشریف لائے اور فرمایا کہ یہود کے
انطلقوا الی یہود فخرجنا	پاس چلو چنانچہ ہم لوگ آپ کے ساتھ
معہ حتی جئنا بیت المدارس	گئے یہانتک کہ مدارس میں پہنچے، وہاں
فقام النبی صلی اللہ علیہ وسلم	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود کو پکار کر
فناداھم، یا معشر الیہود	فرمایا کہ اے یہودی لوگو! اسلام لاؤ
اسلموا تسلموا فقالوا قد	تو تم سلامت رہوگے، یہود نے کہا ابوالقاسم
بلغت یا ابا القاسم فقال	آپ نے پیغام پہنچا دیا آپ نے فرمایا ہاں

---

[1] بنو اسرائیل فی القرآن والسنۃ ص ۸۰ [2] الروض الانف ج ۲ ص ۲۴۔

ذلك اريد ثم قالها الثانية　　　میرا یہی مقصد تھا، پھر آپ نے دوبارہ

فقالوا قد بلغت يا ابا القاسم　　　یہی فرمایا تو انھوں نے کہا ابو القاسم

ثم قال (النبي صلى الله عليه وسلم)　　　آپ نے پیغام پہنچا دیا پھر آپ نے تیسری

في الثالثة، اعلموا ان الارض　　　مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ جان لو کہ زمین اللہ

لله ولرسوله واني اريد　　　اور اس کے رسول کی ہے اور میں تم لوگوں

ان اجليكم فمن وجد منكم　　　کو جلا وطن کرنا چاہتا ہوں تو تم سے جس کا

بماله شيئاً فليبعه والا فا　　　کوئی مال ہو اس کو اسے بیچ دینا چاہیے

علموا ان الارض لله ولرسوله[1]　　　ورنہ یہ جان لو کہ زمین اللہ اور اسکے

رسول کی ہے۔

آپؐ کی اقتدا میں بعض صحابہ کرام بھی ان مرکزوں میں دعوت دین کے لیے تشریف لے جاتے تھے چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ وہاں جاکر ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی دعوت دیتے اور لوگوں کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے۔

سیاسی و اجتماعی صورتحال اوس و خزرج سے شکست کے بعد یہود اپنی مخصوص بستیوں میں رہتے تھے جن میں قلعے اور مستحکم عمارتیں بنی ہوئی تھیں انھوں نے امرائے مدینہ سے معاہدے کیے اور رؤسائے عرب کو اپنا حلیف بنایا۔ ان کے تینوں بڑے مشہور قبائل بنو قینقاع، بنو قریظہ اور بنو نضیر میں ان بن رہتی تھی جو بڑھ کر جنگ وجدال کی صورت بھی اختیار کرلیتی تھی ڈاکٹر ولفنسن لکھتا ہے:

---

[1] صحیح البخاری باب فی بیع المکرہ ..... من کتاب الاکراہ۔

" بنی قینقاع اور دوسرے یہودیوں میں چلی آرہی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ وہ قبیلۂ خزرج کے ساتھ یوم بعاث میں شریک تھے، بنی نضیر و بنی قریظہ نے بڑی شدت سے کشت و خون کرکے ان کا شیرازہ منتشر کر دیا تھا حالانکہ انھوں نے گرفتار ہونے والے تمام یہود کا فدیہ بھی ادا کر دیا تھا یوم بعاث کے بعد ہی سے یہودی قبائل میں نزاع کی بنا پر جب بنو قینقاع اور انصار کے درمیان جنگ ہوئی تو ان کا کسی یہودی نے ساتھ نہیں دیا۔"[1]

قرآن مجید میں بھی یہود کی اس باہمی عداوات اور خانہ جنگی کا ذکر موجود ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا	اور جب لیا ہم نے اقرار تمھارا نہ
تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا	کروگے خون آپس میں اور نہ نکال
تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ	دوگے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر تم
دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ	نے اقرار کیا اور تم مانتے ہو، پھر تم
تَشْهَدُوْنَ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ	ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں
تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ	اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ
فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ	کو ان کے وطن سے چڑھائی کرتے ہو
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ	ان پر گناہ سے اور ظلم سے اور اگر وہی
وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ	آویں تمھارے پاس کسی کی قید میں پڑے
اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ	تو ان کی چھڑوائی دیتے ہو اور وہ بھی
مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (بقرہ ۸۵)	حرام ہے تم پر ان کا نکال دینا۔

---

[1] مجوالہ الیہود فی بلاد العرب۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت کے مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر علمائے یہود ہیں[1] آیات بالا سے قبل ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ (بقرہ ۸۳) کہا گیا ہے علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہاں سے خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاصر یہود سے ہو گیا ہے[2]

مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادیؒ اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

"یہود کے جو قبیلے عہد نبویؐ میں مدینہ اور جوار مدینہ میں آباد تھے ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ باہمی خانہ جنگیوں میں مصروف رہا کرتے تھے، مشرکین مدینہ دو بڑی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے ایک اتحاد اوس کا تھا دوسرا خزرج کا، اسرائیلیوں کے بھی بڑے قبیلے بنی نضیر و بنی قریظہ وغیرہ ایسا ہی کرتے کہ ان میں سے ایک مشرکین کے ایک جتھے کے ساتھ ہو جاتا اور دوسرا دوسری پارٹی کے ساتھ اور پھر جنگ جب شروع ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ وہ سب کچھ ہوتا جو جنگ میں ہوا کرتا ہے۔ جلا وطنی، اسرائیلی کا قتل اسرائیلی کے ہاتھ سے وغیرہ، اس آیت میں عہد نبویؐ کے معاصر اسرائیلیوں کی یہی خصوصیات بے نقاب کی جارہی ہیں"[3]

یہ بات بھی واضح رہے کہ قبائل اوس و خزرج میں انتشار پیدا کرنے والے یہی یہود تھے جو خود ان کی باہمی خانہ جنگی کا سبب بن گیا تھا تاہم وہ یہ بات خوب جانتے تھے کہ ان قبائل کا اتحاد ان کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہیں اور اس سے انکے معاشی استحکام کو بڑا خطرہ لاحق ہوگا اس لیے وہ اس فکر میں رہتے کہ ان میں اتحاد

---

[1] تفسیر کبیر ج ۳ ص ۱۷۰ [2] ایضاً [3] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۱۵۲

نہ ہو سکے لیکن جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ نے ان کو ملا دیا تو وہ انکے اتحاد کو پارہ پارہ کر دینے کے لیے ہر دم تگ و دو کیا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ اسلام لانے کے بعد اوس و خزرج کے چند اشخاص آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ ایک معمر یہودی وہاں سے گذرا اس کو ان کا یہ میل ملاپ بالکل نہ بھایا اور اس نے انکے درمیان بیٹھ کر ان کو برانگیختہ کرنے کے لیے جنگ بعاث کا ذکر چھیڑ دیا جس سے وہ لوگ برافروختہ ہو گئے لیکن اچانک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لائے اور معاملہ رفع دفع ہو گیا، اس طرح کے اور بھی متعدد واقعات ہیں جن سے یہود کے سازشی اور فتنہ پرور ذہن کا اندازہ ہوتا ہے کہ باہمی جنگ و جدال کے باوجود انہیں دوسروں کا اتحاد کسی طرح گوارا نہیں تھا۔

یہود کی شریعت انکی عبادات و معاملات اور تورات میں ان کی تحریفات

یہود صاحب شریعت تھے اور عبادات و معاملات میں اسی کی پابندی کرتے تھے لیکن ان کی شریعت کا بعض حصہ تو تورات سے ماخوذ تھا اور بعض احکام انکے علما اور کاہنوں کے وضع کردہ تھے، ان کے بعض شرعی و دینی واحکام کا ذکر صحیح احادیث میں موجود ہے[1] ان کے یہاں جشن کے خاص ایام مقرر تھے، سب سے مشہور عید الحصاد تھی جو سال کے ابتدا میں منائی جاتی تھی اسی طرح وہ عید الفطیر مناتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اسی دن حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کو لے کر ہجرت فرمائی تھی اور ان کو فرعون سے نجات ملی تھی۔ سبت (ہفتہ) کو وہ سب سے مقدس دن مانتے تھے اس لیے کوئی کام نہیں کرتے تھے ان کے یہاں نماز کے احکام و مسائل بھی تھے

---

[1] مسلم وابوداؤد اور دوسری حدیث کی مشہور کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔

لیکن اس کی متعین شکل و ہیئت کا پتہ لگانا مشکل ہے، اسلام کے برخلاف یہودیوں کے یہاں نماز کے احکام و قوانین زمانے کے ساتھ بدلتے رہے اور ان میں اصلاح و تجدید کا عمل بھی ہوتا رہا۔[1] ان کے یہاں صدقہ و زکوٰۃ کے بھی بعض احکام پائے جاتے تھے، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں:

"توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ[2] نیز بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا،[3] ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج کھلیان کی منتشر بالیاں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے جو ان کی زکوٰۃ تھی اور عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی۔"[4]

حضرت سید صاحبؒ نے انکی زکوٰۃ کے بعض مصارف کی تفصیل بھی قلمبند کی ہے۔

کچھ خاص ایام میں وہ اجتماعی یا انفرادی طور سے روزہ بھی رکھتے تھے عاشوراء کے روزے کا ذکر صحیح احادیث میں موجود ہے ملاحظہ ہو:

قدم رسول اللہ صلی اللہ	حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف
علیہ وسلم المدینۃ فرأی	لائے تو آپؐ نے دیکھا کہ یہود عاشوراء
الیہود تصوم یوم عاشوراء	کا روزہ رکھتے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ
فقال ما ھذا الیوم الذی	یہ کون سا دن ہے جس میں تم روزہ

---

[1] اسکی تفصیل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف لطیف ارکان اربعہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ [2] دیکھئے احبار ۲۷- ۳۰-۳۲) [3] خروج ۳۰- ۱۳- ۱۵) [4] سیرۃ النبی ج ۵ ص ۱۴۷- ۱۴۸-

تصومونه فقالوا هذا
یوم عظیم انجی الله فیه موسیٰ
وقومه وغرق فیه فرعون
وقومه فصامه موسیٰ شکرا
فنحن نصومه فقال رسول الله
صلی الله علیه وسلم فنحن
احق واولی بموسیٰ منکم
فصامه رسول الله صلی الله
علیه وسلم وامر بصیامه
وقال لاصحابه انتم احق
بموسیٰ منهم فصوموا[1]

رکھتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ
یہ بہت بڑا دن ہے جس میں اللہ
نے موسیٰ کو اور ان کی قوم کو فرعون
سے نجات دی اور فرعون اور اسکی
قوم کو غرق آب کیا تو حضرت موسیٰؑ
نے شکر کے لیے روزہ رکھا ہم بھی انکی
لیے روزہ رکھتے ہیں، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم تم
زیادہ موسیٰ کے حق دار ہیں اس بنا
پر آپ نے خود روزہ رکھا اور روزہ
رکھنے کا حکم بھی دیا اور صحابۂ کرام
سے فرمایا کہ تم لوگ یہود سے زیادہ
موسیٰ کے حق دار ہو اس لیے روزہ رکھو۔

ابتدا میں مسلمانوں پر عاشورا کے ہی روزے فرض تھے لیکن جب رمضان کے روزے فرض ہوئے تو عاشورا کے روزے کی فرضیت کا حکم منسوخ ہوگیا، عاشورا کے علاوہ یہود دوسرے ایام میں بھی روزے رکھتے تھے لیکن یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں۔ ان کی شریعت حج کے حکم سے بھی خالی نہیں تھی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی حج کیا تھا اس کے علاوہ جو احکام و قوانین ان کے یہاں

---

[1] صحیح البخاری کتاب الصوم۔

رائج تھے ان کی شکل و ہیئت انھوں نے مسخ کر ڈالی تھی تورات میں ان کے علماء و احبار کی آراء داخل ہو گئی تھیں ان کا دعویٰ تو یہ تھا کہ وہ اپنی عبادات و معاملات وغیرہ میں تورات کے احکام کے پابند ہیں لیکن انھوں نے ان کو اپنی خواہشات کے مطابق کر لیا تھا، حدود اللہ کا نفاذ ان کے یہاں صرف پسماندہ طبقہ کے لیے مخصوص تھا، قرآن مجید نے بھی تورات میں تحریف کا مجرم انہیں گردانا ہے، ارشاد ربانی ہے:

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا	اب کیا تم مسلمان توقع رکھتے ہو کہ وہ
لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ	مانیں تمھاری بات اور ایک لوگ تھے
يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ	ان میں کہ سنتے کلام اللہ کا اور پھر
يُحَرِّفُونَهُ مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ	اس کو بدل ڈالتے بوجھ کے کر اور
وَهُمْ يَعْلَمُونَ (بقرہ: ۷۵)	ان کو معلوم ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهِ	بدلتے ہیں کلام کو اپنے ٹھکانے سے
وَنَسُوا حَظًّا مِمَّا ذُكِّرُوا بِهِ	اور بھول گئے ایک فائدہ لینا اس
(مائدہ: ۱۳)	نصیحت سے جو ان کو کی تھی۔

غرض شریعت الٰہی اور تورات میں قطع و برید یہود کے علماء و احبار کا دل پسند مشغلہ ہو گیا تھا۔

ہجرت کے وقت مدینہ منورہ میں یہود کی تعداد

ہجرت کے وقت یہود کی کل تعداد کیا تھی اس کا پتہ لگانا مشکل ہے تاہم بعض روایات میں ان کے مشہور اور بڑے قبائل کے افراد کی تعداد مذکور ہے جس کو بیان کیا جاتا ہے۔

بنو قینقاع کے بارے میں عام اتفاق ہے کہ ان کے مقاتلین کی تعداد ۷۰۰ تھی۔[1] ان میں سے تین سو زرہ میں ملبوس تھے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غیر مقاتلین اور عورتوں کو ملا کر یہ تعداد ایک ہزار سے متجاوز رہی ہوگی۔

بنو قریظہ کی تعداد کا تھوڑا بہت اندازہ اس روایت سے ہوتا ہے جس میں ان کی بدعہدی کے نتیجہ میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کے مطابق ان کے بالغ مردوں کے قتل اور عورتوں اور بچوں کی قید کا ذکر ہے۔ اصحاب سیر نے ان کی تعداد ۶۰۰ سے ۹۰۰ تک لکھی ہے[2] لیکن محدثین ان کی تعداد صرف ۴۰۰ بتاتے ہیں۔

علامہ ابن کثیر اور دوسرے مورخین نے اس اختلاف کو بیان کرکے اس میں کوئی تطبیق نہیں دی ہے، دار العلوم ندوۃ العلما کے شیخ الحدیث اور راقم کے استاذ مولانا ناصر علی صاحب کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے کم تعداد بتائی ہے انھوں نے صرف جنگجو جوانوں ہی کو محسوب کیا ہے اور جنھوں نے تعداد زیادہ لکھی ہے انھوں نے مقتولین کو بھی شمار کر لیا ہے اب اگر ۴۰۰ کی تعداد کو مان لیا جائے تو عورتوں کو شامل کرنے کے بعد کل تعداد ۸۰۰ کے قریب ہوگی۔

بنو نضیر کی تعداد کے بارے میں کوئی صراحت نہیں ملتی ایک روایت میں

---

[1] تاریخ الامم والملوک للامام الطبری ج ۲ ص ۴۷۹، السیرۃ النبویۃ لابن کثیر ج ۲ ص ۵۰، انسان العیون فی سیرۃ الامین والمامون المعروف بالسیرۃ الحلبیہ ج ۲ ص ۴۷۸ [2] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۲۴۱ و الطبقات الکبری لابن سعد ج ۲ ص ۵۶[3] والکامل لابن اثیر ج ۲ ص ۱۷۶ والدرر لابن عبد البر ص ۱۹۲ والسیرۃ النبویۃ لابن کثیر ج ۲ ص ۲۳۹

ان کے اونٹوں کی تعداد ۶۰۰ بتائی گئی ہے جیسا کہ علی مقریزی نے لکھا ہے[1] اسی تعداد کا ذکر صاحب سیرۃ حلبیہ اور صاحب مواہب لدنیہ نے بھی کیا ہے[2]

دوسری روایت حافظ ابن کثیر نے کی ہے وہ فرماتے ہیں اعطی کل ثلاثة بعیرا یعتقبونہ[3]

ان دونوں روایتوں کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی کل تعداد ۱۸۰۰ کے قریب ہوگی اس لیے کہ چھ سو اونٹ تھے اور ہر تین آدمیوں کو ایک اونٹ دیا گیا تھا۔

اس طرح تینوں قبائل کی کل تعداد کم و بیش ساڑھے تین ہزار کے قریب رہی ہوگی رہے دوسرے قبائل تو ان کے افراد کی تعداد بہت کم تھی ان سب کا تخمینہ ہزار ڈیڑھ ہزار ہوگا ایسی صورت میں مدینہ کے یہود کی کل آبادی ساڑھے چار ہزار رہی ہوگی لیکن یہ سب ظن و تخمین پر مبنی ہے ورنہ اس سلسلہ میں کوئی قطعی اور صریح تاریخی ثبوت موجود نہیں ہے۔

علامہ سمہودیؒ نے یہودی قلعوں کی میزان ۵۹ لکھی ہے[4]۔ واللہ اعلم

اسلام کے بارے میں یہودی موقف | قرآن مجید اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود ایک نبی کے منتظر تھے اور اس کا تذکرہ وہ اوس و خزرج سے کیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

[1] امتاع الاسماع ص ۱۸۱ [2] سیرۃ حلبیہ ج ۲ ص ۵۷۵ و المواهب اللدنیہ ج ۱ ص ۱۳۰

[3] السیرۃ النبویہ لابن کثیر ج ۲ ص ۲۴۸ [4] وفاء الوفاء ج ۱ ص ۱۶۵۔

وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ	اور پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں
عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا	پر پھر جب پہونچا ان کو جو پہچان رکھا
جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا	تھا اس سے منکر ہوئے سو لعنت
بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكَافِرِيْنَ	ہے اللہ کی منکروں پر۔

(البقرہ: ۸۹)

مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہود کا تذکرہ ہے۔[1] عوفیؒ فرماتے ہیں کہ ان کا خیال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مشرکین عرب پر ان کے غلبہ کا پیش خیمہ ہو گی۔[2]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ	اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور یہ
وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ	کہ چھپاؤ سچ کو جان کر۔

(بقرہ: ۴۲)

امام طبریؒ نے اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ روایت نقل کی ہے:

"تم کو میرے رسول اور اس کے ساتھ آنے والی ہدایت کا جو علم ہے اسے نہ چھپاؤ درآنحالیکہ تم کو اپنی کتابوں کے ذریعہ اس نبی کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔"

امام طبری مجاہدؒ سے نقل کرتے ہیں:

"اہل کتاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کتمان سے کام لیتے تھے حالانکہ وہ

---

[1] تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۸۷ [2] مجتمع المدینہ المنورۃ کا لاعظمی ص ۱۷۹

اپنی کتابوں تورات وانجیل میں ان کو لکھا ہوا پاتے تھے[1]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں واضح خبر دی جا چکی تھی اور یہود اس کو خوب اچھی طرح سے جانتے تھے اسی لیے اللہ کا ارشاد ہے:
یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (بقرہ : ۱۴۶)

عاصم بن قتادہ انصاری اپنی قوم کے لوگوں کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ خدا کی رحمت کے بعد جو چیز ہمارے اسلام قبول کرنے کا سبب بنی وہ یہ کہ ہم تو مشرک و بت پرست تھے اور یہود صاحب علم و صاحب کتاب تھے، ہم میں اور ان میں جنگ و جدال ہوا ہی کرتا تھا تو جب بھی ان کو ہم سے کچھ زک اٹھانی پڑتی تو وہ کہتے کہ ایک نبی کا زمانہ قریب آگیا ہے اس کے ساتھ مل کر ہم تم کو عاد و ثمود کی طرح قتل کر دیں گے، یہ بات ہم اکثر ان سے سنا کرتے تھے چنانچہ جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ نے دعوت اسلام دی تو ہم نے یہ سمجھ کر اس پر لبیک کہا کہ یہ وہی نبی منتظر ہیں جن کا ذکر یہود کیا کرتے تھے اس لیے قبول اسلام میں ہم نے دیر نہیں کی لیکن یہود نے آپ کو جھٹلا دیا[2]

یہود اپنے کو اللہ کا مقرب و محبوب گردانتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ نبی انہی کے اندر سے مبعوث کیا جائے گا اور یہ فضل و امتیاز انہی کو حاصل ہوگا، قرآن مجید کی اس آیت میں ان کی اسی ذہنیت کی اس طرح عکاسی کی گئی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى — اور کہتے ہیں یہود اور نصاریٰ ہم بیٹے

---

[1] جامع البیان للامام محمد بن جریر طبری ج ۱ ص ۱۹۷ [2] مجتمع المدینہ المنورہ ص ۳۰۸ بحوالہ سیرت ابن ہشام۔

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ: ۱۸) ہیں اللہ کے اور اس کے پیارے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا	تو نے نہ دیکھے وہ لوگ جن کو ملا ہے
مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ	کچھ ایک حصہ کتاب کا ان کو بلاتے ہیں
اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى	اللہ کی کتاب پر کہ ان میں حکم کریں پھر
فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ	ہٹ رہتے ہیں بعضے ان میں تغافل
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا	کر یہ اس واسطے کہ کہتے ہیں ہم کو ہرگز
النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ	نہ لگے گی آگ مگر کئی دن گنتی کے اور
وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا	بہکے ہیں اپنے دین میں اپنی بنائی باتوں پر
كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (آل عمران، ۲۳، ۲۴)	

ان کی توقع کے برخلاف جب نبی کی بعثت بنی اسماعیل میں ہوئی تو ان کو بہت ناگوار ہوا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کی قیادت و سیادت کے خاتمہ کا اعلان ہے اسلیے وہ آپ کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہو گئے اور پوری طرح اسلام کی بیخ کنی میں لگ گئے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے انکار پر بعض انصاریوں نے جب ان پر لعن طعن کرتے ہوئے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اسلام قبول کرلو ہم تو بت پرست تھے اور تم ہی ہمیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی اطلاع دیا کرتے تھے اور ہم سے آپ کے اوصاف بیان کیا کرتے تھے، سلام بن مشکم نے کہا کہ یہ شخص وہ احکام لے کر مبعوث نہیں ہوا ہے جن کو ہم جانتے ہیں اور نہ ہی یہ وہ نبی ہیں جن کا تذکرہ ہم تم سے کیا کرتے تھے اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

فَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ	اور جب ان کو پہونچی کتاب اللہ کی طرف
عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا	سے سچا بتاتی انکے پاس والی کو اور
مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ	پہلے سے فتح مانگتے تھے کافروں پر
يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا	پھر جب پہونچا ان کو جو پہچان رکھا
فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا	تھا اس سے منکر ہوئے سو لعنت
بِهِ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ	ہے اللہ کی منکروں پر، برے مول
بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ	خریدا اپنی جان کو کہ منکر ہوئے
أَن يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ	اللہ کے اتارے کلام سے اس ضد
بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ اللَّهُ مِن	پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے
فَضْلِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ	جس پر چاہے اپنے بندوں میں سو
عِبَادِهِ فَبَاءُوا بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ	کما لائے غصہ پر غصہ اور منکروں
وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ	کو عذاب ہے ذلت کا۔

(بقرہ : ۸۹ - ۹۰)

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے آگاہ تھے اور آپ کے منتظر بھی تھے لیکن اپنی ہٹ دھرمی کی بنا پر انھوں نے آپ کی تکذیب و انکار کو اپنا شیوہ بنا لیا، جب اسلام نے یہود کی محرف تعلیمات کی نشاندہی کر کے ان کا استیصال کرنا چاہا تو وہ انکار و تکذیب کے علاوہ آپ کے درپے آزار بھی ہو گئے اور دوسروں کو بھی اس کے لیے آمادہ کرتے رہتے تھے، اپنے اسی گھٹیا مقصد کی تکمیل کے لیے انہیں شرک و وثنیت سے ساز باز کرنے میں بھی کوئی عار نہ تھا

نہ ہوا، ایک مرتبہ ایک یہودی سے مشرکوں نے کہا کہ تم علم والے اہل کتاب ہو یہ بتاؤ کہ ہم بہتر ہیں یا یہ نیا دین لانے والے ؟ تو اس یہودی نے صاف کہہ دیا کہ تم ان سے بہتر ہو۔

یہودی مستشرق ڈاکٹر اسرائیل ولفنسن لکھتے ہیں کہ یہود کی دشمنی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام نے یہود کے تحریف شدہ عقائد و احکام پر کاری ضرب لگائی تھی، وہ لکھتے ہیں:

"اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات صرف بت پرستی کی بیخ کنی ہی کیلئے ہوتیں اور یہود کو آپ کی رسالت کے اعتراف کا مکلف نہ بنایا جاتا تو یہود اور مسلمانوں کے درمیان کوئی نزاع نہ ہوتا اور یہود آپ کی تعلیمات کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے اور جان و مال دونوں سے آپ کی مدد کرتے کہ صنم پرستی کی بیخ کنی ہو جاتی اور بت پرستی کے عقیدہ کا خاتمہ ہو جاتا بشرطیکہ آپ یہود سے اور انکے دین سے کوئی تعرض نہ کرتے اور نہ انہیں اس نئی رسالت کے اعتراف کا مکلف قرار دیتے اسلیے کہ یہودی ذہنیت کسی بھی ایسی چیز کے سامنے جھک نہیں سکتی جو انکو انکے دین سے ہٹا دے انکے لیے تو اسکا تصور بھی مشکل تھا کہ بعثت بنی اسرائیل کے علاوہ کہیں اور ہو"۔

حقیقت یہ ہے کہ احکام الٰہی کی تحریف، انبیاء کی تکذیب اور انکی ایذا رسانی یہود کی عادت ثانیہ بن چکی تھی جسکے نتیجہ میں اللہ کیطرف سے انکے لیے ذلت و نکبت اور مغضوبیت مقدر ہو گئی تھی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ	(آل عمران ۱۱۲)	ماری گئی ہے ان پر ذلت جہاں دیکھے جائیں سوائے دستاویز اللہ کے اور دستاویز لوگوں کے اور کمالائے غصہ اللہ کا اور ماری گئی ہے ان پر محتاجی یہ اس واسطے کہ وہ رہے ہیں منکر اللہ کی آیتوں سے اور مارتے رہے نبیوں کو ناحق یہ اسلیے کہ وہ بے حکم ہیں اور حد سے بڑھتے ہیں۔

گجرات کے بعض سلاطین، امرا و مشائخ

سُلطان محمود بن محمد بیگرہ

از جناب مولانا یوسف متالا

سلطان ابوالفتح سیف الدین محمود بن محمد بن احمد بن محمد بن مظفر مشہور بہ محمود بیگرہ[1] کی تاریخ ولادت ۱۰ رمضان ۸۲۹ھ ہے[2]۔ صاحب النور السافر نے سخاوی کے حوالہ سے سن ولادت ۸۴۹ھ لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ محمود بیگرہ نے داؤد شاہ کی رحلت کے بعد ۸۶۳ھ میں یعنی پندرہ سال کی عمر میں عنان حکومت سنبھالی[3]۔ محمود بیگرہ کے جد امجد مظفر شاہ کے والد ننداً مقدم نے فیروز شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا، یہاں محمود بیگرہ کے خاندان کی تاریخ کا مختصر ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

محمود بیگرہ کے جد امجد مظفر شاہ کے والد

مظفر شاہ کے والد کے مشرف بہ اسلام ہونے کا واقعہ یوں ہے کہ ایک روز سلطان فیروز شاہ شکار کے لیے دہلی سے نکلا۔ اتفاقاً لشکر سے جدا ہو کر تھانیسر کے پاس ایک گاؤں بھودر میں جا پہنچا۔ وہاں ننداً مقدم نامی ایک

---

[1] بیگرہ کی وجہ تسمیہ مرأۃ سکندری میں یہ مذکور ہے کہ بے ہندی میں دو کو کہتے ہیں اور گڑھ قلعہ کو کہتے ہیں چونکہ محمود نے جوناگڈھ اور چانپانیر کے دو بڑے قلعے فتح کیے تھے اس لیے بیگرہ سے مشہور ہوئے۔

[2] بزم رفتہ کی کہانیاں [3] النور السافر ص ۸۰۔

شخص نے اس کی خاطر تواضع کی۔ فیروز شاہ بہت خوش ہوئے اور ایک رات وہاں گذاری اور نندا مقدم کو مشرف بہ اسلام کر کے وجہ الملک خطاب دیا۔ رفتہ رفتہ ان کا شمار امیروں کے زمرے میں ہونے لگا[1]

مظفر شاہ اور گجرات | فیروز شاہ کے زمانہ میں بہمنی خاندان کی خود مختار سلطنت دکن میں قائم ہو گئی تھی، اس کے انتقال کے بعد اولاد کی نا قابلیت اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے اطراف و جوانب میں فتنہ و فساد برپا ہو گیا تھا۔ گجرات کے گورنر نے بھی بغاوت کر لی تھی اس وقت فیروز شاہ کے بیٹے محمد شاہ تغلق کے ہاتھوں میں سلطنت تھی۔ محمد شاہ نے مظفر شاہ کو ۷۹۳ھ میں گجرات کی حکومت دے کر روانہ کیا۔ مظفر شاہ نے گجرات پہونچکر فتنہ و فساد کو ختم کیا جس سے بہت جلد امن ہو گیا۔ مظفر شاہ نے نہایت ہی حکمت سے قرب و جوار کے راجاؤں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ادھر دہلی میں محمد شاہ کی سلطنت روز بروز رو بزوال ہو رہی تھی، بادشاہی کے ایک وزیر اقبال خاں نے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور پھر فیروز شاہ کے خاندان سے بادشاہت چلی گئی[2]

اس تباہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جونپور اور مالوہ کے حکام خود مختار ہو گئے مظفر شاہ کے لیے بھی اس کا موقع تھا کہ وہ اپنی خود مختاری کا اعلان کرے مگر انھوں نے عرصہ تک اس کی جسارت نہیں کی۔ آخر کار علماء و مشائخ کی استدعا اور اپنے بیٹے سلطان محمد عرف تاتار خاں کے اصرار پر ۸۱۰ھ میں مظفر شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ (مظفر شاہ کا اصلی نام ظفر خاں تھا)[3]

سلطان محمد عرف تاتار خاں | سلطان محمد تاتار خاں محمد شاہ تغلق کا وزیر تھا۔ اقبال خاں کے

---

[1] خلاصۃ التواریخ [2] تاریخ گجرات [3] ایضاً۔

غلبہ کے باعث دہلی چھوڑ کر اپنے باپ مظفر شاہ کے پاس گجرات چلا آیا۔ بیٹے نے باپ کو اس بات پر ابھارنے کی کوشش کی کہ اقبال خاں کا مقابلہ کر کے دہلی پر قبضہ کر لیں لیکن مظفر شاہ نے یہ بات نہ مانی اور گوشہ نشینی اختیار کر کے صوبۂ گجرات کی حکومت اپنے بیٹے کے حوالہ کر دی۔ حکومت سنبھالنے کے بعد محمد تاتار خاں نے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کروا دیا۔ ابھی دو ماہ ہی گذرے تھے کہ کسی نے اسے زہر دیکر شہید کر دیا۔

بیٹے کی رحلت کے بعد مظفر شاہ نے پھر حکومت سنبھالی اور تقریباً چار سال حکومت کر کے ۱۴۱۱ء میں اس دنیا کو خیرباد کہا[۱]

احمد شاہ بن محمد تاتار خاں مظفر شاہ کے انتقال کے بعد ان کے پوتے احمد شاہ تخت نشین ہوئے۔ یہ وہی بادشاہ ہیں جنھوں نے احمد آباد کی بنیاد ڈالی تھی اور اس شہر کو ایسی خوش اسلوبی سے آباد کیا کہ عرصۂ دراز تک ہندوستان کا بے نظیر شہر سمجھا جاتا رہا۔ احمد شاہ نے اپنے عہد میں ہندو راجاؤں کے حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی سرحدوں کو مضبوط کرنے کی طرف توجہ دی۔ ان کی حکمرانی کا سب سے بڑا کارنامہ حکومت کے قوانین و ضوابط تھے۔ احمد شاہ نے تقریباً ۳۲ سال حکمرانی کی اور ۱۴۴۳ء میں وفات پائی۔

محمد شاہ ابن احمد شاہ احمد شاہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے محمد شاہ جانشین ہوئے۔ یہ عافیت پسند اور فیاض طبیعت تھے۔ فیاضی کی وجہ سے لوگ انہیں زربخش کہا کرتے تھے۔ محمد شاہ کے زمانہ میں محمود شاہ خلجی بادشاہ مالوہ نے گجرات پر چڑھائی

---

[۱] تاریخ گجرات۔

کی، وزراء نے مدافعت کے لیے انہیں بہت کہا لیکن آمادہ نہیں ہوئے۔ اس سے وزراء نے یہ محسوس کیا کہ وہ بھاگنا چاہتے ہیں اور حکومت خلجی کے ہاتھ میں چلے جانے کا خطرہ ہے لہٰذا زہر دے کر ان کا کام تمام کر دیا اور ان کے بیٹے قطب الدین کو تخت نشین کر دیا۔ محمد شاہ نے تقریباً نو برس حکمرانی کی اور ۸۵۵ھ میں وفات پائی۔[1]

قطب الدین احمد شاہ محمد شاہ کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے جب برسر اقتدار ہوئے تو اپنا نام احمد شاہ رکھا۔ دلیری اور بہادری میں ممتاز تھے۔ انھوں نے سب سے پہلے محمود خلجی کا مقابلہ کیا اور اس کو پے در پے شکستیں دیں تقریباً آٹھ سال حکمرانی کر کے ۸۶۳ھ میں وفات پائی۔

محمود شاہ بیگڑہ قطب الدینؒ کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بھائی ابوالفتح سیف الدین محمود شاہ گجراتی المعروف بہ محمود بیگڑہ نے تقریباً ۱۵ سال کی عمر میں حکومت سنبھالی۔ یہی وہ بادشاہ ہیں جن کا ذکر یہاں مقصود ہے۔

محمود شاہ کو خدا تعالیٰ نے نہایت اعلیٰ اوصاف کے ساتھ متصف کیا تھا اور ایسے اخلاق حسنہ سے نوازا تھا کہ جو عام طور پر بادشاہوں میں کم ہی پائے جاتے ہیں۔ اپنی حکمت عملی سے ملک کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ احمد آباد کو صنعت و حرفت کا مرکز بنا دیا۔ ان ہی کے عہد حکومت میں سورت بہروچ ماہم کھمبات وغیرہ تجارت کی گرم بازاری سے بہت آباد اور پُر رونق ہو گئے۔ نہروالہ، بڑودہ، سلطانپور، احمد نگر وغیرہ کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے جانپانیر کے قریب محمد آباد،

---

[1] تاریخ گجرات میں قطب الدین کے انتقال کے بعد داؤد شاہ نے حکومت سنبھالی تھی لیکن سات روز ہی میں ان کا انتقال ہو گیا، لہٰذا کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

جونا گڑھ میں مصطفیٰ آباد اور احمد آباد سے بارہ کوس پر محمود آباد کے نام سے متعدد شہر آباد کیے، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر کرائیں، زراعت کو ترقی دی، پھل دار درخت لگوائے، نہریں اور چشمے کھودنے میں رعیت کی امداد کی۔ مہندس، معمار اور صنعت کار دوسرے ملکوں سے امنڈ آئے اور گجرات میں باغ و بہار آگئی۔ جا بجا حوض، کنوئیں، باغات، سرسبز و شاداب کھیتیاں، میوہ دار درخت اور قسم قسم کے کپڑے بننے لگے جن کی مانگ بیرونی ملک سے بھی آتی رہتی تھی۔ یہ سب سلطان محمود شاہ بیگرہ کی توجہ کا ثمرہ تھا۔

ان کے یادگار کارناموں میں سے سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دل کھول کر علم اور اہل علم کی سرپرستی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب و عجم کے مشاہیر علمار گجرات میں جمع ہو گئے اور گجرات رشک بلاد یمن ہو گیا اور پھر یہاں حدیث کا خوب چرچا ہوا۔

علامہ جلال الدین محمد بن محمد مالکی مصری تشریف لائے تو موصوف کو ملک المحدثین کا خطاب دیا، علامہ مجد الدین محمد بن محمد ایجی تشریف لائے تو انہیں رشید الملک کے خطاب سے نوازا، انہی کے دور میں ابوالقاسم ابن احمد بن محمد شافعی کا ورود ہوا۔

عادات و خصائل سلطان محمود نہایت پاک دامن، خوش اخلاق، کثیر الاحسان والکرم تھے، ان کے اچھے اوصاف کا ذکر صاحب النور السافر اور مولف مرآۃ سکندری نے کیا ہے۔ آصفی نے لکھا ہے کہ محمود بیگرہ ۹۱۶ھ میں نہروالہ پٹن تشریف لے گئے وہاں کے علمار کی زیارت کی، متوفین کی قبروں پر دعا پڑھی اور تفسیر و حدیث کے لیے ایک مجلس مذاکرہ منعقد کی۔ علمار کے لیے عطایا و وظائف میں اضافہ کیا، اپنے

سلطان کے قبرستان میں اپنے لیے قبر کھدوائی، کبھی کبھی اس کو دیکھنے کے لیے جاتے، ایک روز قبر کا دہانہ کھلوا کر دیکھا اور اس کے کنارے پر بیٹھ کر فرمایا:-

اللهم ان هذا اول منازل	اے اللہ یہ آخرت کی منزلوں میں
الآخرة فسهله واجعله من	سے پہلی منزل ہے سو اس کو آسان
رياض الجنة[1]	کر دے اور اسے جنت کی کیاریوں
	میں سے بنا دے۔

خوفِ خدا | آخر عمر میں عبادت کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے تھے اور رقت قلب کی وجہ سے برابر روتے رہتے ان کا ایک امیر ملک سارنگ عرف قوام الملک تھا۔ احمد آباد سے باہر سارنگپور اسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ اس نے سلطان محمود کو کثرت سے روتے ہوئے دیکھکر دریافت کیا کہ دولت بھی ہے شہنشاہی بھی پھر رونے کی کیا وجہ سلطان نے جواب دیا کہ تمھیں کیا بتاؤں۔ میرے مرشد شاہ عالم قدس سرہٗ نے میرے لیے دعا ضرور کی تھی کہ محمود کی عاقبت محمود ہو لیکن جس قدر سوچتا ہوں تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ عاقبت محمود نہ ہو سکے گی۔ عمر کی نہر بہتی چلی جاتی ہے اور جو بہہ گئی وہ واپس نہیں آتی۔ دل حسرتوں سے بھرا ہوا ہے[2] ایک مرتبہ قبر کا گڑھا چاندی سے پر کرکے خیرات کر دیا۔

فیاضی | خدا تعالیٰ نے سلطان محمود کو سخاوت کی دولت سے بھی نوازا تھا، روزانہ انکے حکم سے کھانے کے وقت نقارہ بجایا جاتا اور منادی آواز دیتا کہ جس کا جی چاہے دسترخوان پر آکر شریک ہو۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے پینے کی چیزیں ہوتیں آخر میں شرکاء کو

---

[1] ظفر الوالہ [2] مرآۃ سکندری۔

پان اور عطریات دیئے جاتے۔

شیخ سراج الدین کی خدمت میں | سلطان محمود بیگرہ اپنے روحانی علاج کے لیے اس زمانہ کے ایک بزرگ شیخ سراج الدین کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔ شیخ سراج الدین شیخ علی خطیب کے خلیفہ تھے اور وہ شیخ قطب الاقطاب برہان الدین کے خلیفہ تھے۔ شیخ سراج الدین کے سالکوں کی بڑی تعداد تھی جنھیں شیخ نے عین الیقین کے مقام تک پہونچا دیا تھا۔

سلطان محمود کا ایک امیر امین الملک شیخ سراج الدین کا معتقد تھا۔ محمود نے اپنے امیر سے شیخ کے متعلق دریافت کیا چنانچہ اس نے آپ کے مناقب و فضائل بیان کیے جس سے محمود بیگرہ بہت متاثر ہوئے اور شیخ سے ملاقات کا شوق ہوا چنانچہ ایک رات محمود اپنے امیر کے ہمراہ شیخ سراج الدین کی خدمت میں پہونچے سلام مصافحہ کیا۔ پھر سلطان نے ان سے عرض کیا کہ اپنی توجہ سے مجھے ظلمات نفسانی سے نکال کر مقام ہدایت تک پہونچا دیں۔ شیخ نے فرمایا کہ اگر واقعی کسی کو اس کی تلاش ہو تو درویش بھی اس کے لیے باب ہدایت کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سلطان نے کہا کہ محمود کو واقعی ایک دردمند سمجھیں اور اس کا علاج کریں اور اس کو صحیح راستہ پر لگا دیں۔ شیخ نے فرمایا کہ آپ کے سر پر امارت ہے اور کندھوں پر ذمہ داریاں ہیں، راہ سلوک میں ان تمام چیزوں سے قطع تعلق کرنا ضروری ہے۔

سلطان نے کہا کہ اس راہ کے لیے میں اپنی مسند سلطنت چھوڑ کر آپ کی ملازمت کا احرام باندھنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ سن کر شیخ بڑے خوش ہوئے اور فرمایا کہ اگر بادشاہت عدل وانصاف کے ساتھ کی جائے تو اس سے بادشاہ کو کوئی نقصان

نہیں پہونچتا۔ پھر شیخ نے سلطان سے فرمایا کہ آج تو آپ واپس جائیں کل میں جو کچھ کہلا بھیجوں اس کو قبول کریں اور اس میں چوں وچرا نہ کریں۔ محمود نے دوسرے دن امین الملک کو شیخ کی خدمت میں یہ کہہ کر بھیجا کہ وہ جو کچھ کہیں اس کو واپس آکر بے کم وکاست دہرانا۔ امین الملک شیخ کی خدمت میں پہونچا تو انھوں نے فرمایا کہ سلطان کو میں نے ایک اچھا مرد اور فقیر دوست پایا۔ میرا دل سلطان کی صحبت چاہتا ہے میری خواہش ہے کہ میں سلطان کے یہاں نوکری کروں۔ میری اس خواہش کو سلطان تک پہنچا دو اگر سلطان منظور کر لیں تو مجھے کسی خدمت پر مامور کر دیں امین الملک ان کے یہاں سے چلا تو وہ پریشان تھا کہ میں نے سلطان کے سامنے شیخ کی بہت تعریف کی تھی اور اب یہ پیام پہونچاؤں گا تو معلوم نہیں سلطان کیا سوچیں گے لیکن شیخ کا حکم تھا اس لیے اس نے ساری بات بیان کر دی۔ سلطان نے سن کر کہا کہ مجھے منظور ہے لیکن شیخ سے دریافت کرو کہ وہ کون سا عہدہ قبول کریں گے۔ شیخ نے جواب میں فرمایا کہ میں فن حساب میں ماہر ہوں لہذا مجھے استیفائے ملک کے منصب پر مقرر کر دیں۔ سلطان نے منظور کر لیا دوسرے روز شیخ نے اپنی کمر میں تلوار باندھی اور گھوڑے پر سوار ہو کر سلطان کے یہاں پہونچے اور دستونی کی خلعت پہنی۔ پھر اپنے گھر واپس آئے شہر کے لوگ شیخ کو قطب اور غوث سمجھتے تھے لیکن ان کی اس ملازمت سے ان سے بدظن ہو گئے اور شیخ کو متہم سمجھنے لگے کہ انھوں نے اپنے زہد کو مال اور دنیا کی خاطر بیچ ڈالا اور ان کی ساری ریاضت سلطان کو اپنا معتقد بنانے ہی کے لیے تھی۔

شیخ اس طعنہ کے باوجود روزانہ سلطان کے پاس تشریف لاتے۔ کچھ دنوں

کے بعد امین الملک سے شیخ نے کہا کہ سلطان سے کہو کہ میں بوڑھا آدمی ہوں آنے جانے میں مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اگر اپنے محل کے پاس مجھ کو جگہ دے دیں تو ہر وقت سلطان کے پاس حاضر رہوں۔ سلطان نے اپنے پاس ہی ان کو رہنے کی جگہ دے دی چنانچہ انھوں نے وہاں قیام کر لیا اور لوگوں سے چھپ کر سلطان کی تربیت میں مشغول ہو گئے اور چند ہی دنوں میں سلطان فیضیاب ہو گئے اور ان کے دل کا غنچہ کھل گیا۔ اس کے بعد شیخ نے فرمایا اب مجھے جانے کی اجازت دی جائے چنانچہ آپ واپس اپنے مستقر پر لوٹ آئے اور سلطان سے کہا کہ اب مجھ سے ملاقات نہ کرنا۔ کوئی ضرورت ہو تو لکھ کر پیغام بھیجدینا[1]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت

ایک رات سلطان محمود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں دو طبق مرحمت فرمائے۔ اس کی تعبیر یہ قرار پائی کہ سلطان کو دو بڑی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ چنانچہ اس کے بعد سلطان نے دون اور کرنال کو فتح کر لیا[2]

حفاظ قرآن مجید کی قدردانی

سلطان محمود ایک مرتبہ شب قدر میں علما و صلحا کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے علماء کے درمیان باہم فکر آخرت پر گفتگو ہو رہی تھی ایک عالم دین نے بیان کیا کہ قیامت کے دن آسمان سے آفتاب نیچے آئے گا۔ گنہگاروں کے سروں پر آفتاب سوا نیزے کے برابر ہو گا اور اس کی تپش سے وہ جل رہے ہوں گے اگر ان میں کوئی حافظ قرآن ہو گا تو اس کے اسلاف کی سات پشتیں رحمت کے سایہ میں ہوں گی اور آفتاب کی گرمی کا اثر ان پر نہ ہو گا۔ یہ سن کر سلطان محمود کی

---

[1] مرآۃ سکندری ص ۱۰۵ [2] بزم رفتہ کی سچی کہانیاں۔

زبان سے ایک آہ نکلی۔ پھر کہا کہ میرے لڑکوں میں سے کسی کو یہ سعادت حاصل نہیں ہے۔ تاکہ میں بھی اس رحمت کا امیدوار ہوتا۔

سلطان کے صاحبزادے خلیل خاں اس مجلس میں موجود تھے جو آگے چل کر سلطان مظفر کے لقب سے تخت نشین ہوئے اس نے باپ کی بات سن لی کچھ دنوں کے بعد اسکو بڑودہ کی جاگیر دی گئی اور وہ یہاں چلے آئے، بڑودہ آکر قرآن پاک کی تلاوت اور اس کے حفظ کرنے کے علاوہ کسی اور کام میں مشغول نہ ہوئے۔ اسی محنت اور اہتمام سے انھوں نے ایک سال میں تمام کلام مجید حفظ کر لیا۔ رمضان المبارک میں باپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حکم ہو تو تراویح میں قرآن سناؤں۔ سلطان محمود یہ سن کر بے حد مسرور ہوئے بیٹے کو گلے سے لگایا اور بوسہ دیا۔

بیٹے نے رمضان المبارک میں کئی بار کلام پاک تراویح میں سنایا۔ سلطان نے کہا کہ اپنے بیٹے کا شکریہ کس طرح ادا کروں کہ اس نے اپنے اسلاف کو قیامت کے دن آفتاب کی گرمی سے نجات دلائی۔ اس کا بدلہ صرف یہی ہے کہ میرے ہاتھ میں بادشاہت ہے اس کو دے دوں۔ سلطان نے اپنے بیٹے کے قرآن پاک حفظ کرنے کی خوشی میں ایک دعوتِ عام کی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایسی دعوت کبھی نہیں ہوئی[1]

علماء و مشائخ سے محبت سلطان محمود کو علماء کرام و مشائخ عظام سے بڑی محبت و عقیدت تھی۔ اپنی وفات سے قبل نہروالہ گئے۔ وہاں کے تمام علماء و صلحا سے ملاقات کی ان کو انعام و اکرام سے نوازا۔ جب رخصت ہونے لگے تو کہا اب اجل مہلت نہ دے گی کہ آپ لوگوں سے پھر مل سکوں۔ نہروالہ سے پٹن مشائخ کے مزاروں کے

---

[1] مرآۃ سکندری۔

لیے حاضر ہوئے۔ پھر احمد آباد آکر شیخ احمد کھٹو کے مزار پر حاضری دی۔[1]

آصفی نے لکھا ہے کہ ۹۱۷ھ میں سلطان محمود صاحب فراش ہو گئے تھے۔ اپنے صاحبزادہ مظفر کو وصیت نامہ حوالہ کیا جو بڑودہ سے آئے ہوئے تھے۔ جب سلطان کو افاقہ ہوا تو صاحبزادہ واپس بڑودہ لوٹ گئے سلطان پھر بیمار پڑ گئے اور اپنے بیٹے مظفر کو طلب کیا مگر اس کے آنے سے ایک گھنٹہ قبل سلطان نے اس دنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔ رحلت بوقت عصر ۲ ماہ رمضان ۹۱۷ھ بعمر ۶۹ سال ہوئی۔ مدت بادشاہت ۵۵ برس ہے۔ حضرمی نے سن وفات ۹۱۶ھ لکھا ہے۔

سلطان مظفر حلیم ابن محمود بیگڑہ

نام سلطان مظفر بن محمود بن احمد بن محمد کنیت ابو نصر اور لقب شمس الدین تھا۔ ولادت ۲۰ شوال ۸۷۵ھ کو گجرات میں ہوئی۔ بادشاہت کے جھولے میں پروان چڑھے والد کی نگرانی میں علم دین حاصل کرتے رہے۔ ان کے اساتذہ میں علامہ مجد الدین ایجی اور محدث جمال الدین بحرق حضرمی قابل ذکر ہیں۔

اپنے والد سلطان محمود بیگڑہ کی رحلت کے بعد ۳ ماہ رمضان ۹۱۷ھ میں حکومت کی باگ ہاتھ میں لی اور نہایت عدل وانصاف، سخاوت وشجاعت سے حکمرانی کا آغاز کیا۔ صلاح وفلاح اور ورع وتقویٰ میں والد ماجد محمود بیگڑہ کے بالکل نقش قدم پر تھے۔

اوصاف وکمالات سلطان نہایت نرم دل اور رعیت سے حسن سلوک کرنے والے

---

[1] بزم رفتہ کی سچی کہانیاں۔

تھے۔ اسی وجہ سے حلیم سے یاد کیے جاتے تھے۔ علوم دین سے اچھی طرح واقف تھے نہایت سلیم الطبع اور حاضر جواب تھے۔ فنون حرب میں خصوصاً تیر اندازی، نیزہ بازی، شمشیر زنی، گھڑ سواری میں مہارت تامہ حاصل تھی، خطاطی میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، اپنے ہاتھ سے قرآن مجید لکھ کر حرمین شریفین بھجواتے۔ جوانی ہی میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اتباعِ رسولؐ کا خاص اہتمام تھا۔ جب موت یاد آتی تو زار و قطار روتے۔ علمائے کرام سے بڑی عقیدت تھی۔ اکابر و مشائخ سے محبت کا اظہار کرتے۔

شریعت کی سختی سے پابندی کرتے۔ ہمیشہ باوضو رہتے۔ باجماعت نماز ادا کرتے۔ کبھی کسی کی اہانت نہ کرتے۔ اسراف سے بچتے لیکن سخاوت کا دامن نہ چھوڑتے تمام رعیت کے احوال کی خبر رکھتے۔ بعض اوقات لباس بدل کر رات میں اپنے محل سے نکلتے اور رعایا کے حالات معلوم کرتے۔

فکرِ آخرت ایک روز سلطان مظفر قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ قیامت کی آیتوں کو پڑھ کر رونے لگے۔ ان کے ایک خادم نے عرض کیا بادشاہ سلامت میرے علم میں آپ سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہوا بلکہ اکثر آپ کو عبادت میں مشغول پایا ہے لہذا مغفرت کی بڑی امید ہے یہ سن کر سلطان نے اس خادم سے کہا کہ میری گردن پر بار گراں ہے اس لیے روتا ہوں۔ تم نے سنا نہیں کہ نجا المخففون وھلک المثقلون (ہلکے بوجھ والے نجات پا جائیں گے اور گراں بار ہلاک ہوں گے)[1]

شراب سے نفرت سلطان مظفر نے شہزادگی اور بادشاہت کے زمانہ میں کوئی

---

[1] مرأۃ سکندری۔

نشہ آور چیز استعمال نہیں کی۔ ایک روز ایک درباری امیر قوام الملک نے پوچھا کہ آپ نے کبھی مسکرات کا استعمال کیا ہے۔ جواب دیا جب پانچ سال کا تھا تو ایک دن بالاخانہ سے اتر رہا تھا کہ زینہ پر پاؤں پھسلا اور زمین پر آگرا۔ شدید چوٹ آئی۔ اس وقت میری دادی میری پرورش کر رہی تھیں۔ انھوں نے بطور علاج مجھے شراب پلادی۔ میں نے اسی وقت قے کر دی اور طبیعت خراب ہوگئی۔ اس کے بعد میری دادی نے خواب دیکھا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم نے شہزادے خلیل خاں کو شراب پلادی؟ انھوں نے کہا ہاں۔ اس شخص نے کہا توبہ کرو، آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا۔ بیداری پر دادی نے استغفار کیا اور پھر میری طبیعت ٹھیک ہوگئی، اس کے بعد اللہ نے اپنے فضل وکرم سے مجھ کو شراب کی آلودگی سے محفوظ رکھا۔[1]

بعد میں سلطان کو شراب سے اس درجہ نفرت ہوگئی کہ سلطان کے پاس ایک گھوڑا تھا۔ اپنی چال اور خوش رفتاری میں منفرد تھا، سلطان کو سواری کے لیے وہ گھوڑا بہت پسند تھا۔ ایک دن اس گھوڑے کے پیٹ میں درد ہوا۔ ہر طرح کی دوا کی گئی لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک حاذق طبیب نے بتایا کہ اگر خالص شراب پلائی جائے تو اس سے فائدہ ہوگا چنانچہ اس کو شراب پلائی گئی اور اسکا درد جاتا رہا۔ سلطان کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو بڑے افسوس کا اظہار کیا اور اس گھوڑے کی سواری ترک کر دی۔[2]

شریعت کا لحاظ سلطان مظفر نے جب مانڈو فتح کیا تو وہاں سلطان محمود نے بڑی

---

[1] مرآۃ سکندری ص۔ [2] ایضاً۔

عظیم الشان دعوت کی تھی اس دعوت میں بعض چیزیں شریعت کے خلاف ہوئیں، مظفر شاہ کے متنبہ کرنے پر فوراً اصلاح کی گئی۔[1]

اجابت دعا: ایک مرتبہ سلطان مظفر حلیم دعائے استسقاء کے لیے نکلے۔ فقراء اور مساکین میں خوب خیرات کی اور ان سے بارش کے لیے درخواست کی خود مصلی پر آکر نماز پڑھائی۔ بعد میں دعا کرائی جس کا آخری حصہ یہ تھا:

اللھم انی عبدك ولا	یا اللہ میں تیرا بندہ ہوں، میں
املك لنفسی شیئا فان	کسی چیز کا بھی مالک نہیں۔ اگر میرے
تلك ذنوبی جست المطر	گناہ بارش کو روک رہے ہیں تو
عن خلقك فھا انا جبھتی	اے پروردگار یہ میری پیشانی
بیدك فاغثنا یا ارحم	تیرے قبضہ میں ہے۔ اے ارحم الراحمین
الراحمین۔	ہماری فریاد رسی فرما۔

انہی کلمات دعائیہ کے ساتھ ہی اپنی پیشانی زمین پر رکھ دیا اور بار بار ارحم الراحمین پکارنا شروع کیا ابھی سر نہیں اٹھایا تھا کہ بارانی ہوائیں چلنے لگیں۔ بجلی کوندی بادل گرجا اور بارش شروع ہو گئی۔

علالت: نماز استسقاء کے کچھ عرصہ بعد مظفر شاہ کی طبیعت خراب ہو گئی بدن کمزور ہو گیا، اسی علالت کے دوران ایک مجلس قائم کی جس میں سربرآوردہ افراد کے ساتھ علماء و مشائخ کو بھی دعوت دی گئی۔ ان علمائے کرام سے درخواست کی گئی کہ وہ آخرت کے موضوع پر گفتگو کریں۔ اسی درمیان میں اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اسکے

---

[1] مرآۃ سکندری۔

احسان کی بات ہونے لگی۔ مظفر شاہ نے اپنے اوپر اللہ تبارک و تعالیٰ کی نعمتوں کا ذکر بطور تحدیث بالنعمۃ کیا اس کے بعد فرمایا کہ میرے استاد شیخ مجدالدین نے اپنے مشائخ سے جو احادیث بیان کی تھیں وہ مجھے محفوظ ہیں اور میں ان روایات کے راویوں کی نسبت انہ ثقاہت کے ساتھ ان کے حالات و سوانح اول تا آخر جانتا ہوں اسی طرح آیات قرآنی کا معاملہ ہے جن کے حفظ، تفسیر، شان نزول اور علم قرأت کی دولت سے نوازا گیا ہوں۔ علم فقہ بھی مجھے مستحضر ہے، اللہ کے فضل سے چھ ماہ صوفیاء کے اشغال کیے ہیں جس سے مقصود تزکیۂ نفس تھا۔ میں نے تفسیر معالم التنزیل کا مطالعہ شروع کیا تھا امید تھی کہ پوری کتاب بالاستیعاب پڑھ لوں گا مگر اب صورت یہ ہے کہ اس تفسیر کو جنت ہی میں جاکر پورا کر سکوں گا۔

اے صاحبو! اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا۔ اب میرے اعضا کمزور ہو چکے ہیں جن کی دوا صرف اللہ سبحانہ کی رحمت ہے اس کے بعد حاضرین مجلس نے سلطان کی درازی عمر کے لیے دعا کی۔ ۹۳۲ھ میں سلطان مظفر چانپانیر سے نکلے۔ اپنا سب گرد و پیش بدل ڈالا، خیرات میں کثرت کر دی۔ احمد آباد پہونچنے کے بعد مقدس مزاروں پر بار بار جانے لگے۔

یوم رحلت | جمعہ کا دن تھا۔ سلطان مظفر اپنے دربار سے محل میں گئے اور دن ڈھلنے کے وقت ایک ہی پہلو پر آرام کرتے رہے۔ پانی طلب کیا اور وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کی۔ پھر زنان خانے میں گئے جو آہ و بکا کر رہے تھے۔ سلطان نے انہیں صبر کی تلقین کی۔ پھر راجہ محمد حسین اشجع الملک سے ملاقات کی اور ان سے سورۂ یٰسین پڑھنے کی درخواست کی۔ پھر ان سے معلوم ہوا کہ اذان جمعہ کا وقت ہے سلطان نے

عادت نماز جمعہ کے لیے قبل از وقت مسجد میں جانے کی تھی مگر آج انھوں نے کہا کہ میں نماز ظہر پڑھوں گا اور عصر کی نماز جنت میں ادا کروں گا انشاء اللہ۔ اسکے بعد شرکائے مجلس کو نماز کے لیے جانے کی اجازت دی اور اپنے لیے مصلی طلب کیا اور نماز کی نیت باندھ لی۔ ان کی آخری دعا یہ تھی۔ رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِي مِن تَأْوِيلِ الْأَحَادِيثِ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَنتَ وَلِيِّي فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ (یوسف: ۱۰۱) اس کے بعد اپنے بستر پر لیٹ گئے، چہرہ قبلہ رخ تھا زبان پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ جاری تھا آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

وفات سلطان مظفر کی وفات ۲ جمادی الاولی ۹۳۲ھ کو ہوئی سرکھیج میں مدفون ہیں۔

(باقی)

دو ضروری تصحیح

۱۔ معارف اپریل ۱۹۹۲ء میں کرنل بشیر حسین زیدی صاحب کے متعلق ص ۳۱۵ پر غلطی سے دارالمصنفین کا رکن چھپ گیا ہے، وہ دارالمصنفین کے بہت معزز رکن تھے۔

۲۔ مئی ۱۹۹۲ء میں تاریخ شعرائے روہیل کھنڈ ملنے کا پتہ درج ہونے سے رہ گیا ہے، پتہ حسب ذیل ہے،

فرحان پبلیکشنز، کراچی، پاکستان۔

تاج محل کی تعمیر اور مرزا راجہ جے سنگھ کے نام

شاہجہاں کا فرمان

از حکیم سید محمد احمد ٹونک

"جے پور" میں مہاراجگان کے یہاں پشت ہا پشت اور نسل در نسل سے جو شاہی فرامین محفوظ چلے آ رہے تھے وہ بزمانۂ قدیم "شہر آمیر" میں دو مقامات پر محفوظ تھے ان میں سے ایک ریکارڈ تو "آمیر" کے ایک محافظ خانہ میں رکھا ہوا تھا اور دوسرا ریکارڈ مہاراجہ کے کپڑ دوارے (توشک خانہ) میں محفوظ تھا۔ موجودہ مہاراجہ کے والد" مہاراجہ مان سنگھ دوئم" (۱۹۲۲ء تا ۱۹۷۰ء) کو اسے دیکھنے، ترتیب دینے اور قابل استفادہ بنانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس غرض سے ۱۹۳۰ء و ۱۹۳۹ء کے درمیانی عرصہ میں یہ کام مشہور و معروف تاریخ نگار" سرجادو ناتھ سرکار" کے سپرد ہوا۔ چنانچہ جب ریکارڈ نکال کر دیکھا گیا تو اس کا بہت سا حصہ شکستہ، بوسیدہ اور آب رسیدہ ہو گیا تھا۔ صفائی اور درستی کے بعد اسے وہاں سے منتقل کر کے دفتر" دیوان حضوری واقع سٹی پیلس[1] جے پور" میں رکھا گیا۔ اس

---

[1] سٹی پیلس: شہر جے پور میں ایک بہت خوبصورت عمارت کا نام ہے جس میں مہاراجہ کے محلات اور دفاتر واقع ہیں۔ اس میں اس کی سکونت بھی ہے اور اس میں (بقیہ ص ۴۴۲ پر)

ریکارڈ میں شاہی فرامین، نشان، خریطے، طومار، اخبارات معلی اور وکیل رپورٹس تھیں جن کی حیثیت اہم تاریخی دستاویزی مواد کی تھی۔

بادشاہ سے متعلق خبروں کو اخبارات معلی کہا جاتا ہے۔ ان کی کاپی ایک دوسرے سے لمبائی میں جڑی ہوئی ہوتی تھی جس سے ایک بہت لمبی لڑی بن جاتی تھی جسے ٹین کے نلوے میں لپیٹ کر رکھا جاتا تھا اور ان میں جڑے ہوئے پرچوں کو طومار کہا جاتا تھا۔ چونکہ آمیر کا وکیل شاہی دربار میں مستقل طور سے حاضر باش رہا کرتا تھا اور اس کے ذمہ یہ خدمت بھی ہوتی تھی کہ وہ بادشاہ۔ دربار۔ قلعہ اور شاہی محل سے متعلق ہر ہر بات کو نوٹ کر کے فوراً بھیجتا رہے۔

راجستھان بننے کے بعد چونکہ مہاراجہ مان سنگھ دوم "مہاراج پرمکھ" بنائے گئے تھے اور ان کا یہ آمیر والا ریکارڈ ان ہی کی بلڈنگ یعنی دفتر "دیوان حضوری سٹی پیلس جے پور" میں رکھا ہوا تھا اس لیے مہاراج صاحب نے اس ریکارڈ کو راجستھان گورنمنٹ کے سپرد کر دیا۔ (غالباً ان کا خیال تھا کہ وہ تاحیات "راج پرمکھ" رہیں گے اور یہ ریکارڈ بھی ان ہی کی بلڈنگ میں ہمیشہ ان کے زیر نگرانی رہے گا) لیکن غالباً ۱۹۶۰ء کے بعد جب مسٹر سکھاڈیہ چیف منسٹر تھے دفتر "دیوان حضوری واقع سٹی پیلس جے پور" والے اس ریکارڈ کو آرکائیوز بیکانیر منتقل کر دیا گیا اور وہاں سے اس جے پور والے ریکارڈ کی کچھ لسٹ اور کیٹلاگ شایع بھی ہو چکے ہیں

(بقیہ ص ۴۴۱) پوتھی خانہ، سوائی مان سنگھ میوزیم اور دوسرے دفاتر بھی واقع ہیں۔ اور اس کے قریب ہی سوائی جے سنگھ کا بنایا ہوا "جنتر منتر" بھی ہے۔ یہ عمارت ہوا محل کے عقب میں آتش مارکیٹ و جلیبی چوک کے درمیان واقع ہے۔

اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ "مہاراجہ مان سنگھ دوم"[1] کے حکم سے جو کام سرجادو ناتھ سرکار نے کیا تھا اس کی پہلی جلد "ہسٹری آف جے پور اسٹیٹ" کے نام سے ۱۹۸۴ء میں باہتمام "مہاراجہ مان سنگھ دویم میوزیم"[1] جے پور (Orient Longman New Delhi) سے شایع ہو چکی ہے۔

دوسرا ریکارڈ جو مہاراجہ کے نجی ذخیرہ کی صورت میں توشک خانہ واقع سٹی پیلس جے پور میں محفوظ ہے اس میں بھی شاہی فرامین، خریطے، پروانے وغیرہ ہیں اور جس طرح موجودہ مہاراجہ صاحب کے والد کی توجہ سے آمیر والے ریکارڈ پر سرجادو ناتھ سرکار نے کام کیا اسی طرح ان کے فرزند اور موجودہ "مہاراجہ بھوانی سنگھ" نے بھی اپنے کپڑ دوارے کے اہم ذخیرہ کی طبع و اشاعت کے خیال سے راقم الحروف کو تین سال تک اس ریکارڈ پر کام کرنے کا موقع دیا چنانچہ میں نے شروع سے آخر تک سارے ریکارڈ دیکھے اور اس کا ترجمہ بھی کیا حال ہی میں ڈاکٹر چندر منی سنگھ[2] جی صاحبہ اور جناب گوپال نرائن[3] بہورہ جی کی محنت سے یہ سب کام کتابی شکل میں "کیٹلاگ آف

---

[1] مہاراجہ مان سنگھ دویم میوزیم جے پور، سٹی پیلس جے پور میں واقع میوزیم ہے جس میں نمائش کے لیے اسلحہ جات اور دیگر عجیب و نفیس چیزیں رکھی ہیں اور اسی میں لائبریری اور اس سے متعلق دفاتر واقع ہیں اور پوتھی خانہ بھی اسی سے متعلق ہے۔ [2] موصوفہ نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے ایم۔اے کرنے کے بعد ہیں سے پی۔ایچ ڈی کی ڈگری لی اور امریکہ جا کر میوزیم کی تربیت حاصل کی مہاراجہ مان سنگھ دویم جے پور میں یہ اولاً رجسٹرار کے عہدہ پر مامور ہیں بعد میں مہاراجہ بھوانی سنگھ نے ان کو جے گڑھ کا ڈائریکٹر بنا دیا اور اب "جواہر کلا کیندر جے پور" میں ڈائریکٹر ہیں یہ بڑی علم دوست اور تاریخ و انگریزی زبان کی ماہر اور راجپوتی خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ [3] انکے بزرگوں کا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

[illegible] ان کپڑ دوارہ جے پور" کے نام سے انگریزی زبان میں باہتمام (Jai-
-garh Public charitable Trust Jaipur-Jaipur
Printers Private L.T.D. Jaipur) پریس سے شائع ہو چکا ہے۔

مہاراجگان جے پور سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں تمام بڑے شہروں میں اپنی علیحدہ آبادیاں قائم کر رکھی تھیں جن میں باغات۔ رہائشی مکانات اور زمینیں تھیں یہ سب جائداد عطیہ شاہی اور ان میں سے بعض خریدی ہوئی تھیں اور پورہ جات کے نام سے موسوم تھیں جو شہر کابل۔ پشاور۔ لاہور، اجین، اورنگ آباد، برہان پور، ایلچ پور، اسلام آباد (متھرا) بنارس، بیکنٹھ پورا بہار، جہانگیر پور (ڈھاکہ) الٰہ آباد، پورہ و باغ راحت بخش واقع دارالسلطنت شاہجہاں آباد، دہلی اور اکبرآباد آگرہ وغیرہ میں واقع تھے۔ ان پورہ جات سے متعلق شہر کابل، پشاور، لاہور، بنارس، پورہ و باغ راحت بخش واقع دارالسلطنت شاہجہاں آباد دہلی اور اکبرآباد وغیرہ کے شاہان وقت کے دیے ہوئے پروانہ جات آج بھی جے پور کے اسی ریکارڈ میں موجود ہیں۔

ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پورہ جات کی کثرت اورنگزیب (۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء) کے بعد ہوئی ہوگی۔ مان سنگھ[1] (۱۵۸۹ء سے ۱۶۱۴ء) اکبر اور جہانگیر کے

(بقیہ ص ۴۴۶) راج گھرانے سے تعلق رہا، اور یہ انگریزی، سنسکرت اور تاریخ کے بڑے عالم ہیں جو اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔
[1] یہ آمیر کا راجہ اور بھگونت داس کچھواہا راجہ آمیر کا بیٹا تھا۔ اکبر نے اسے فرزند کا خطاب دیا تھا اور یہ اس کے نورتنوں میں تھا، مان سنگھ ہندوستان کی جنگی تاریخ میں بڑا نامور اور مشہور ذی رتبہ اکبری میں ممتاز و سرفراز اور (بقیہ ص ۴۴۸)

اور جے سنگھ عرف مرزا راجہ (۱۶۲۲ء تا ۱۶۶۷ء) شاہجہاں کے دور کے بڑے طاقتور راجہ ضرور تھے لیکن ان کو اپنی ریاست اور اس کی ترقی کی طرف زیادہ توجہ دینے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔

اورنگ زیب کے زمانہ میں "مہاراجہ سوائی جے سنگھ" بھی اگرچہ شاہی خدمات

(بقیہ ص ۴۴۴) دلیر سپہ سالار ہوا ہے اس نے اکبر کی سلطنت کو بہت بڑھایا، مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک اس کونے سے اس کونے تک پورا ہندوستان بلکہ افغانستان اس کی جولانگاہ تھا۔ کابل اور بنگال کا صوبیدار رہا ہے اس کا منصب ہفت ہزاری تھا۔ ۹ سنہ جلوس جہانگیری مطابق ۱۰۲۳ھ میں بمقام بہار فوت ہوا ۔ یہ ہفت ہزاری منصب رکھتا تھا۔ ترکی عربی اور فارسی زبانوں سے واقفیت کے علاوہ سنسکرت میں مہارت رکھتا تھا اور اسی نے شواجی کو قابو میں کیا تھا اس کا بیٹا رام سنگھ ہوا ہے، ۱۰۸۰ھ میں برہانپور میں فوت ہوا۔ اورنگ آباد میں اس کا آباد کیا ہوا جے سنگھ پورہ تھا اور اکبر آباد آگرہ میں اس نے تعمیرات کرائیں یہ جگہ جے سنگھ پورہ کہلاتی ہے اسی نے وہاں ایک عمدہ باغ تیار کرایا تھا یہ راجہ شاہجہانی دور میں تھا اور عالمگیر کے زمانہ میں بھی اس نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ۱۶۶۴ء میں عالمگیر نے صوبہ جات دکن کی صوبیداری عطا کی ہے، اس کے باپ کا نام کشن سنگھ (ولد راجہ بشن سنگھ ولد راجہ رام سنگھ ولد مرزا راجہ جے سنگھ) مہاراجہ سوائی جے سنگھ سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں مشہور ارکان سلطنت میں تھا اورنگ زیب کے زمانہ سے لے کر محمد شاہ بادشاہ تک کے دور میں زندہ رہا۔ یہ علم دوست تھا۔ تمام ہندوستان کے عالم فاضل اور پنڈت اس کے علمی دربار میں موجود تھے اس نے شرح چغمنی وغیرہ کتب ہندسہ کا عربی زبان سے ہندی بھاشا میں ترجمہ کرایا اور محمد شاہ بادشاہ (بقیہ ص ۴۴۶ پر)

اندر وسیع سلطنت میں مصروف رہا اور اس کے ذریعہ اورنگ زیب کے زمانہ میں بہت اہم امور و معاملات انجام پائے لیکن اس نے طویل عمر پائی اور اورنگ زیب کے بعد "بہادر شاہ" (۱۷۰۷ء–۱۷۱۲ء) فرخ سیر (۱۷۱۳ء–۱۷۱۹ء) اور محمد شاہ بادشاہ (۱۷۱۹ء–۱۷۴۸ء) وغیرہ کے زمانے میں بھی اس کی اہم خدمات کا سلسلہ جاری رہا اس نے شاہی خدمات کے علاوہ بہت سے علمی[1] فنی[2] تعمیری اور اصلاحی[3] کام بھی انجام دیے۔ یہ راجہ بہت سوجھ بوجھ کا مالک اور بڑا مدبر و منتظم تھا اس نے اپنی ریاست کو بڑی وسعت دی اس نے محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں اس کی اجازت سے "شہر آمیر" کے قریب ایک حسین و خوبصورت شہر تعمیر کیا جس کا نام ابتدا میں "سوائی جے نگر" تھا بعد میں "جے نگر" ہوا اور آخر میں کثرت استعمال سے "جے پور" ہو گیا جو

(بقیہ ص ۴۴۵) کے نام پر زیج محمد شاہی تصنیف کی، اسی نے مرزا خیر اللہ بیگ جو کہ علم ریاضی کے بے نظیر عالم تھے کے ذریعہ جے پور، اجین، شاہجہاں آباد، دہلی، بنارس اور متھرا میں اجرام فلکی کے مشاہدہ کے لیے رصدگاہیں قائم کیں ۱۷۲۴ء ۱۷۳۲ء میں وہ مالوہ کا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۷۴۳ء میں وفات پائی۔ اس کا جانشین اس کا پسر راجہ ایسری سنگھ ہوا ہے [1] "زیج محمد شاہی" اس کا بین ثبوت ہے [2] شہر جے پور میں علم ہیئت اور علم فلکیات کے اعتبار سے عمارت "جنتر منتر" بنائی [3] اس راجہ نے رسم ستی کو بند کرنا چاہا اگرچہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوا اور اس کے مرنے کے بعد اس کی تین رانیاں ستی ہوئیں اور ستی کی رسم انگریزی دور میں بزمانہ مہاراجہ پرتاب سنگھ (۱۷۷۸ء–۱۸۰۳ء) ختم ہو سکی [4] مشہور بادشاہ "احمد شاہ درانی" جسے احمد شاہ ابدالی بھی کہا جاتا ہے نے ہندوستان آنے سے پہلے ایک خط راجہ مادھو سنگھ اول (۱۷۵۰ء–۱۷۶۸ء) کو لکھا جس میں اسے "راجہ جے نگر" لکھا ہے، اسی خط میں ابدالی نے ایران، توران (بقیہ ص ۴۴۷)

سابق ریاست کی راجدھانی اور اب راجستھان کی راجدھانی ہے۔ مہاراجہ سوائی جے سنگھ نے اس نئے شہر کی تعمیر کے بعد اس میں پوتھی خانہ بھی قائم کیا۔ جے پور کے کپڑ دوارہ کے ریکارڈ دیکھنے سے یہ بات بخوبی معلوم ہوتی ہے کہ راجگان جے پور کی جائدادیں ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا دائرہ "کابل تک وسیع تھا۔" مہاراجہ سوائی جے سنگھ" کے زمانہ اور اس کے بعد پورہ جات کے انتظام کے لیے علیحدہ علیحدہ وکیل اور مختار مقرر ہوا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں

(بقیہ ص ۴۴۶) فارس و خراسان کی مہمات سے فارغ ہونے کے بعد اپنے ہندوستان آنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے، یہ خط مرہٹوں کی مخالفت میں ہے، اس نے لکھا ہے کہ اپنے علاقوں اور مارواڑ سے انہیں نکال دیں اور پکڑ لیں۔ اس خط میں افغانوں اور راجپوتوں کی قدیم دوستی و محبت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں تاریخ ۷ محرم الحرام ۱۱۵۳ھ مطابق (۲۰ نومبر ۱۷۴۰ء) درج ہے۔ یہ خط کپڑ دوارہ جے پور کے ریکارڈ میں اپنی اصلی شکل میں آج بھی موجود ہے اور کیٹلاگ میں بہ نمبر ۱۹ انگریزی زبان میں ترجمہ و خلاصہ درج ہے اور اس کا فوٹو پلیٹ ۲۲ شامل ہے) لے شہر آمیر میں اگرچہ کتابوں کا ذخیرہ" بہت پہلے راجگان آمیر نے قائم کر رکھا تھا اور سابق راجگان نے بھی اس کو اس قدر اہمیت دی تھی کہ اس کی عمارت اپنی خواب گاہ کے قریب ہی رکھی جاتی اور اس کی دیکھ بھال راجہ کے خاص آدمی یا بھنڈار کے سپرد رہتی۔ مہاراجہ سوائی جے سنگھ نے جب نیا شہر جے پور آباد کیا تو کتابوں کا ذخیرہ اپنے محل سٹی پیلس میں رکھا اور اس کا نام "پوتھی خانہ" رکھ کر اس کے لیے علیحدہ محکمہ قائم کیا جو نایاب کتابوں کا ذخیرہ تھا، بلاشبہ پورے راجپوتانہ میں پوتھی خانہ کو غیر معمولی شہرت ہوئی۔

غالباً بزمانہ مہاراجہ رام سنگھ دوم (۱۸۳۵ء تا ۱۸۸۰ء) سب پورہ جات اور جائدادوں کے انتظام کے لیے یکجائی طور پر پورہ جات کا مستقل محکمہ علٰحدہ سے قائم ہوا اور حاکم پورہ جات علٰحدہ سے مقرر ہوا۔ راجستھان بننے کے بعد راج گھرانے جے پور کے پورہ جات کا محکمہ (غالباً) بغرض انتظام راجستھان سرکار کے سپرد ہوا اور مندروں کا انتظام دیوستھان کے سپرد ہوا۔ آراضی حویلی راجہ مان سنگھ (وہ زمین جس میں تاج محل تعمیر ہوا ہے) کے عوض جو مکانات و حویلیاں ملی تھیں اور دیگر جائدادیں معتمد کوٹھی آگرہ کے تحت تھیں جن کا تعلق محکمہ پورہ جات و ہوم ڈپارٹمنٹ سے تھا۔

آخر میں شاہجہاں بادشاہ کے اس فرمان کا ترجمہ اور خلاصہ پیش ہے جس میں راجہ جے سنگھ عرف مرزا راجہ کو آراضی حویلی مان سنگھ اکبرآباد کے عوض میں آگرہ میں چار حویلیاں معہ توابع و متعلقات ہمیشہ ہمیش کے لیے عطا ہوئیں اور جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اگرچہ راجگان جے پور کی جائدادیں اکثر عطیہ شاہی تھیں۔ اور اگرچہ راجہ جے سنگھ عرف مرزا راجہ نے اکبرآباد آگرہ کی اس جائداد کو اپنی رضامندی خوشی ممتاز محل کے مقبرہ کے لیے دے دی تھی پھر بھی چونکہ مقبرہ کی حیثیت ایک مذہبی نوعیت کی ہو جاتی ہے اس لیے شاہجہاں نے اسے بلاقیمت اور بلامعاوضہ لینا پسند نہیں کیا اور اس کے معاوضہ میں چار حویلیاں معہ توابع مرزا راجہ کو دینا ضروری سمجھا اور اس کے لیے فرمان کا اجرا ہوا۔

شاہ جہاں کا فرمان اور مرزا راجہ کو آگرہ میں چار حویلیاں

"کیٹلاگ آف ہسٹوریکل ڈاکومنٹس اِن کپڑدوارہ جے پور" میں اس فرمان کی

مصدقہ نقل موجود ہے جس کا نمبر ۱۶۶ و ۱۶۵ ہے اور اس فرمان کا خلاصہ انگریزی میں درج ہے اور اس فرمان کی فوٹو کاپی بہ نمبر ۴۲ شامل ہے۔ یہ فرمان سات تاریخ ماہ الٰہی سنہ ۶ مطابق ۲۶ جمادی الثانی ۱۰۴۳ھ (۱۸ دسمبر ۱۶۳۳ء) کو صادر و جاری ہوا۔ مقبرہ کے لیے حاصل کردہ زمین کے معاوضہ میں مندرجۂ ذیل چار حویلیاں مرزا راجہ کو آگرہ میں دی گئیں ان کے نام اس طرح درج ہیں۔

حویلی راجہ[1] بھگوانداس، حویلی مادھو[2] سنگھ، حویلی روپسی بیراگی[3] در محلہ بازار اتکہ خاں، حویلی چاند سنگھ ولد[4] سورج سنگھ در محلہ سابق' یہ چاروں حویلیاں معہ توابع و معہ متعلقات عطا ہوئیں۔ فرمان میں لکھا ہے کہ یہ چاروں حویلیاں داخل خالصہ شریفہ ہیں اور حویلی مان سنگھ کے معاوضہ میں جو کہ مطیع الاسلام راجہ جے سنگھ نے برضا و رغبت واسطے مقبرہ ملکہ نساء دوران خاتون نسوان زمان شرف بنات آدم و حوا مرحومہ مغفورہ مبرورہ "ممتاز محل بیگم" پیش کش کی ہے یہ چاروں حویلیاں ان مفخر الاعیان کی ملکیت میں سپرد ہیں اور چاہیے کہ تمام حکام، عمال، متصدیان، کوتوالان جو اب موجود ہیں یا آئندہ موجود ہوں اس حکم اقدس کے استقرار و استمرار میں کوشش کریں اور مذکورہ بالا حویلیاں ہمیشہ ہمیش ان ہی کے قبضہ و تصرف میں باقی رکھیں اور راجہ لائق الاحسان کی ملکیت اور قبضہ کو قوی رکھیں اور بلا شرط رکھیں اور کسی بھی طور سے مداخلت نہ کریں اور کسی طرح اس کے آس پاس کسی قسم کا عمل اور مداخلت نہ کریں اور اس سلسلہ میں نئے فرمان اور نئی سندیں طلب نہ کریں اور کسی طرح خلاف اور انحراف اختیار نہ کریں اور اپنی ذمہ داری سمجھیں۔ چونکہ شاہی سلطنت میں یہ دستور چلا آرہا تھا کہ فرمان جاری ہونے کے بعد تعمیل و تکمیل کی غرض سے وہ

کی امیر و عمدہ داران کے پاس جاتا اور کئی محکموں میں اس کا اندراج ہوتا اور عمل درآمد کی تکمیلات ہوتیں اور فرمان کے بموجب اور فرمان کے تحت سب تفصیلاً فرمان کی پشت پر بسلسلہ ضمن درج کی جاتی تھیں' ان سب تکمیلات اور سب مرحلوں سے گذرنے کے بعد فرمان کی تکمیل ہوتی۔

چنانچہ یہ سب تکمیلات اور اندراجات اس فرمان کی پشت پر درج ہیں۔ اس فرمان کی پشت پر جن امراء کے نام اور عبارت درج ہے اس میں عمدۃ الملک۔ رکن السلطنۃ القاہرہ موتمن الدولۃ الباہرہ اعتضاد الممالک العظیم اعتماد خلافت کبریٰ منتظم الدولۃ السامی جملۃ الملکی مدار المہامی "افضل خاں[1]" اور وزارت و اقبال پناہ جلال دستگاہ میر جملہ و اقبال پناہ جلال دستگاہ "مکرمت خاں[2]" اور نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان میر محمد یہ ہے کہ حکم جہاں مطاع شاع گردوں ارتفاع صادر ہوا ہے' کہ چاروں حویلیاں معہ توابع جو کہ داخل خالصہ شریفہ تھیں راجہ مان سنگھ کی حویلی کے عوض جو کہ عمدۃ الملک راجہ جے سنگھ نے اپنی رضا خوشی واسطے مقبرہ منورہ کے پیش کی ہیں وہ حویلیاں ہم نے مرحمت فرمادی ہیں۔ مطابق ملکیت راجہ کے مقرر

---

[1] اس کا نام ملا شکر اللہ تھا جو شیراز ایران سے آیا۔ بزمانہ شاہزادگی شاہجہاں شاہزادہ کے لشکر کا میر عدل ہوا۔ رانا کی مہم میں مصالحت کرائی تو دیوانی شاہزادہ سے امتیاز حاصل کیا۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد میر سامانی کے عہدہ پر ممتاز ہوا اور دوسرے سال دیوانی کل کے عہدہ پر سرفراز ہوا۔ شاہجہاں کے عہد کے گیارہویں سال ہفت ہزاری کا منصب پایا۔ ۱۲ ار مضان ۱۰۴۹ھ م ۱۶۳۹ء میں وفات پائی[2] شاہجہانی دور کے امراء میں سے ہیں۔ ان کا ذکر کئی مقامات پر ملتا ہے۔

اور مسلم رکھیں بطور یادداشت لکھی گئی۔ تفصیل جملۃ الملکی مدار المہامی یہ بات ہے کہ اس کو واقعات میں داخل کریں۔ مقرب الحضرت السلطانی یہ مہر صادق خاں[1] یہ ہے کہ قواعد سلطنت اور ضوابط معدلت جہانبانی قدوۂ خوانین بلند مکان عمدہ عالی شان جملۃ الملکی مدار المہامی افضل خاں یہ ہے کہ فرمان عالی شان لکھیں۔

یہ سب عبارت فارسی زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ فرمان مرور زمانہ سے کہیں کہیں سے شکستہ و بوسیدہ ہوگیا ہے اور بعض الفاظ پڑھنے میں نہیں آتے لیکن چونکہ ساتھ ہی دوسری نقل مصدقہ بھی موجود ہے اس لیے دونوں کے مقابلہ سے فرمان بہت حد تک پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

---

[1] محمد صادق نام لیکن صادق خاں سے مشہور ہیں۔ پیدائش ایران میں ہوئی۔ شاہجہاں کے دور میں بخشی رہے۔ شاہجہاں کے دوسرے بیٹے شہزادہ شجاع کے اتالیق بھی رہے وقائع نویس بھی تھے شاہجہاں کے وفاداروں میں شمار ہوتا ہے۔

ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، حصہ ثانی

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخدلی، انسان دوستی اور خاص طور پر ہندو نوازی کی تفصیل مستند ماخذوں اور معاصر تاریخوں کے حوالہ سے بیان کی گئی ہے، پہلے حصہ میں مغلیہ حکومت سے پہلے کے سلاطین، دوسرے میں بابر سے شاہجہاں کے عہد تک اور تیسرے حصہ میں اورنگزیب عالمگیر اور اسکے بعد کے مغل بادشاہوں کی تفصیلات ہیں۔

قیمت حصہ اول ۳۰/- دوم ۴۵/- سوم ۳۰/-　　"منیجر"

بلغاریا — آئینہ ایام میں

از: محمد عارف اعظمی عمری۔

"مجلہ الفرقان، کویت بابت ماہ اپریل ۱۹۹۲ء میں بلغاریا پر ایک معلوماتی مضمون شایع ہوا ہے، اس میں اس موضوع کی دوسری کتابوں کی مدد سے مزید ضروری باتوں کا اضافہ کرکے یہ مضمون قارئین معارف کے لیے پیش کیا جاتا ہے"۔ (عارف)

بلغاریا مشرقی یورپ کا ایک اہم ملک ہے، اس کے افق پر ترک فرماں رواؤں کے زمانے میں آفتاب اسلام نے ضیا پاشی کی، لیکن آل عثمان کے بعد وہ ایک خالص سلاوی اسٹیٹ بن گیا اور آخر میں کمیونزم نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اب ۱۹۸۹ء میں اسے آزادی نصیب ہوئی ہے، بلغاریا کا پس منظر جاننے کے لیے پہلے ترکوں کے بارے میں کچھ جاننا ضروری ہے،

ترک قوم | ترک خانہ بدوش قوم تھے، ان کی اصل جولان گاہ مشرقی اور وسط ایشیا تھے، لیکن مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کے باشندے بھی ان کی غارتگری سے مامون نہیں تھے، چھٹی صدی عیسوی میں انھوں نے اپنی ایک زبردست سلطنت قائم کرلی تھی جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس سلطنت کے بانی کا نام چینی تاریخوں میں تومین (Tumen) اور ترکی کتبوں میں بومین (Bumin) درج ہے،

ترک اور اسلام ترک پہلی صدی ہجری میں ولید بن عبد الملک کے عہد خلافت میں اسلام سے روشناس ہوئے، اسی عہد میں حضرت قتیبہ بن مسلمؒ نے ترکوں کے علاقوں بخارا، سمرقند، بیقند، خوارزم (خیوا) فرغانہ، شاش (تاشقند) اور کاشغر کو فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے عہد خلافت میں عبداللہ بن معمر الیشکری کو دعوت اسلام کے لیے ماوراء النہر بھیجا جس کے نتیجے میں بعض قبیلے مسلمان ہوئے اور خلیفہ ہشام کے عہد میں ابو صیدا کی تبلیغ سے ماوراء النہر میں اسلام کی عام اشاعت ہوئی۔

ترکوں کا عروج عباسی عہد میں معتصم باللہ خلیفہ ہوا، اس کی ماں ترک نژاد تھی، اس لیے قدرتاً اس کا رجحان ترکوں کی جانب زیادہ ہو گیا تھا، چنانچہ اس نے بغداد سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر ترکوں کے لیے ایک فوجی چھاؤنی بنوائی تھی جو سامراء کے نام سے ایک مشہور شہر بن گیا اور مدتوں آل عباس کا پایۂ تخت رہا۔

معتصم کی ترک نوازی سے رفتہ رفتہ ترک شہزادے اور امراء ترکستان چھوڑ کر سامراء میں آباد ہونے لگے، جن میں بعض بت پرست اور بعض آتش پرست بھی تھے، دار الخلافہ میں رہنے سے غیر مسلم ترکوں میں بھی اسلام پھیلنے لگا۔ اس کے نتیجہ میں ماوراء النہر کے ترکوں میں بھی جو اپنے وطن ہی میں مقیم تھے اسلام کی کافی اشاعت ہوئی اور رفتہ رفتہ حکومت میں بھی ان کا اثر و رسوخ بڑھا اور اقتدار میں بھی وہ دخیل ہو گئے۔

ترکوں کی حکمرانی اور سلطنت عثمانیہ خلافت عباسیہ کے عہد زوال میں مختلف صوبوں کے گورنروں نے اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لی تھیں، اسی طرح ترکوں نے بھی مصر میں طولونیہ اور اخشیدیہ، ترکستان میں ایلکیہ افغانستان و ہند میں غزنوی سلطنت

کی بنیاد ڈالی ان کی بیشتر خود مختار حکومتیں تیسری صدی کے وسط سے چوتھی صدی کے وسط تک قائم ہو چکی تھیں، پانچویں صدی ہجری میں ترکوں کے ایک گروہ نے خراسان میں دولت سلجوقیہ کا سنگ بنیاد رکھا، اسی سلجوقی حکومت کے ایک معمولی سپاہی ارطغرل نے اپنی شجاعت اور جوانمردی کی بنا پر نمایاں کامیابی حاصل کی، اسی کے بڑے بیٹے عثمان خاں دولت عثمانیہ کے بانی اور پہلے تاجدار ہوئے۔

بلغاریا پر سلطنت عثمانیہ کی فوجکشی

بلغاریا میں سب سے پہلے سلطنت عثمانیہ کے فرماں روا مراد اول نے فوجکشی کی، سنہ ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء میں اس نے درہ دانیال کو عبور کرکے مشرقی یورپ میں فتوحات کا ایک حیرت انگیز سلسلہ شروع کیا، اس وقت بلغاریا میں بیزنطی حکومت قائم تھی، اس سے ترکوں کی سخت معرکہ آرائی ہوئی، بالآخر سنہ ۷۸۳ھ/۱۳۸۲ء میں مراد کے فوجی جنرل لالہ شاہین نے صوفیا کے قریب سماکوف کے میدان میں بیزنطی فوجوں کو شکست فاش دے کر کوہ بلقان تک کا سارا علاقہ سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا۔

سنہ ۷۹۵ھ/۱۳۹۳ء میں مراد اول کے لڑکے بایزید یلدرم نے بلغاریا پر دوبارہ فوجکشی کی اور اس کے پایۂ تخت ترانو پر قبضہ کرکے پورے ملک کو سلطنت عثمانیہ کے حدود میں داخل کر لیا، اسی کے بعد بلغاریا اسلامی حکومت کے زیر نگیں ہو گیا اور وہاں کثیر تعداد میں ترک آباد ہونے لگے۔ اس طرح اسلام کی بھی وہاں خوب نشر و اشاعت ہوئی، لیکن واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بلغاریا میں نہ عیسائیوں کو کبھی جبراً اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ ہی انہیں ترک وطن کے لیے مجبور کیا گیا، بلکہ انکے ساتھ مکمل مذہبی رواداری رکھی گئی، پورے ملک میں تقریباً پانچ صدیوں تک اسلام کا پرچم لہراتا رہا۔ لیکن نہ عیسائیوں کا بال بیکا ہوا اور نہ ان کی عبادتگاہوں سے

کوئی تعرض کیا گیا بلکہ انہیں اپنے مذہبی رسوم ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل تھی۔

بلغاریا میں صلیبی اتحاد اور مشرقی تجویز

سلطنت عثمانیہ کے تنزل اور اختلال نے یورپ کے حوصلے بہت بلند کردیے، چنانچہ اس نے ترکی کے خلاف ایک مذہبی جنگ کا اعلان کیا، جس میں سلطنت عثمانیہ کی مغربی سرحدوں پر واقع عیسائی حکومتوں نے نمایاں حصہ لیا اور اس کے لیے ان کا ایک مقدس اتحاد بھی ۱۶۸۴ء میں قائم ہوا، جس میں ابتدا میں آسٹریا، پولینڈ، وینس اور مالٹا شریک تھے۔ اور ۱۶۸۶ء میں روس بھی اس اتحاد میں شامل ہوگیا۔

روس کے ایک فوجی کمانڈر میونخ نے زار کو یہ باور کرایا کہ سلطنت عثمانیہ کی عیسائی رعایا کی تعداد مسلمان حکمرانوں کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہے اور وہ ترکی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہے، جس کے لیے اُن کی نگاہیں زار روس کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ میونخ کی اس تجویز کو مشرقی تجویز (Oriental Project) کا نام دیا گیا اور زار کی ہدایت کے مطابق عثمانی سلطنت کے یورپین صوبوں میں روسی جاسوس بھیجے جانے لگے تاکہ وہ وہاں کی عیسائی رعایا کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرسکیں، چنانچہ بلغاریا میں پیٹر اعظم کے زمانہ ہی سے روس کے خفیہ جاسوسوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

جمعیت سلاوی

روس کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعہ اندرون ملک خانہ جنگی کا ماحول پیدا کرتا ہے پھر کمزور جماعت کی حمایت کے بہانہ وہ اس میں دخل اندازی شروع کردیتا ہے اور جب خود اس کی پیدا کردہ بدامنی جڑ پکڑ لیتی ہے تو قیام امن کے دعویٰ کے ساتھ وہ اپنی فوجیں اس ملک میں

داخل کرکے اس پر قابض ہو جاتا ہے، کیتھرائن کے عہد میں پولینڈ کی جنگ سے لیکر حالیہ افغانستان کی جنگ تک روس اپنی اس پالیسی کو دہراتا رہا ہے، بلقان یا اور اس کی متصل ریاستوں پر قبضہ کرنے کے لیے بھی اس نے یہی حربہ اختیار کیا چنانچہ اسی مقصد سے اس نے ۱۸۴۰ء میں جمعیت سلاوی (Pan Slavism) کی تشکیل کی اس جمعیت نے پہلے سلاوی قوموں کے اندر روسی ادب اور لٹریچر کی نشر و اشاعت شروع کی ان کے ایجنٹ خفیہ اور علانیہ طور پر ان علاقوں میں جا کر لوگوں کو سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کرتے تھے جمعیت کے خرچ پر سلاوی قوموں کے بچے روس بھیجے جاتے تھے، جہاں جمعیت کی طرف سے قائم کردہ مدارس میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ جب تعلیم سے فراغت کے بعد بچے واپس آتے تو جمعیت کے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لیے اپنے شہروں میں مدرسے قائم کرتے، غرض اس طرح جمعیت کے ارکان روسی حکومت کی پشت پناہی میں بلقان کے تمام شہروں میں پھیل گئے وہ وہاں کے باشندوں کی مالی مدد کرتے اور خفیہ طور پر ان کے لیے فوجی سامان بھی بہم پہونچاتے تھے، رفتہ رفتہ بلقان کے عیسائی جمعیت سلاوی کے مطیع ہو گئے اور وہ علم بغاوت بلند کرنے کے لیے بس روس کے اشارہ کے منتظر تھے۔

۱۸۶۷ء میں اتحاد سلاوی کی ایک عظیم الشان کانگریس سائنٹیفک انجمن کے نام سے ماسکو میں منعقد ہوئی، جس میں ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس کا صدر مقام ماسکو کو بنایا گیا اور ایک ذیلی کمیٹی قسطنطنیہ میں قائم کی گئی۔

سلطنت عثمانیہ کی روس سے آویزش | روس نے بلقان کی سلاوی ریاستوں میں ایک طرف

یہ خفیہ جال بچھا رکھا تھا، دوسری طرف اس نے آسٹریا کو اپنا ہمنوا بنا کر سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیا، یہ حملہ گو مختصر تھا مگر اس میں بڑی قتل و غارتگری کی گئی، مورخ کریسی کا بیان ہے کہ "روسی فخر کرتے تھے کہ اس مختصر سے حملہ میں انھوں نے چھ ہزار مکانات، اڑتیس مسجدیں، دو گرجے اور پچاس چکیاں جلا ڈالیں" سلطنت عثمانیہ کے ساتھ روس کی یہ آویزش پیٹر اعظم کے عہد سے لے کر کیتھرائن کے عہد تک برابر جاری رہی۔

بلغاریا کا قومی کلیسا اور جنرل اگناتیف سنہ ۱۸۶۰ء میں بلغاریا میں ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کے بعد میونخ کی مشرقی تجویز کی منزل آسان ہو گئی، اسوقت جنوبی مشرقی یورپ کی تمام عیسائی رعایا جو سلطنت عثمانیہ کے زیر حکومت تھی، یونانی کلیسا کے ماتحت آرتھوڈاکس مذہب کی پابند تھی، مگر جب روس کی خفیہ ریشہ دوانی سے بلغاریا میں وطنی اور نسلی جذبات بیدار ہوئے تو وہاں کے عیسائیوں کو اپنا مستقل قومی کلیسا قائم کرنے کی فکر ہوئی، یونانی کلیسا کے بطریق اعظم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے بلغاریا والوں کو کچھ مخصوص مراعات دے کر راضی کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوئے بلکہ آرتھوڈاکس مذہب ہی کو خیرباد کہہ کر رومن کیتھولک مذہب کو اختیار کرنے کے لیے آمادہ ہو گئے اور اسکے متعلق انھوں نے پوپ سے گفتگو بھی شروع کر دی۔

اس وقت سلطنت عثمانیہ انحطاط سے دوچار تھی اور اس پر روس کا دباؤ بھی کافی بڑھ چکا تھا، روس نے سلطنت عثمانیہ سے یہ معاہدہ کر لیا تھا کہ اسکا

ایک سفیر باب عالی میں رہا کرے گا، چنانچہ ان دنوں وہاں کا روسی سفیر جنرل اگناتیف تھا جو بہت ہی شاطر اور جمعیۃ سلاوی کا رئیس اعظم تھا۔ اس کے بارہ میں ترک مورخ احمد صائب بک نے لکھا ہے کہ "اگناتیف وہ شخص ہے جس نے مشرق ادنی میں سیاست روس کی ترویج میں سب سے زیادہ حصہ لیا،

بلغاریا کے اس ہنگامہ اور انتشار سے روس نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے بلغاری باشندوں سے یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کے لیے ایک مستقل کلیسا قائم کرنے کے لیے سلطنت عثمانیہ پر دباؤ ڈالے گا، چنانچہ جنرل اگناتیف نے بلغاریا والوں کی درخواست اپنی سفارشات کے ساتھ سلطان عبدالعزیز کے پاس بھیجی بدقسمتی سے سلطان اور اس کے وزار بھی جنرل اگناتیف سے بہت متاثر تھے۔ علاوہ ازیں وہ خود بلغاریا والوں کی وطنی اور نسلی تحریک کو ترقی دینا چاہتے تھے تاکہ بلقان میں یونانیوں کی حریف ایک مضبوط قوم پیدا ہو جائے لیکن اگناتیف کا اصلی مقصد یہ تھا کہ بلغاری قوم کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہو جائے جو آئندہ روس کے زیر سایہ رہے۔

۱۰ مارچ ۱۸۷۰ء کو سلطان عبدالعزیز نے ایک فرمان جاری کر کے بلغاریا کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر لی اور اس کے لیے ایک آزاد قومی کلیسا قائم کرنے کی اجازت بھی دے دی اس کے بعد ہی بلقان میں ایک جدید قومیت کی بنیاد پڑ گئی اور بلغاریا جو صدیوں سے مملکت اسلام کے زیر سایہ تھا وطنی اور نسلی بنیاد پر ایک مملکت بن گیا اور یہ سارا کارنامہ روسی سفیر اگناتیف کی کوششوں سے انجام پایا۔

ایک عظیم سازش | حقیقت یہ ہے کہ بلقان کی تمام شورشیں روس کی ایک منظم

تحریک اور منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھیں، چنانچہ جمعیۃ سلاوی کے ارکان نے اپنی خفیہ کمیٹیوں کے ذریعہ بلغاریا کے عیسائیوں اور مسلمانوں کو برانگیختہ کرکے ان کے مابین فرقہ وارانہ تصادم برپا کرا دیا جس کو مغربی پریس نے عیسائیوں کے اوپر ظلم قرار دیکر اسے خوب اچھالا اور اس طرح مغربی یورپ کو سلطنت عثمانیہ کے معاملات میں مداخلت کا موقع فراہم ہوگیا۔

معاہدہ برلن بالآخر روس اور سلطنت عثمانیہ کے درمیان ایک سخت معرکہ بپا ہوا جس میں بلغاریا کو میدان جنگ بنایا گیا، اس جنگ کے نتیجہ میں ۳ مارچ ۱۸۷۸ء کو سان اسٹیفانو کے نام سے ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے بلغاریا کو ایک باجگزار خود مختار ریاست کا درجہ دیدیا گیا، پھر ۱۳ جون ۱۸۷۸ء کو مشہور تاریخی معاہدۂ برلن وجود میں آیا جس میں یہ قرار پایا کہ بلغاریا کے فرماں روا کا انتخاب وہاں کے باشندے خود کریں گے اور اس کا تقرر دول عظمیٰ کی منظوری کے بعد سلطنت عثمانیہ کی طرف سے عمل میں آئے گا۔

درحقیقت معاہدۂ برلن یورپ میں سلطنت عثمانیہ کے خاتمہ کا پیش خیمہ تھا اب محض ایک رسمی سا تعلق باقی رہ گیا تھا اور وہ بھی جلد ہی ختم ہوگیا چنانچہ ۳ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو بلغاریا کے والی فرڈیننڈ (Ferdinand) نے اس کی مکمل خود مختاری کا اعلان کرکے "زار" کا لقب اختیار کرلیا اور اس وقت سے بلغاریا ایک خالص سلاوی اسٹیٹ بن گیا۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران بلغاریا ترکی اور جرمنی کا حلیف تھا، ۱۹۳۲ء میں

وہاں فوجی انقلاب آیا اور دوسری جنگ عظیم میں وہ نازی جرمنی کے ساتھ جڑ گیا
یکم ستمبر ۱۹۴۴ء کو روسی افواج نے بلغاریا پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کر لیا تاہم اقتدار
وہاں کے مقامی باشندوں کو حاصل رہا، لیکن ۱۹۴۷ء کے آغاز میں کیمونسٹوں نے
اقتدار پر بھی قبضہ جما لیا اور کیمونسٹ بلغاریا کے پہلے لیڈر اور صدر جارج دمیتروف
مقرر ہوئے، جس نے یہ اعلان کیا کہ ارض بلقان صرف بلقانی باشندوں کی ہے،
یہاں سے عثمانیوں کے تمام نشانات و آثار ختم کر دینے چاہئیں، ۱۹۵۴ء میں
دمیتروف قتل کر دیا گیا اور اس کی جگہ تیدور جیکوف بلغاریا کا حکمراں مقرر ہوا،
اس شخص نے انتہائی سفاکی اور بے رحمی کے ساتھ حکومت کی یہاں تک کہ ۱۰ نومبر
۱۹۸۹ء میں بلغاریا سے کیمونزم کا جنازہ ہی نکل گیا۔

کیمونسٹ عہد حکومت میں بلغاریا کے مسلمانوں کا حال زار

کیمونزم انقلاب کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بلغاریا کے تمام باشندوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا خواہ وہ
مسلمان ہوں یا عیسائی، ترکی ہوں یا بلغاری لیکن دعوی تو کچھ ہوتا ہے اور عمل کچھ
اور ہوتا ہے، چنانچہ بلغاریا میں کیمونزم کا تختۂ مشق مسلم اقلیت ہی زیادہ بنی،
کیونکہ ان کے خلاف صلیبی بغض و عناد اور کیمونزم کی مخالفت کا غیظ و غضب دونوں
جمع ہو گیا تھا، چنانچہ بلغاریا میں مسلمانوں کی آراضی قومی ملکیت میں لے لی گئیں اور
ان سے کہا گیا کہ وہ محض بلغاری بن کر رہیں، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں
کو ہجرت کے لیے مجبور کر دیا جائے جس کے لیے بلغاریا نے ترکی سے ایک معاہدہ
بھی ۱۸ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو کر لیا جس کی رو سے بلغاریا کے مہاجر مسلمان ترکی میں پناہ
گزین ہو سکتے ہیں، غرض سن ۱۹۵۰ء میں بلغاریا سے باون ہزار بلغاری مسلمان

ہجرت کر کے ترکی چلے گئے پھر دوسرے سال ۱۹۵۱ء میں ایک لاکھ چون ہزار مسلمانوں نے اپنے وطن کو خیرباد کہا، ان مہاجرین میں بمشکل گیارہ فیصد اپنی مرضی سے ہجرت کر کے گئے تھے، باقی تمام لوگ ظلم و استبداد سے تنگ آکر ہجرت کے لیے مجبور ہوئے تھے، یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مہاجرین میں صرف ڈھائی فیصد لوگ ہی اپنی املاک و جائداد کو مناسب قیمت پر فروخت کر سکے تھے۔ اسکے بعد متواتر بلغاریہ مسلمان ہجرت کرتے گئے، جولائی ۱۹۸۹ء میں وہاں سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئی، اس دفعہ انکی تعداد تین لاکھ تھی، ان کی جائداد و املاک بھی ان سے چھین لی گئی تھی، ذیل کے نقشہ سے بلغاریا کے مسلمان شہدا اور مہاجرین کا اندازہ ہوگا اس میں معاہدہ برلن کے وقت روس سے آویزش اور جنگ بلقان کے شہدا کا بھی تخمینہ درج ہے

سنین	تعداد شہدا	تعداد مہاجرین
۱۸۷۷ء - ۱۸۷۸ء	چار لاکھ پچاس ہزار	پندرہ لاکھ
۱۸۸۳ء	—	دو لاکھ
۱۸۸۴ء	—	چھ لاکھ
۱۸۹۳ء تا ۱۹۰۲ء	—	ستر ہزار
۱۹۱۲ء - ۱۹۱۳ء	دو لاکھ	دس لاکھ
۱۹۲۳ء - ۱۹۳۹ء	—	دو لاکھ
۱۹۴۰ء - ۱۹۴۹ء	—	بیس ہزار
۱۹۵۰ء	—	باون ہزار

سنین	تعداد شہدا	تعداد مہاجرین
۱۹۵۱ء	—	ایک لاکھ دو ہزار
۱۹۵۲ء تا ۱۹۸۰ء	—	ایک لاکھ تیس ہزار
۱۹۸۹ء	—	تین لاکھ

بلغاریہ قومیت کا نعرہ | ۱۹۴۴ء سے بلغاریا کی کمیونسٹ حکومت نے قومیت کا نعرہ دیا۔ جس کا اصل مقصد مسلمانوں کا امتیازی تشخص ختم کر کے ان کو غیر مسلم بنانا تھا درا صل قومیت کا نعرہ ہی بہت خطرناک اور شر انگیز ہے مگر بدقسمتی سے یہی وبا بیشتر اسلامی ممالک میں پھیلی ہوئی ہے، جبکہ یہ باطل نعرہ اسلام اور حقوق انسانی دونوں کے منافی ہے، بالخصوص اسلام تو تمامتر آزادی و حریت کا داعی اور جبر و تشدد کا مخالف ہے، اس کا یہ اعلان عام ہے کہ :

لا اکراہ فی الدین — دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں۔

چنانچہ بلغاریا والوں میں جب سے قومیت و وطنیت کی آگ بھڑکی ہے اسی وقت سے ان کے دلوں میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف غم و غصہ کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں، وہ عثمانیوں کے تمام آثار مٹانے کے درپے ہوگئے ہیں اور یہ آثار کیا تھے ؟ ۱۔ بلغاریا کے باشندے جن کی اکثریت مسلمان تھی، ۲۔ زبان۔ ۳۔ مساجد۔ ۴۔ نام۔ ۵۔ اسلامی عہد کی آبادیاں۔ ۶۔ علماء۔ ۷۔ کتابیں۔ ۸۔ مدارس اور میوزیم۔

قومیت کے اس بھیانک تصور کو اپنا کر حسب ذیل اقدامات کیے گئے۔

۱- بلغاریا کے مسلمان باشندوں کو پُر مشقت اور زحمت طلب کاموں پر مامور کرنا مثلاً سڑک، پل اور بندھ کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی وغیرہ۔

۲- ان کے اسلامی ناموں کی تبدیلی تاکہ امتداد زمانہ سے وہ اس کو بھول جائیں کہ کبھی وہ یا ان کے آبا و اجداد مذہب اسلام کے پیرو کار تھے۔

۳- اسلامی عہد کے آثار و نشانات کا انہدام، ۱۹۵۶ء میں شہر بلوندیف میں فوج نے حمام کی عمارتوں کو ڈھا دیا، شہر شومنو میں مسجدیں، مدرسے اور وہاں کے شہرت یافتہ حمام کی عمارتیں زمین بوس کر دی گئیں، شہر بازار اور زلاتوقراد کی تمام مساجد توڑ دی گئیں، شہر استارہ زارہ کی تمام مسجدیں، مدارس، اسلامی مکاتب اور مقبرے مسمار کر دیے گئے، غرض بلغاریا میں تقریباً بارہ سو مسجدیں معدوم کر دی گئیں اور اب صوفیا جیسے اسلامی شہر میں صرف تین مسجدیں باقی بچی ہیں، جن میں ایک میوزیم بنا دی گئی ہے اور دوسری کو کلیسا میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور تیسری مقفل ہے۔

۴- ۱۹۵۸ء میں بلغاریا کے تمام اسلامی مدارس کو قومی تحویل میں لے لینا، مذہبی علوم کی تعلیم کو ممنوع قرار دینا اور ترکی زبان کو جو کہ بلغاریا کے ترک باشندوں کی مادری زبان تھی ثانوی حیثیت دے کر بے جان کر دینا۔

۵- عوام میں فنون ادب کو فروغ دے کر حکومتی سطح پر مذہب اسلام اور مسلمانوں کی تحقیر و مذمت اور اس کے بالمقابل بلغاری کمیونسٹ معاشرہ کی تحسین و حوصلہ افزائی کرنا اور اس کو رجعت پسندی، فتنہ و فساد اور سستی و کاہلی سے پاک معاشرہ قرار دینا اور .... ان تمام امور کو

اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ ثابت کرنا اور یہ کہنا کہ روزہ سے افزائش نسل متاثر ہوتی ہے اور حج سے مختلف امراض اور وبائیں ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہونچتی ہیں، غرض مذہب اسلام کو مکمل طور پر مجروح کرنے کی کوشش۔

۶۔ ائمہ مساجد، واعظین اور اسلامی مدارس کے طلبہ واساتذہ کی تحقیر، اسلامی شعائر مثلاً کرتا پائجامہ اور پردہ وغیرہ کا مذاق اڑانا۔

۷۔ ان اہل قلم کی حوصلہ افزائی جو اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑاتے تھے، ایسے ڈرامے تیار کرنا جو اسلامی اخلاق اور عثمانی سلطنت کے تمسخر پر مبنی ہوں اور اسلام واسلامی تعلیمات کو رجعت پسندی اور بلغاریا کی عدم ترقی کا باعث بتانا۔

۸۔ مسجدوں میں نماز پڑھنے، ترکی زبان بولنے، اسلامی احکام وآداب کی ادائیگی اور مذہبی جلسوں کی ممانعت اور ان سب کا قابل مواخذہ جرم ہونا۔

۹۔ مسلمان بچوں کے ذہنی تنقیہ (برین واشنگ) کے لیے انکو غیر ممالک میں بھیجنا تاکہ وہ لوٹ کر اپنے معاشرہ میں بے دینی اور لامذہبیت کو فروغ دیں۔

۱۰۔ فوج، پولیس اور اس طرح کے دوسرے اہمیت کے حامل محکموں اور کلیدی عہدوں سے مسلمانوں کو محروم رکھنا اور انہیں گھٹیا اور پست کاموں پر مامور کرنا جیسے جھاڑو لگانا، برتن صاف کرنا، یا اس طرح کے دوسرے حقیر کام ان کے سپرد کرنا۔

۱۱۔ مسلمان بچوں کو تعلیم سے محروم رکھنا، چنانچہ بمشکل ۴۔۵ ہزار مسلم طلبہ یونیورسٹی کی سطح پر زیر تعلیم ہیں۔

۱۲۔ مسلم معاشرہ میں خوف وہراس اور شک وشبہ پیدا کرنا اور انکے

لیے جاسوسی و سراغرسانی کو فروغ دینا، حد یہ ہے کہ اس معاشرہ میں باپ اپنے بیٹے سے خائف اور شوہر بیوی سے چوکنا رہتا۔

۱۱۔ مسلمانوں کے درمیان نسلی اور لسانی اختلافات کو ہوا دے کر ان کو ایک دوسرے سے متصادم کر دینا۔

۱۹۵۰ء سے بلغاری قومیت کا رجحان خطرناک حد تک آگے بڑھ گیا تھا اور اس کو کمیونزم کے فروغ کا ایک اہم وسیلہ بنالیا گیا تھا، چنانچہ تاریخی حقیقت کے کے نام پر ایسی کتابیں شایع کی جانے لگیں جن میں بلغاری مسلمانوں کو یہ باور کرایا جاتا کہ ان کے آباء و اجداد نے عثمانیوں کی تلواروں کے ڈر سے اسلام قبول کر لیا تھا، اس لیے اب وہ اس مذہب کو ترک کر دیں اور اگر کوئی شخص اس سے انکار کرتا تو اس کو بھرے مجمع میں گولی مار دی جاتی تھی۔

غرض بلغاری قومیت کے نام پر بلغاریا کے مسلمانوں پر ظلم و ستم کے وہ پہاڑ توڑے گئے کہ صوفیا میں متعین سوویت یونین کے سفیر نے کہا کہ :

"بلغاری قومیت کا نعرہ ہی وہ کامیاب طریقہ ہے جس سے کمیونزم کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے اور اس نظریہ کو تمام کمیونسٹ ملکوں میں اختیار کیا جانا چاہیے"

غرض کمیونسٹ عہد حکومت میں بلغاریا کے مسلمانوں پر بڑے مظالم ہوئے اور یہ دراصل صلیبی بغض و عناد کی بنیاد پر ہوا اور درحقیقت کمیونزم صلیبیت ہی کا ایک مکروہ چہرہ ہے، تاہم بلغاریا میں اس قدر ظلم و ستم کے باوجود حقیقت پسند مبصرین کا کہنا ہے کہ بلغاریا کی نصف آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے جس کو بلغاریا کے روشن مستقبل کی ایک واضح علامت کہا جا سکتا ہے۔

بلغاریا کی موجودہ مسلم آبادی | بلغاریا کی موجودہ مسلم آبادی مختلف نسلوں سے تعلق رکھتی ہے جن کی تعداد بیس سے زیادہ بتائی جاتی ہے، ان میں سے چند اہم اور قابل ذکر ہیں:

۱- ترک:- انکی تعداد اکیس لاکھ چونسٹھ ہزار ہے۔

۲- پومک:- یہ بلغاریا کے وہ اصلی باشندے ہیں جنھوں نے اسلام قبول کرلیا تھا، ان کی تعداد دس لاکھ ہے۔

۳- مکادون:- یہ ایک خانہ بدوش قوم ہے اور ترکی زبان بولتی ہے، ان کی آبادی سات آٹھ لاکھ کے قریب ہے۔

۴- النور:- ان کی آبادی تقریباً چار لاکھ پچاس ہزار مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

۵- تاتاری:- یہ تقریباً ایک لاکھ مسلمان ہیں۔

۶- ارناؤط:- یہ تقریباً پچاس ہزار مسلمان ہیں۔

اخبار علمیہ

یورپ، خصوصاً برطانیہ میں اسلام کے پیغام کو عام کرنے کی مساعی اور کوششیں قابل ستائش ہیں، گذشتہ دنوں لندن سے انگریزی زبان میں دو مذہبی رسالے "سبل السلام" اور "مائی سسٹر" موصول ہوئے، صوری محاسن کے ساتھ یہ تفسیر، حدیث، سیر صحابہؓ، ائمہ سلف کے سوانح اور اسلامی شاعری کے پاکیزہ انتخاب سے مزین ہیں، سبل السلام کے پہلے شمارہ کا زیادہ حصہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ کے افادات پر مشتمل ہے، خواتین کے رسالہ مائی سسٹر کے پہلے شمارہ میں حضرت حلیمہؓ اور بعض امہات المومنینؓ کا تذکرہ ہے، قرآن مجید اور غیبت و تفاخر پر بھی مضامین ہیں۔

برطانیہ میں اردو زبان و ادب سے تعلق واقعتاً کی خبریں بھی خوش آئند ہیں، "اخبار اردو" اسلام آباد کے تازہ شمارہ سے معلوم ہوا کہ بین الاقوامی سطح پر برطانیہ شاید واحد ملک ہے جہاں اردو، اسکولوں کے نصاب کا ایک لازمی حصہ ہے، صرف بریڈفورڈ میں تقریباً پانچ ہزار بچے اردو کی تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں انگریز بچے بھی شامل ہیں، خوشی کی بات ہے کہ ان اردو سیکھنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، ادبی و ثقافتی اعتبار سے بعض تنظیمیں مثلاً اردو سنٹر، اردو مرکز، بفیض کلچرل اکیڈمی، اردو مجلس، ترقی پسند مصنفین، حلقہ ارباب ذوق، حیدرآبادی

سوسائیٹی اردو اکیڈمی، بزم اردو، عرفان اردو اور ترقی اردو وغیرہ سرگرم عمل ہیں اردو کے ہفت روزہ اخبارات راوی، مشرق، اردو ٹائمز وغیرہ پابندی سے شایع ہوتے ہیں، تقریباً تین سو شاعر بھی ہیں جن میں پچاس سے زیادہ شعراء کا کلام برابر چھپتا رہتا ہے۔

استنبول یونی ورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ۱۹۸۵ء سے ہر سال کسی ایک موضوع پر ایک سمینار ہوتا رہا ہے، اس سال کا موضوع سلطان عبد الحمید دوم اور ان کا عہد ہے، اتفاق سے ۱۹۹۳ء سلطان کا ایک سو پچاسواں سال پیدایش بھی ہے، چند برس پہلے سلطان کی صاحبزادی عائشہ عثمان اوغلو نے اپنے والد سے متعلق بعض یادداشتوں کو شایع کیا تھا، اس میں سلطان کی نجی اور خانگی زندگی، بیوی بچوں کے دلچسپ حالات کے علاوہ محل سلطانی کی معاشرتی زندگی، مذہبی رسموں اور پیدایش وتخت نشینی کی تقریبات، محل میں ماہ رمضان کے استقبال، نماز جمعہ کے لیے کوکبۂ سلطانی کی ہماہمی، حرمین شریفین کے لیے خلیفہ کی جانب سے سالانہ نذرانوں کی تفصیل بھی ہے، بعض اہم سیاسی واقعات مثلاً بادشاہ جرمنی کی آمد، شاہ ایران کا دورۂ ترکی، ۲۱ جولائی ۱۹۰۵ء کا بم کا حادثہ، دستور ترکی کا اعلان، سلطان کی معزولی وغیرہ کا بھی ذکر ہے، کتاب کے مضامین میں ایسے پہلو سامنے آئے جو شاید دوسرے مصنفوں کی دسترس سے دور ہی رہتے، اس لحاظ سے اسے حیات عبد الحمید کے متعلق بنیادی اور معتبر و مستند ماخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی، ادھر سلطان کی شخصیت اور ان کے عہد خلافت سے بڑی دلچسپی لی جارہی ہے۔ چنانچہ اس ترکی کتاب کا اب عربی اور فرانسیسی ترجمہ اردن اور فرانس سے شایع ہوگیا ہے۔

ترک مسلمانوں کی ظفر مندیوں اور کامرانیوں کے نقوش یورپ کے جن خطوں میں آج بھی روشن ہیں ان میں یوگوسلاویہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس کی ایک ریاست بوسینا آج کل اپنے ملی و مذہبی تشخص کے لیے مخالف قوتوں سے برسر پیکار ہے، اس کی راجدھانی سراجیوو کا کتب خانہ غازی حسرو بیگووا، جنوب مشرقی یورپ کے چند ممتاز کتب خانوں میں ہے، خاص طور پر اسلامی زبانوں میں اس کے مخطوطات کا ذخیرہ نادر و بیش قیمت ہے، ۱۹۶۳ء اور ۱۹۷۹ء میں اسکے کیٹلاگ کی دو جلدیں شایع ہوئی تھیں، اب ان ہی کے انداز پر تیسری جلد بھی شایع ہوگئی ہے جس میں اخلاق و موعظت کے موضوع پر ۷۰۰ مخطوطات کا اندراج ہے، عربی، ترکی، فارسی اور بوسنیائی۔ سرب کروشیائی زبانوں کے ان مخطوطات کو عربی رسم الخط میں سنہ وار تقسیم کیا گیا ہے اور جن کی تاریخ کتابت نہیں معلوم ہو سکی ان کو الگ درج کر دیا گیا ہے، آخر میں کئی اشاریے بھی دیے گئے ہیں، اہل علم کی نظر میں یہ فہرست' جنوب مشرقی یورپ میں اسلامیات کے مطالعہ کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہے اور اب ہنگری کی اکادمی آف سائنسز اور' IRCICA' کے اشتراک و تعاون سے اس خطہ کے تمام کتب خانوں کے مخطوطات کے جمع و تدوین اور ان کی اشاعت کا منصوبہ بھی زیر عمل ہے۔

اسپین کا مسلم عہد، دور حاضر کے اہل علم و ادب کا پسندیدہ موضوع ہے، ۱۹۸۸ء میں میڈرڈ اسپین میں "ہسپانوی عرب اور ترجمہ و ادبی تنقید"

کے موضوع پر ایک سمپوزیم / ورکشاپ ہوا تھا، اس میں اسپین کے علاوہ الجیریا، تونس، شام، عراق، لبنان اور مصر و مراکش کے نمائندے بھی شریک ہوئے اور اس میں تقریباً ۴۰ مقالات پیش کیے گئے، اب ان کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، ترجمہ کا فن، ادبی تنقید، ہسپانوی اور لاطینی امریکی ادب میں عربی آہنگ، ہسپانوی اشراور عرب اہل قلم اور ہسپانوی سے عربی میں ترجمہ نگاری چار ابواب قائم کیے گئے ہیں، کتاب کے آخر میں سمپوزیم کے نتیجہ بحث کا خلاصہ بھی دے دیا گیا ہے، اسپین و عرب کے ادبی تعلقات کے مطالعہ کے لیے یہ مجموعہ مقالات نہایت جامع اور پُر از معلومات بتایا گیا ہے۔

اسپینی زبان میں ۱۹۸۶ء ہی میں ایک اور عمدہ کتاب "قرون وسطی کے عربی ادب میں تعمیر و اختراع جوہر" کے نام سے شایع ہوئی تھی اس میں اسپین کے ادب پر و ہاں کے محلات و مساجد، منبر و محراب، باغ و چمن اور چشموں اور فواروں کے ......
......اثرات کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا گیا تھا، اب اس دلچسپ کتاب کا ترجمہ اطالوی زبان میں اٹلی سے شایع ہوگیا ہے، کتاب میں قرطبہ، غرناطہ، طلیطلہ کے علاوہ مصر، دمشق، بعلبک اور فیض کی مسجدوں، قصور و قبور کندہ تصاویر و دستاویزات کے سادے اور رنگین عکس بھی شامل کر دیے گئے ہیں جن سے اسلامی فن تعمیر کے مختلف نقوش واضح ہو جاتے ہیں۔

یورپ کے علاوہ جنوب مشرقی ایشیا میں بھی علوم اسلامیہ سے ربط و شغف کا

سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے، جاپان کی انٹرنیشنل یونیورسٹی کا شعبہ مطالعات شرق اوسط ۱۹۸۲ء میں قائم ہوا تھا، جاپان میں یہ اپنی نوعیت کا اولین ادارہ تھا، چند برسوں میں اس نے شرق اوسط کی سیاست، معیشت، فلسفہ، تہذیب و معاشرت، قانون اور شہری ترقی جیسے موضوعات پر تحقیق و تحریر کا گراں قدر سرمایہ فراہم کر دیا اور اس مقصد کے لیے اس نے بہترین کتابوں اور جرائد و رسائل کے حصول کی کوشش کی، چنانچہ قلیل مدت میں اس کے کتب خانہ نے جاپان میں عربی و فارسی کے مراجع و مصادر کے بہترین ذخیرہ کی حیثیت حاصل کر لی، ملک اور بیرون ملک اپنے علمی روابط کو بھی وسعت دی چنانچہ ڈرہم یونیورسٹی کے شعبۂ مطالعات اسلامی و شرق اوسط اور شام کی حلب یونیورسٹی سے علمی معاہدے کیے جن کے تحت مشترکہ سیمناروں کے انعقاد اور اساتذہ و طلبہ اور کتابوں کے تبادلہ کی راہیں ہموار ہوئیں، ادارہ نے ۱۹۸۶ء میں 'اسلامی مالیات اور بینک کاری' ۱۹۸۸ء میں 'ریاست' قومیت اور شرق اوسط میں مقامی سیاست' ۱۹۸۹ء میں قومیت اور بین ریاستی تعلقات: اسلامی نقطۂ نظر' ۱۹۹۰ء میں 'خلیج کا بحران: موجودہ صورت حال اور مستقبل کے اندیشے' اور ۱۹۹۰ء ہی میں 'نوے کی دہائی میں شرق اوسط کی صورت حال: خلیجی بحران کا مفصل تجزیہ' کے موضوعات پر سیمنار اور سمپوزیم منعقد کیے، ادارہ نے اب تک تقریباً بیس کتابیں شایع کی ہیں، ان میں سے اکثر اسلام کے نظام مالیات و تجارت سے متعلق ہیں، بعض اہم کتابوں مثلاً نیچر آف اسلامک کیمونٹی، اے نیو اپروچ ٹو ہیومن اکونومکس، اے کیس اسٹڈی

آف این اسلامک اکونومی، فلاسفی آف دی اسلامک لا آف کنٹریکٹ : اے کمپیریٹیو آف کنٹریکچول جسٹس، آن اسلامک اکاؤنٹنگ : اٹس نیوچر اینڈ امپیکٹ آن ویسٹرن اکاؤنٹنگ، اسلامک ورسز ماڈرن ویسٹرن ایجوکیشن : پراسپیکٹ فار دی نیوچر، دی نٹ ورک آف اسلامی سٹی، آئیڈیلیس، نارمس اینڈ ہیومن کمیونٹی ان مسلم سوسائٹی، لیبر اینڈ ایکشن ان اسلام : سرچنگ فار این آؤٹ لک ان لاسٹ لیبر وغیرہ سے اس ادارہ کے کام کی نوعیت و محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

علم وتحقیق کے ہر میدان میں عجیب وغریب اور حیرت انگیز نتائج سامنے آتے رہتے ہیں، جودھ پور یونیورسٹی، دنیا کی پہلی یونیورسٹی ہے جہاں دودھ پلانے والے جانوروں یا حیوانات اعلیٰ پر داد تحقیق دی جاتی ہے اب تک وہاں سے اس علم (PRIMATOLOGY) پر ۲۰ محققین نے اعلیٰ سندیں حاصل کی ہیں، ٹائمز آف انڈیا کی ایک خبر سے معلوم ہوا کہ جودھ پور اور اس کے اطراف میں تقریباً ڈیڑھ ہزار ہنومان لنگوروں پر تحقیق سے بعض بڑے دلچسپ نتائج سامنے آئے ہیں، مثلاً ان بندروں میں نوزائیدہ بچوں کا قتل عام بات ہے کوئی بندر جب اپنے جتھے کا سردار بنتا ہے تو سب سے پہلے اپنے پیشرو کے بچوں کو ختم کر دیتا ہے اور ہر مادہ بندر سے تعلق استوار کرتا ہے اور یہ اسکے اقتدار و استحکام کی علامت ہے، سرداری صرف شجاعت اور بہادری کے زور پر حاصل ہوتی ہے، ان بندروں میں وقت اور ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی حیرت انگیز صلاحیت ہوتی ہے، مثلاً حالات سازگار نہیں ہوتے تو بندرنیاں حمل کی زحمت نہیں اٹھاتی ہیں، خشک سالی جیسے سخت وقت میں استقرار حمل کے اصول پر عمل پیرا ہوتی ہیں، تین نسلوں کے مطالعہ کے بعد محققین نے محسوس کیا کہ نوزائیدہ بچوں کے قتل سے ان بندروں کی آبادی ایک حد ہی میں رہتی ہے۔

ادبیات

حمد

از
ڈاکٹر سعید عارفی

حریم جاں میں وہی خواہش نظر میں وہی
سبھی کے ساتھ رہا زیست کے سفر میں وہی

کلی کلی میں وہی ہے گل و ثمر میں وہی
بہار نام ہے اس کا شجر شجر میں وہی

صریرِ خامہ نے کھولا یہ راز کاغذ پہ
کہ حرف حرف میں وہ ہے سطر سطر میں وہی

وہ استعارہ و تشبیہ کی لطافت میں
نفس نفس ہے مری فکر معتبر میں وہی

اسی کے فیض سے میرے سخن سخن کا وجود
مرے قلم میں وہی ہے مرے ہنر میں وہی

لہو کی گردشیں اسکی نوازشوں کے طفیل
سکون دل میں وہی راحت جگر میں وہی

ہر اک مقام پہ اسکا کرم ہے سایہ فگن
پہاڑ، دشت و چمن اور بحر و بر میں وہی

اسی کے نور سے روشن ہے کائنات سعید
دیارِ شب میں وہی وادیٔ سحر میں وہی

مطبوعات جدیدہ

رسائل الامام الفراہی فی علوم القرآن (جلد اول (عربی) از امام عبدالحمید الفراہی، متوسط تقطیع، کاغذ، عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت ۷۵ روپیے، پتہ: دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائمیر، اعظم گڈھ (ہند)

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے غور و فکر کا اصل محور قرآن مجید تھا اور وہ اس کے متبحر عالم تھے، یہ مجموعہ اصول تفسیر میں ان کے مندرجۂ ذیل تین رسالوں پر مشتمل ہے، دلائل[1] النظام، اسالیب[2] القرآن اور التکمیل فی اصول[3] التاویل، عرصہ ہوا دائرہ حمیدیہ نے ان کو متفرق طور پر شایع کیا تھا لیکن اب یہ نایید تھے اس لیے اکتوبر ۱۹۹۱ء میں فراہی سمینار کے موقع پر ان کو یکجا کرکے دوبارہ شایع کیا گیا ہے، مولانا کا خاص طغرائے امتیاز نظم قرآن کی بازیافت ہے، اول الذکر رسالہ میں انھوں نے قرآن مجید کے منظم و مربوط ہونے اور اس کی آیات و سور کے اقتضاب سے خالی ہونے کے جو دلائل تحریر کیے ہیں اور اس پر وارد ہونے والے شبہات کا جو جواب دیا ہے وہ ان کے اولیات میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، انھوں نے نظم کی معرفت کی جانب رہبری کرنے والے وسائل و ذرایع کی نشاندہی فرمانے کے بعد نظم کے استنباط کے طرق و اصول بھی بتائے ہیں، نظم کی طرح قرآنی اسالیب، ان کے مفہوم، ان کے استعمال کے مواقع وغیرہ سے واقفیت بھی اہم اور قرآن مجید

کی فہم و معرفت کے لیے ضروری ہے، دوسرا رسالہ اس حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل اور مفید و بیش قیمت مطالب پر مشتمل ہے، تیسرے رسالہ میں اصول تاویل کو مستقل فن بنانے کی اہمیت و ضرورت واضح کرنے کے بعد تفسیر بالرائے اور تاویل کا مطلب بتایا گیا اور تاویل کے بنیادی اور مرجح اصولوں کے ساتھ ہی اس کے باطل اصولوں کا تذکرہ بھی کیا ہے، مفسرین ایک ہی آیت کی تاویل میں گوناگوں احتمالات و وجوہ بلکہ مختلف و متضاد اقوال نقل کرتے ہیں جن سے آیت کا اصل مفہوم اور اس کی حقیقی و متعین مراد واضح نہیں ہوتی، اس رسالہ میں جن اصولوں کا ذکر ہے ان سے تفسیر بالرائے، دور از کار احتمالات اور مختلف وجوہ و اقوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور قرآن مجید کی اصل منشا و مراد پوری طرح سامنے آجاتی ہے، یہ تینوں رسالے نامکمل ہونے کے باوجود قرآن مجید کے گوناگوں حقائق و معارف پر مشتمل اور مولانا کے غور و فکر اور تدبر فی القرآن کا نتیجہ ہیں، ہندوستان میں مولانا کے افکار و خیالات کے سب سے زیادہ داعی مولانا بدرالدین اصلاحی ناظم دائرہ حمیدیہ نے ہر رسالہ کے شروع میں ایک پُرمغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔

قرآنی مقالات تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۷، مع خوبصورت ڈسٹ کور، قیمت عام اڈیشن ۶ روپیے، لائبریری اڈیشن ۸ روپیے۔
پتہ ادارہ علوم القرآن، پوسٹ باکس ۹۹، سر سید نگر علی گڑھ۔

۱۹۳۶ء میں مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے سب سے ممتاز و لائق شاگرد مولانا امین احسن اصلاحی حفظہ اللہ کی ادارت میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد ماہنامہ الاصلاح

کے نام سے دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی جانب سے نکلا جس کو بہت کم عمر نصیب ہوئی لیکن ع "ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد" یہ قرآن مجید اور اسکے متعلقات کی تحقیق و تدقیق اور خصوصاً مولانا فراہیؒ کے علوم و معارف اور قرآنی افکار و خیالات کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف تھا، اب انہی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کی داغ بیل ڈالی گئی ہے اس کا ششماہی رسالہ علوم القرآن بھی قرآنی مضامین و معلومات کے لیے مختص ہوتا ہے، ادارہ نے قرآن مجید سے متعلق اہم موضوعات پر علمی و تحقیقی کتب کی اشاعت کا منصوبہ بھی بنایا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں الاصلاح میں چھپے ہوئے ۲۵ مقالات قرآنی کو مندرجۂ ذیل پانچ عنوانات کے تحت یکجا کرکے شایع کیا گیا ہے، اصول تفسیر، تفسیر و تاویل، تحقیقات قرآنی، اقسام القرآن اور تعلیمات قرآنی، ان عنوانات سے کتاب کی نوعیت اور قدر و قیمت کا بخوبی پتہ چلتا ہے، دو مضامین خود علامہ فراہیؒ کے ہیں باقی ان کے تلامذہ و منتسبین مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا بدرالدین اصلاحی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا حافظ عبدالاحد اصلاحی اور مولانا داؤد اکبر اصلاحی کی کدو کاوش کا نتیجہ ہیں، باطنی خوبیوں کے علاوہ زبان و بیان کے لحاظ سے بھی مجموعہ خوب ہے، اس علمی، دینی اور قرآنی کتاب کی اشاعت کے لیے ادارہ لایق تحسین ہے۔

کتابیات فراہیؒ مرتبہ ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۸۰، قیمت ۴۰ روپیے پتہ: ایضاً۔

یہ علامہ فراہیؒ کی تصانیف و مضامین اور ان کے متعلق دوسروں کی تحریروں کا اشاریہ ہے جو چار حصوں میں منقسم ہے، پہلے میں مولانا کی مطبوعہ کتب ان کے اردو ترجموں، مولانا کے مضامین، افادات، مکاتیب اور مطبوعہ کلام کا ذکر ہے، دوسرے حصہ میں ان کتب اور مضامین نثر و نظم کا تذکرہ ہے جو دوسروں نے مولانا کے بارے میں لکھے ہیں، اس میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے لکھے گئے غیر مطبوعہ تحقیقی مقالات کی فہرست بھی دی ہے، تیسرا حصہ ان تبصروں کے لیے مخصوص ہے جو مختلف رسالوں میں مولانا کی تصانیف پر کیے گئے ہیں اور آخری حصہ میں ان کتب و مضامین کا اشاریہ ہے جن میں ضمناً مولانا کے بارے میں بعض معلومات درج ہیں، شروع میں لائق مرتب نے مولانا کے حالات و کمالات کا مرقع پیش کیا ہے جو پُر از معلومات ہے، اشاریہ بڑی محنت و عرق ریزی کا نتیجہ ہے اور اس سے مولانا فراہی پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔ گو لائق مرتب نے تلاش و تفحص میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا ہے تاہم اس طرح کے کاموں میں جیسا کہ انہیں خود بھی اعتراف ہے احاطہ بہت مشکل ہوتا ہے، انھوں نے اشاریے میں بڑی وسعت دے دی ہے اسلیے جس کتاب اور مضمون میں بھی مولانا کا نام آگیا ہے، اسے اس میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حصہ چہارم کے مندرجات اسی قبیل کے ہیں، اس کی وجہ سے بالخصوص بعض چیزیں نظر انداز ہو گئی ہیں مثلاً نظم قرآن (مولانا امین احسن اصلاحی، معارف جلد ۳۶ عدد ۶۔ دسمبر ۱۹۳۵ء) مولانا حمید الدین فراہیؒ اور علم حدیث پر مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون (معارف جلد ۴۹ عدد ۲۔ فروری ۱۹۴۲ء) دراصل طلوع اسلام دہلی اور البیان امرتسر کے جواب میں لکھا گیا ہے اشاریہ نگاری کی وسعت

کے مطابق ان دونوں کا ذکر بھی ہونا چاہیے تھا۔ مولوی محمد امین عباسی چڑیاکوٹی نے اپنی تصنیف جواہر خسروی میں مولانا شبلیؒ و فراہیؒ کے متعلق جو ردوکد کی ہے اس کا ذکر معارف جلد ۳ عدد ۳۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں ہے نامہ حالی بنام مولانا حمیدالدین فراہیؒ (معارف جلد ۲، عدد ۵۔ نومبر ۱۹۱۸ء) اور مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی علیہ الرحمۃ والغفران (مولانا مناظر احسن گیلانی، معارف جلد ۶۶ عدد ۶، دسمبر ۱۹۵۰ء) کا ذکر بھی رہ گیا ہے، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے نام مولانا سید سلیمان ندویؒ کے جو خطوط ۱۹۸۵ء کے معارف میں چھپے ہیں ان میں بھی مولانا فراہیؒ کا بعض جگہ تذکرہ ہے، راقم نے معارف میں مولانا کی متعدد تصانیف پر تبصرہ کیا ہے ان میں سے بعض کو اشاریہ میں جگہ نہیں مل سکی ہے جیسے القائد الی عیون العقائد اور تفسیر سورہ ذاریات وغیرہ، مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرت النبیؐ کی بعض جلدوں کے مقدمے اور بعض کے متون میں مولانا فراہیؒ سے استفادہ کا اعتراف کیا ہے، اشاریہ میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، جہاں تک مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے ذکر خیر کا تعلق ہے وہ ان کتابوں میں بھی ہے، حکیم الامت (مولانا عبدالماجد دریابادی) حیات سلیمان (مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی)، دارالمصنفین کی ادبی خدمات (ڈاکٹر خورشید نعمانی مرحوم) علامہ سید سلیمان ندویؒ شخصیت اور ادبی خدمات (ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی) معلوم ہوتا ہے مولانا عبدالماجد دریابادی کی ادارت میں نکلنے والے سچ، صدق اور صدق جدید وغیرہ فاضل مرتب کے پیش نظر نہیں تھے اس لیے مولانا فراہیؒ کی تصانیف پر ان کے تبصروں کا کہیں ذکر نہیں ہے، تفسیر ماجدی جلد اول کے افتتاحیہ میں بھی مولانا

کا ذکر موجود ہے، مولانا حکیم سید عبدالحیٔ سابق ناظم ندوۃ العلما کی تصنیف الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند کے ضمیمہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مولانا فراہی کی متعدد تصانیف کے نام درج کیے ہیں لیکن اشاریہ اس کے ذکر سے خالی ہے علی برادران مرتبہ رئیس احمد جعفری میں مولانا امین احسن اصلاحی کا ایک مضمون مولانا محمد علی مدرسۃ الاصلاح میں شامل ہے، یہ تمامتر مولانا محمد علی کے بارے میں مولانا فراہیؒ کے تاثرات پر مشتمل ہے، حال میں علوم قرآن پر شائع ہونے والے پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مضمون مشمولہ معارف جولائی ۱۹۵۹ء کا کوئی ذکر نہیں ہے اور سہ ماہی العلم کراچی اپریل تا جون ۱۹۸۰ء میں مدرسۃ الاسلام کراچی سے مولانا کے تعلق کا ذکر ایک مضمون میں ہوا ہے۔ (ض)

براق تنگ از جناب شیم بلتستانی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۳۶، قیمت ۸۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی ۱۱۶ میکلوڈ روڈ لاہور، پاکستان۔

گلگت اور لداخ کے درمیان ہمالیہ اور قراقرم کے کوہستانی سلسلہ میں بلتستان کی خوبصورت ریاست واقع ہے، مورخین نے اسے "چھوٹا تبت" بھی کہا ہے، بلتستان کی زبان لداخی اور تبتی زبانوں کی مخلوط شکل ہے لیکن اس میں عربی اور فارسی کے اثرات بھی نمایاں ہیں، اسکا شعری سرمایہ خاصا ہے اس کے ممتاز شاعر شیم بلتستانی، کلام اقبال کے بھی عاشق و شیدائی ہیں، ریڈیو کشمیر کی ملازمت کے دوران وہ کلام اقبال کا بلتی میں ترجمہ کرتے رہے، اب اپنی قوم کو اقبال کے کلام سے بہرہ ور کرنے کیلئے انھوں نے کلام اقبالؒ کے ایک انتخاب کا بلتی زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے، جس کے معیار و صحت کے لیے اقبال اکادمی پاکستان کا نام کافی ہے۔

ضربِ آگہی از جناب محمد آفاق صدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ کتابت وطباعت، مجلد صفحات ۲۲۰، قیمت ۴۸ روپیے، پتہ: آفاق لشان ۱۴۰ مختار منزل ایکسٹینشن، نئی دہلی ۶۔

زیرِ نظر کتاب گویا ایک ڈائری ہے جس میں زندگی کے بعض حقایق اور سچائیوں کے متعلق مولف نے اپنے مطالعہ وفکر کے نتائج کو اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، فکر انگیز ہونے کے علاوہ ان مختصر تحریروں میں فلسفہ و ادب اور طنز و مزاح کی خوشگوار آمیزش ہے، مثلاً "مکاری کی مساوی تقسیم پر جدید جمہوری نظام کی بنیاد قائم ہے" "میں جس قوم کا فرد ہوں اس کا ماضی نہایت شاندار رہا ہے اس لیے مجھے پسماندہ رہنا ہی عزیز ہے" لیکن بعض خیالات غیر ضروری اور مہمل سے ہیں جیسے "چاند ہماری زبان میں اگر مونث ہوتا تو سوچیے سورج سے ہمارا کیا رشتہ ہوتا" دیباچہ میں مولف کے بعض خیالات بھی محل نظر ہیں مثلاً "میر و غالب اور سعدی و جامی کو ان کی چند بے مثال سطروں کی وجہ سے دنیا جانتی ہے" "ہمارے یہاں تخلیقی ذہن کی نشو و نما کو بہت کم فروغ مل سکا" "تمام اثبات کو نفی میں بدلتے رہنے کی فکری مشق کا نام تصوف رکھ دیا گیا" ایک جگہ لکھتے ہیں "آدمی اجماع ضدین کا مخزن ہے"

شعر تیرے رنگ ہزار از جناب فخر الاسلام اعظمی، عمدہ کتابت وطباعت، ۲۰۸ صفحات، قیمت عام ایڈیشن ۲۰ روپیے، لائبریری ایڈیشن ۲۵ روپے، پتہ: شبلی نیشنل کالج، اعظم گڈھ۔

عمدہ اور پاکیزہ اشعار کے انتخاب اور ان کی بیاض رکھنے کی روایت بڑی قدیم ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ مجموعہ اشعار بھی ہے جس میں اعلیٰ جذبات، بلند خیالات اور زندگی کے مختلف تجربات کے عکاس اشعار کا بڑے سلیقہ سے انتخاب کیا گیا ہے، اس میں ندرا نہ حمد و نعت کے علاوہ سوز و ساز کے تحت قدیم و جدید اردو غزل کے اچھے اشعار آگئے ہیں، لایق مرتب نے شعر کے ساتھ شاعر کا نام دینے سے اس لیے گریز کیا کہ قاری کسی خارجی کشش یا مرعوبیت کے بغیر شعر کے حسن سے محظوظ ہو سکے۔

ع۔ ص

وّل (خلفائے راشدین) حاجی معین الدین ندوی: اس میں خلفائے راشدین کے
ت و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا بیان ہے۔ ۴۰/=

دوم (مہاجرین۔ اول) حاجی معین الدین ندوی: اس میں حضرات عشرۂ مبشرہ، اکابرین
یش اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابۂ کرامؓ کے حالات اور ان کے فضائل کا بیان ہے ۴۵/=

سوم (مہاجرین دوم) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں بقیہ مہاجرین کرامؓ کے
و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

چہارم (سیر الانصار اول) سعید انصاری: اس میں انصار کرام کی مستند سوانح عمریاں
فضائل و کمالات مستند ذرائع بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ ۴۵/=

پنجم (سیر الانصار دوم) سعید انصاری: اس میں بقیہ انصار کرام کے حالات و فضائل
ہیں۔ ۳۵/=

ششم شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں چار اہم صحابۂ کرامؓ، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ
رت عبداللہ ابن زبیرؓ کے حالات، ان کے مجاہدات اور باہمی سیاسی اختلافات بشمول واقعۂ
درج ہیں۔ ۳۵/=

ہفتم (اصاغر صحابہؓ) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں ان صحابۂ کرام کا ذکر ہے، جو
کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام لا چکے تھے مگر شرف ہجرت سے محروم رہے
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمسن تھے۔ ۴۰/=

ہشتم (سیر الصحابیاتؓ) سعید انصاری: اس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات و بنات طاہرات
صحابیات کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے درج ہیں۔ ۲۵/=

نہم (اسوۂ صحابہؓ اول) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے عقائد، عبادات،
اور معاشرت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۰/=

دہم (اسوۂ صحابہؓ دوم) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور
کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۴۵/=

یازدہم (اسوۂ صحابیات) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور
کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ۱۵/=

No. 5 Vol 143 (8) MA'ARIF Regd. No. AZM/NP/43
Monthly Journal of DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Post Box No. 19 Azamgarh-276001
Phone No. 22 2206 Per Copy Rs. 3/-

سلسلۂ تاریخ اسلام

(شاہ معین الدین احمد ندوی)

حصۂ اول (عہد رسالت و خلافت راشدہ) آغاز اسلام سے خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کا مفصل مرقع۔ ۵/

حصۂ دوم (بنو امیہ) اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل

حصۂ سوم (خلافت عباسیہ اول) ابو العباس سفاح سے ابو اسحق متقی اللہ تک صدیوں کی خلافت عباسیہ کی تمدنی اور علمی تاریخ۔ /

حصۂ چہارم (خلافت عباسیہ دوم) اس میں مستکفی باللہ کے عہد سے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے دور زوال اور اس کی سیاسی، علمی اور تمدنی تاریخ دی گئی ہے۔ /

تاریخ دولت عثمانیہ اول (ڈاکٹر محمد عزیر) سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل از عثمان اول تا مصطفےٰ رابع۔ ۵/

تاریخ دولت عثمانیہ دوم (ڈاکٹر محمد عزیر) سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اس کے انتظامی اور تمدنی کارناموں کی تفصیل از محمود ثانی تا جنگ عظیم اول۔ /

تاریخ صقلیہ اول (سید ریاست علی ندوی) اس میں سسلی کے جغرافیائی حالات، اس پر اسلامی حکومت کے قیام، اس کے عہد بعہد عروج و زوال اور وہاں کے مسلمانوں کے مصائب اور ان کی جلاوطنی کی تفصیل ہے۔ /

تاریخ صقلیہ دوم (سید ریاست علی ندوی) سسلی کے عہد اسلامی کا تمدنی جغرافیہ، نظام حکومت، زراعت، صنعت، حرفت، تعمیر، تجارت، تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون کا تفصیلی مرقع